# تفسیر ماجدی: ایک تحقیقی مطالعہ

مقالہ برائے

پی ایچ. ڈی


نگراں

**پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی**

(ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی.
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مقالہ نگار

**محمد ساجد**

(ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات سنی)


شعبۂ دینیات سنی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، یوپی، انڈیا

۲۰۲۱ء

# TAFSEER-E-MAJIDI: EK TEHQIQI MUTALA

**THESIS**

**SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF**

**Doctor of Philosophy**

in

**Sunni Theology**

**BY**

**MOHD SAJID**

**UNDER THE SUPERVISION OF**

**PROF. M. SAUD ALAM QASMI**

(Dean, Faculty of Theology)

PROF.M.SAUD ALAM QASMI
Dean, Faculty of Theology

DEPARTMENT OF SUNNI THEOLOGY
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH – 202002, INDIA

Dated: 01/03/2021

# *Certificate*

This is to certify that Mr. Mohd Sajid Research Scholar Dept of Sunni Theology A.M.U Aligarh has submitted his thesis of Ph.D entitled"**تفسیرماجدی :ایک تحقیقی مطالعہ**"**(Tafseer-e-Majidi: Ek Tehqiqi Mutala)** under my supervision.

This is original research work and faithful record of research carried out by him.

This is further certified that this thesis is complete in all respect and is being submitted for the award of Ph.D. degree.

Saud

**(PROF. M. SAUD ALAM QASMI)**
**Supervisor**
Dean, Faculty of Theology
A,M.U, Aligarh .U.P

# مقدمہ

الحمدللّٰہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدالانبیاء والمرسلین محمدٍ
وآلہ وصحبہ اجمعین ۔امابعد

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی ایک پاکیزہ اور مقدس کتاب ہے جو جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی، اس میں ساری انسانیت کے لیے رشد وہدایت ہے اور زندگی کے ہر ہر پہلو سے متعلق رہنما اُصول اور روشن تعلیمات بیان کی گئی ہیں جن کی توضیح وتشریح مختلف اوقات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں اپنے اقوال وافعال اور ارشادات کے ذریعہ کی اور پوری انسانیت کو ان ہی تعلیمات وہدایات کی روشنی میں زندگی گزارنے کا مکلّف بنایا۔

یہی وجہ ہے کہ سُنّتِ رسول ؐ کو قرآن کریم کی تفسیر میں نہایت اہم مقام حاصل ہے اور اسے قرآن کریم کی تفسیر کا سب سے معتبر ومستند ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے، اس کتاب مقدس کے اوّلین رمز شناس اور حقیقی شارح و ترجمان خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جہاں آپ ﷺ کی ذمہ داری آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت اور تزکیۂ نفس ہے وہیں معانیٔ قرآن اور حقائق الٰہی کی تبیین وتشریح بھی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِیْ الْأُمِّیِّیْنَ رَسُولاً مِّنْهُمْ یَتْلُو عَلَیْهِمْ آیَاتِهِ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ (الجمعۃ:۲)

[وہی تو ہے جس نے اُمی لوگوں میں انھیں میں سے ایک پیمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔]

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سپرد کتاب اللہ کی تبیین وتشریح اور تفسیر وتبلیغ کا فریضہ بھی عائد کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَنزَلْنَا إِلَیْكَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَیْهِمْ (النحل:۴۴)

[نیز ہم نے آپ کی طرف قرآن اس لیے اتارا ہے کہ آپ لوگوں پر ان ہدایات کو اچھی طرح واضح کردیں، جو ان کی طرف بھیجی گئی ہیں؛]

دوسری جگہ ارشادِ ربانی ہے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (المائدۃ:٦٧)

[اے (ہمارے) پیغمبر جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اترا ہے یہ (سب) آپ (لوگوں تک) پہنچادیجئے۔]

ان آیات سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ قرآن مجید کے مفسر وشارح بھی ہیں اور آپ ہی کو اس کے حقائق واسرار کے حل کرنے کا حق حاصل ہے۔

لہٰذا آپؐ نے قرآن مجید کی ہر پہلو سے تشریح کی اور ہر ایک لفظ کی مراد کو واضح طور پر بیان کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی بیان کردہ تفسیر وتشریح کو تائیدِ الٰہی حاصل ہے اور آپ کے بیان کردہ الفاظِ قرآن کے معانی و مطالب ہی حقیقی مرادِ الٰہی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی نبی اور رسول کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح قرآن کریم کے بعد اب کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا اب دنیا کی نجات اور کامیابی صرف اور صرف قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں مضمر ہے۔ اس لئے خاص طور سے مسلمانوں پر رسولِ اکرم ﷺ کی اتباع و پیروی اور تعمیلِ حکم ہر اس چیز میں فرض کی گئی ہے جس کا آپ ﷺ حکم دیں یا جس سے آپ ﷺ منع فرمائیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا (الحشر:٧)

[تو رسول جو کچھ تمہیں دیں وہ لے لیا کرو اور جس سے وہ تمہیں روک دیں، رک جایا کرو۔]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے جان نثار صحابہ کی جماعت وجود میں آئی یہ وہ پاکیزہ اور مقدس جماعت تھی جس نے قرآن کریم کے نزول کا زمانہ بھی پایا، نبی کریمؐ کی زندگی کو قرآن کریم کی عملی تفسیر میں بھی دیکھا اور قرآنی تفسیر اس کے معانی ومطالب اور معارف ومراد بلاواسطہ نبی کریمؐ کے ارشادات سے

حاصل کی۔ چنانچہ حضرات صحابۂ کرامؓ نے قرآن وسُنّت کی تعلیمات میں ڈھل کر نبی اکرمؐ کی فیض صحبت سے ایسی روشنی حاصل کی کہ تمام انسانیت کے لئے آسمانِ علم وتحقیق کے روشن ستاروں کی مانند پوری دُنیا کو منور کیا اور معیارِ حق وصداقت کا بہترین نمونہ بن کر اس طرح اُبھرے کہ ان کے وجود سے ساری دنیا کی تاریکیاں دور ہوگئیں۔

صحابۂ کرام کی جماعت میں سے جو حضرات اس زمانہ میں قرآن کریم کی تفسیر بیان کرتے تھے ان میں خلفائے راشدین کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

صحابۂ کرامؓ کی پاکیزہ ومقدس جماعت کے بعد تابعین عظام کا زمانہ آتا ہے۔ یہ قافلہ بھی صحابہؓ کی جانشینی کا حق ادا کرتے ہوئے قرآن مجید کی تفسیر وتشریح میں رواں دواں بڑھتا گیا، علم دین کو عروج حاصل ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ تفسیری مجموعے منظر عام پر آنے لگے، ان حضرات نے سرمایۂ علم نبوت کے ایسے چراغ روشن کئے جن سے تمام عالم روشن ومنوّر ہوتے چلے گئے۔ خود اس دارفانی سے رخصت ہوگئے، لیکن اپنی تفسیری خدمات کے زندہ وتابندہ نقوش چھوڑ گئے۔ تابعین سے چلا ہوا یہ تفسیری سرمایہ ان کے تلامذہ یعنی تبع تابعین کو منتقل ہوا۔ ان نامور فرزندانِ اسلام نے اس تفسیری سرمایہ کو نہ صرف محفوظ کیا بلکہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے اجتہاد اور غور وفکر سے قابل قدر اضافہ بھی کیا اور اس دور میں روایت سے زیادہ کتابت کے ذریعے اس سرمایہ کی حفاظت کی جانے لگی۔ چنانچہ اس دور میں باقاعدہ طور پر تفسیری کتابوں کا آغاز ہوا اور بہت سی تفسیریں معارض وجود میں آگئیں۔ اس کے بعد ان کے شاگردوں کے ذریعے علم تفسیر کا یہ سلسلہ پوری دنیا بشمول برصغیر میں پھیلتا چلا گیا۔ برصغیر میں چونکہ ہندی، فارسی اور آریائی زبانیں رائج تھیں اس لئے علماء امت نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اب تک لکھی جانے والی عربی تفاسیر کے علاوہ علاقائی زبانوں میں بھی تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع کیا جائے اور مسلمانانِ ہند کو قرآن فہمی کے لیے ان ہی کی مادری زبان میں ترجمۂ قرآن وتفسیر سے روشناس کرایا جائے اور مسلمانوں کا براہِ راست قرآن کریم سے تعلق ورشتہ استوار کیا جائے۔

بہرکیف اس ادراک کے بعد برصغیر میں عربی زبان کے بجائے علاقائی زبانوں میں ترجمۂ قرآن کا رواج پڑ گیا۔ اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کی اولاد (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، اور

شاہ عبدالقادرؒ) کی تفسیری خدمات قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس وقت ایک تحریک چلائی اور سب سے اوّل انہوں نے فارسی زبان میں "فتح الرحمٰن" کے نام سے قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ اس وقت ہندوستان کے اکثر حصّوں میں فارسی زبان پڑھی، بولی اور سمجھی جاتی تھی اور عوام الناس اسی کے ذریعہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اس لئے ناگزیر ہوگیا کہ ہندوستان میں قرآن فہمی کے لیے فارسی زبان کا استعمال کیا جائے، اسلام کی نشر واشاعت اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے فارسی زبان میں ترجمہ وتفسیر کیا جائے، چنانچہ قرآنی علوم ومعارف کی تشریح کے میدان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے عظیم کارنامہ انجام دیا اور معاشرہ کی اصلاح سازی میں بڑا ہی اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے صاحبزادوں نے تراجم قرآن کی تحریک کو آگے بڑھایا اور دونوں حضرات نے قرآن کریم کا اُردو زبان میں الگ الگ ترجمہ کیا۔ چنانچہ شاہ رفیع الدینؒ نے اپنے ترجمہ میں الفاظ کو اہمیت دی، لفظی ترجمہ کیا اور عربی لفظ کی جگہ اُردو لفظ لاکر ہی ترجمہ کیا، جبکہ شاہ عبدالقادرؒ نے بامحاورہ ترجمہ کیا اور آیت کے مفہوم کو غیر معمولی اہمیت دی، دونوں ہی اکابرین نے اُردو دُنیا کو ترجمہ قرآن جیسی عظیم نعمت سے مالا مال کیا ہے۔ ان کے اس احسان کو آج تک علوم قرآنیہ کے حاملین مانتے چلے آرہے ہیں۔ بعد میں اکابرین عظامؒ نے ترجمہ وتفسیر کرکے قرآن وسنت کی روشنی کو عام کرنے کی بھرپور جدوجہد فرمائی۔ اللہ تعالیٰ تمام علماء ومشائخ کی ان کوششوں اور کاوشوں کو قبول فرمائے آمین۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم میں علم ومعرفت کے لامحدود خزانے ہیں اور یہ پیغام ربانی تمام انسانیت کے لئے جامع لائحہ عمل اور دستور حیات اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لیے مشعلِ راہ ہے نیز اس میں انسانی واخلاقی اقدار پر مبنی تعلیمات کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے جن کے آگے ہر صاحبِ عقل ودانش سر تعظیم خم کرتا ہے۔ قرآن کریم میں امم سابقہ کے سبق آموز واقعات کو بہت ہی خوبصورت اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے جن کو مفسرین عظام نے ہر دور میں منفرد انداز سے اپنی تفاسیر میں خوبصورت الفاظ اور عمدہ ترتیب کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں علم تفسیر کے میدان میں جو شخصیت پوری آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہے وہ مولانا عبدالماجد دریابادی تھے، ویسے تو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی جامع شخصیت گوناگوں اور مختلف اوصاف وعناصر سے مرکب تھی۔ وہ ایک فلسفی، ممتاز صحافی اور انشاء پرداز تھے۔ انہیں انگریزی اور عربی زبان کی باریکیوں پر گہری نظر اور کامل دسترس حاصل تھی۔ قدیم وجدید علوم

سے بہرہ ور تھے، مولانا دریابادیؒ کا قلم اسلام کی حقانیت اور نشر واشاعت میں مصروف رہا، انہوں نے بے شمار دینی وعلمی خدمات انجام دیں۔ علمی ودینی خدمات میں مولانا دریابادیؒ کا سب سے درخشاں اور باقی رہنے والا عظیم کارنامہ "تفسیر قرآن" (انگریزی اور اُردو) کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ مولانا دریابادیؒ نے عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق دونوں زبانوں میں کلام اللہ کی تشریح وترجمانی کی ہے۔

مولانا دریابادیؒ نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جب سامراجی حکومت کا دور دورہ تھا اور انگریزی تسلط کے زیر اثر عقل پرستی کا غلبہ تھا، مستشرقین اور عقل پرستوں کی طرف سے اعتراضات اور شکوک وشبہات پیدا کیے جا رہے تھے۔ سائنس وٹیکنالوجی کے شعبوں میں نت نئی دریافت وانکشافات ہو رہے تھے، لوگوں کے طرز فکر بدل گئے تھے اور غور وفکر کی نئی راہیں کھل رہی تھیں۔ علم معاشیات، اقتصادیات اور قانون نے غیر معمولی ترقی حاصل کر لی تھی۔ مرعوبیت ومغلوبیت پسند انسانی اذھان الٰہیاتی، ماورائی اور مابعد الطبیعاتی حقائق کو مغربی تحقیق وجستجو کے آئینے میں دیکھنے اور پرکھنے کے خوگر ہو گئے تھے۔

اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں اپنے نیک بندوں میں ایسے متبحر علماء پیدا کرتا رہا ہے جو انتہائی اخلاص وللّٰہیت اور سخت جانفشانی کے ساتھ عصری تقاضوں کے مطابق اپنی تفسیروں کے ذریعہ قرآن کریم کی ابدی صداقت وحقانیت کو ثابت کرتے ہیں۔ مخالفین ومعاندین کو مطمئن کر دینے اور معترضین کے اعتراضات کے جواب دینے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شخصیت تھی، کیونکہ آپ کو علوم جدیدۃ بالخصوص عمرانیات، نفسیات، تاریخ مذاہب وتمدن، اثریات اور فلسفہ کی نہ صرف واقفیت تھی بلکہ اس میں رسوخ و تعمق اور اعلیٰ بصیرت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک خاص اسلوب اور طرزِ نگارش کا ملکہ عطا کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے انگریزی ترجمہ وتفسیر قرآن **Tafsirul Quran Translation and Commentary of the Holy Quran)** کا ۱۹۳۳ء کے اواخر میں بیڑا اٹھایا اور ۱۵/اگست ۱۹۳۹ء کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، لیکن بعض وجوہ کی بناء پر انگریزی تفسیر کی نشر واشاعت ۱۹۴۱ء میں تاج کمپنی لاہور سے ہو سکی۔

مولانا دریابادیؒ نے انگریزی تفسیر کے بعد اُردو تفسیر کی تصنیف وتالیف کا آغاز کیا، یہ تفسیر بھی ۱۹۴۴ء

میں مکمل ہوگئی اور سخت جانفشانی کے بعد ۱۹۶۲ء میں شائع ہوسکی۔ مولانا دریابادیؒ کا یہ علمی ودینی کارنامہ قیامت تک صدقۂ جاریہ کی شکل میں ان شاء اللہ باقی رہے گا اور آئندہ آنے والی نسلیں اس سے فیض یاب ہوتی رہیں گی۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ تفسیر ماجدی کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں کہ:

''اب نیا دور تھا، عقلی علوم اور فلسفہ یونان کے بجائے تجرباتی علوم سائنس، بالخصوص طبیعات کا دور دورہ تھا۔ ہر شعبہ میں نئے نئے انکشافات وتحقیقات ہورہی تھیں............ اب ان جدید معلومات وتحقیقات کی روشنی میں اعجاز قرآن اور صداقت قرآنی کو اسی طرح عیاں اور عالم آشکارا کرنا تھا، جیسا کہ قدیم علماء ومتکلمین اور مفسرین قرآن کو اپنے زمانہ میں یونانی فلسفہ اور حکمت اور الحاد وباطنیت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ اس کار عظیم کو انجام دینے کے لیے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے کمر ہمت باندھی اور انگریزی اور اردو میں اپنے تفسیری نوٹس کے ذریعہ اس خدمت کو انجام دیا۔ اس کام کی تکمیل کے لئے ہمارے علم میں وہ موزوں ترین آدمی تھے، اس لئے کہ وہ جدید علوم میں بصیرت رکھتے تھے، ان کو مطالعہ کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا، ان کی نظر میں غیر معمولی وسعت اور ثقافت میں تنوع تھا، وہ جدید طبقہ کی نفسیات اور ذہنی ساخت سے واقف تھے، علم کے تیز رفتار رواں دواں قافلہ سے وہ کبھی بچھڑنے نہیں پائے اور اس تفسیری خدمت کے دوران میں تو انہوں نے خاص طور پر اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی ایسی کتاب ان کی نظر ومطالعہ سے بچنے نہ پائے جس سے قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق میں کچھ بھی مدد ملتی ہو، سالہا سال کی اس کوشش ومطالعہ اور عرق ریزی کا نتیجہ ان کی انگریزی اور اردو تفسیر ہے''۔ (مقدمہ تفسیر ماجدی، ص:۱۰)

مولانا دریابادیؒ نے بتوفیق الٰہی مذاہب عالم اور صحفِ سماوی کا تقابلی مطالعہ بڑے ہی منظّم، وسیع النظری اور مخلصانہ طریقہ پر کیا تھا اور انسائیکلو پیڈیاز پر بڑی ہی عمیق نظر رکھتے تھے، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ لکھتے ہیں:

''ہمارے محدود علم میں اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کے ایک محقق اور فاضلِ یگانہ اور خادم دین مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو توفیق دی کہ وہ تقابل مذاہب اور تقابل صحف سماوی کا منظّم،

وسیع اور کتابوں، موسوعات، انسائیکلوپیڈیاز اور وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے مضامین و مباحث کا مطالعہ جاری رکھیں اور ان کے حوالہ ونشان دہی سے بدیہی حقائق کی طرح قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی محفوظیت اور تورات وانجیل کی تحریفات، خارجی اضافات اور ذات خداوندی کے خلاف بیانات اور نسبتوں سے پردہ اٹھائیں۔ یہ ایک خادم دین مترجم ومفسر قرآن کا وہ کارنامہ اور اس کے اخلاص وبلند ہمتی کا شاہکار ہے، جس میں راقم حروف کی نظر میں ان کا اس عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ کسی اسلامی ملک میں بھی کوئی ہمسر اور نظیر نظر نہیں آتا۔'' (مقدمہ تفسیر ماجدی، ص:۱۱)

اس تفسیر میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا کہ اہل حق مفسرین کی تشریحات اور جدید مآخذ میں موجود مفید مواد نظر انداز نہ ہو۔ حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی مدظلہ ''تفسیر ماجدی'' کی اہمیت اور صاحب تفسیر کی شخصیت اور علمی قدر ومنزلت کے ذیل میں لکھتے ہیں :

''قرآن مجید کی تفسیر کے سلسلہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی محنت کی، انہوں نے اس میں خاص طور پر دو باتوں کا پورا اہتمام کیا، ایک تو یہ کہ عام اہل حق مفسرین نے قرآن مجید کے الفاظ ومضامین کی جو تشریح کی ہے اس کو نظر انداز نہ کریں اور نہ اس کے برخلاف کوئی رائے قائم کریں، دوسرے یہ کہ اپنے اس غیر معمولی مطالعہ سے جو انہوں نے عربی، اردو پھر انگریزی میں کیا اس میں ان کے متعلقہ مضمون پر جو مواد ملا اس سے پورا فائدہ اٹھائیں۔''
(تفسیر ماجدی نقد ونظر، ص:۷۷)

تفسیر ماجدی کا یہ عظیم الشان کارنامہ متعدد خصوصیات کا حامل ہے۔ مولانا دریابادیؒ کی تفسیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں علوم جدیدہ سے استفادہ کے ساتھ ساتھ بعض مقامات کے علاوہ متقدمین و متاخرین مفسرین عظام کی تفسیر آراء واقوال اور لغات سے ذرا بھی انحراف نہیں کیا۔ بلکہ مفسرین کے بجنسہٖ الفاظ نقل کردیئے اور مفسرین سلف سے ہٹ کر اپنی کوئی رائے قائم نہیں کی۔ مزید برآں عصرِ جدید کی علمی تحقیقات اور مذاہب واخلاق کی موسوعات **(Encyclopedias)** سے واقفیت اور یہودی ومسیحی کتب قدیمہ **(Old Testament New Testament)** سے تائیدی وتصدیقی مواد حاصل کیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے چنانچہ علماء و محققین نے آپ کی علمی و دینی خدمات پر متعدد مضامین و مقالات تحریر کیے ہیں۔لیکن با قاعدہ اور مکمل طور پر ''تفسیر ماجدی'' کی جانب توجہ مبذول نہیں کی گئی اور نہ ہی اس پر کوئی ایسا علمی و تحقیقی کام منظر عام پر آ سکا جس میں ''تفسیر ماجدی'' کے منہج واسلوب اور اس کے مختلف علمی پہلوؤں کا مکمل احاطہ کیا گیا ہو۔اس لئے ضرورت تھی کہ اس کی متنوع علمی ودعوتی جہات پر تفصیلی نظر ڈالی جائے۔

لہٰذا اس ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ''تفسیر ماجدی'' پر تحقیقی کام شروع کیا گیا۔جس کے ابواب وفصول کی ترتیب درج ذیل ہے:

**باب اول: ''مولانا عبدالماجد دریابادیؒ: حیات وخدمات''**

باب اول کی فصل اول میں **مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا خاندانی پس منظر** بیان کیا گیا ہے۔

فصل دوم میں **مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے حالاتِ زندگی اور وفات** مختصراً بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فصل سوم میں **مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی علمی وادبی خدمات اور سیاسی زندگی** پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

**باب دوم: ''علم تفسیر اور اس کے تعارف''** پر مبنی ہے۔

جس کی فصل اول میں **علم تفسیر کی لغوی واصطلاحی تعریف اور تفسیر وتاویل کے فرق** کو مختصر الفاظ میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔فصل دوم میں **تاریخ تفسیر کا ارتقاء وآغاز** پر بحث کی گئی ہے۔فصل سوم میں **ہندوستان میں علم تفسیر** کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

فصل چہارم میں **''تفسیر ماجدی'' کی اجمالی خصوصیات اور منہج واسلوب** کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے۔اور آخر میں مولانا دریابادیؒ نے تفسیر ماجدی کے لکھتے وقت جن مختلف مستند مراجع ومصادر سے اخذ واستفادہ کیا ہے ان کی طویل فہرست اور طریقۂ کار کو درج کیا گیا ہے۔

**باب سوم: ''تفسیر ماجدی کی امتیازی خصوصیات اور تنقیدی مطالعہ''** کے عنوان پر مشتمل ہے۔

اس باب کی فصل اول میں **کتب مقدسہ اور ثانوی جدید تحقیقات سے استفادہ اور بعض اقوال تصوف، سائنسی وفقہی مباحث، کلام عرب سے استشہاد اور علم جغرافیہ سے استفادہ** ان تمام مباحث کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم کی فصل دوم میں **مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے بعض علمی وتفسیری تفردات** بیان کئے گئے ہیں۔

اسی باب کی فصل سوم میں **تفسیر ماجدی کا تنقیدی نقطۂ نظر سے مطالعہ** کیا گیا ہے۔اوراس سلسلہ میں **ایک ناقدانہ** اور عادلانہ جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب چہارم کی فصل اول میں **یہودیت کا آغاز وارتقاء اوراس کا مختصر تاریخی پس منظر** بیان کیا گیا ہے۔

باب چہارم کی فصل دوم میں **حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت ووفات اورابتلاءات تفسیر ماجدی** کے حوالے سے رقم کئے گئے ہیں،اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت اورآپؑ کے دور میں بنی اسرائیل کا عروج وزوال، بنی اسرائیل پراللہ کے احسانات کاایک علمی وتحقیقی جائزہ پیش کیا گیاہے۔

فصل سوم میں **یہودیوں کے ایمانی واخلاقی بگاڑ اور بعض عقائدِ باطلہ** تفسیر ماجدی کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں۔

**باب پنجم نصرانیت ''تفسیر ماجدی'' کی روشنی میں**

اس باب کی فصل اول میں **نصرانیت کا آغاز وارتقاء اور مختصر تاریخی پس منظر،حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور تعلیمات مسیح علیہ السلام** کاایک علمی وتحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔فصل دوم میں **مسیحیوں کے بعض ایمانی واخلاقی بگاڑاور عقائدِ باطلہ** پر بحث کی گئی ہے۔

فصل سوم میں **حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے متعلق بشارتیں اناجیل مروجہ** اوردیگر کتب میں منتشراوربکھری ہوئیں ہیں۔ان معلومات وتفصیلات کومنظّم اورمربوط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہرقسم کی حمدوثناءاورشکراس خدائے بزرگ وبرتر کے لیے جس نے اس تحقیقی مقالہ کوپایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطافرمائی۔

اس تحقیقی مقالہ کی تکمیل پرمیں اپنے مشفق ومربّی استاذ محترم پروفیسرمحمدسعودعالم قاسمی صاحب کا بے حد ممنون ومشکورہوں جن کی عالمانہ رہنمائی اور معاونت مجھے ہرموقع پرحاصل رہی،اگرابواب وفصول کی ترتیب و تدوین اورموادکی فراہمی میں ان کا تعاون شامل حال نہ ہوتا تواس مقالہ کواس حسن ترتیب سے پیش کرناممکن نہیں

تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی سر پرستی کو تا دیر قائم رکھے۔

ناسپاسی ہوگی کہ اگر میں شعبۂ سُنّی دینیات کے چیئر مین پروفیسر محمد سلیم قاسمی صاحب اور تمام اساتذۂ کرام کا شکریہ ادا نہ کروں جن کے علمی تعاون اور دعاؤں کے نتیجے میں یہ تحقیقی مقالہ آخری مرحلہ تک پہنچ سکا۔

ناشناسی ہوگی اگر میں پروفیسر عبدالرحیم قدائی، عبدالعلیم قدوائی اور مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی کا شکریہ ادا نہ کرو جنہوں نے موضوع سے متعلق مواد کی فراہمی اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔

ساتھ ہی تمام کتب خانوں کے منتظمین کا بے حد ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے کتابوں کی فراہمی میں کسی بھی قسم کا تعاون کیا۔

اس مقالے کی تکمیل کے لئے میں اپنے والدِ مرحوم اور والدۂ ماجدہ کا بے حد ممنون و مشکور ہوں جن کی دعائیں ہمیشہ میرے شاملِ حال رہی ہیں۔ یہ میرے والدین کی دعاؤں کا طفیل ہے کہ آج میں اس مقام تک پہنچ سکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ والد محترم کی مغفرت فرمائے اوران کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور والدۂ ماجدہ کو صحت وسلامتی اور دونوں جہاں کی خوشیاں نصیب کرے۔[ آمین ]

آخر میں ان تمام دوست واحباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس مقالہ کی تیاری میں کسی بھی طرح میری معاونت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ اس تحقیقی کاوش کو قبول فرمائے اور جو کوتاہی ہوئی ہے اس کو اپنے فضل وکرم سے درگزر فرمائے۔[ آمین ]

محمد ساجد

ریسرچ اسکالر شعبۂ سنی دینیات

فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

# فہرست

☆☆☆

# باب اول

## مولانا عبدالماجد دریابادیؒ حیات وخدمات

**فصل اول:** خاندانی پس منظر

**فصل دوم:** مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی مختصر سوانح از ولادت تا وفات

**فصل سوم:** مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی علمی وادبی اور سیاسی خدمات

## فصل اول:

# خاندانی پس منظر

### خاندانی پس منظر:

عبدالماجد دریابادیؒ ایک معزز، دیندار قدوائی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے خاندان کا تعلق اتر پردیش کے ضلع بارہ بنکی میں واقع قصبہ دریاباد سے تھا۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ قاضی القضاۃ شیخ معزالدین ملقب بہ قدوۃ العلم والدین اور عرف عام کے مطابق قاضی قدوہ تھے۔ قدوہ عربی زبان میں پیشوا اور اسوہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

دریاباد کو انگریزی عہد حکومت میں اہم مقام حاصل رہا، لیکن رفتہ رفتہ اس کی حیثیت کم ہونے لگی اور بعد میں خوشحالی و ترقی بحال ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی قدوہ صاحب نے کچھ عرصہ دہلی میں قیام کیا تھا، اور ان کو سلطان شمس الدین التمش کے دور میں اجودھیا کا قاضی القضاۃ کا عہدہ دے دیا گیا تھا۔ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) آپ کے نام کا جزء ہے۔ قاضی قدوہ سرزمین اجودھیا میں پیوند خاک ہوئے، آپ کا مزار اجودھیا ہی میں بابری مسجد سے متصل کئی سال تک موجود رہا جس کو بابری مسجد کی المناک شہادت کے موقع پر مسمار کر دیا گیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی ''آپ بیتی'' میں اپنے خاندان کے مورثِ اعلیٰ کے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

> ''خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام قاضی معزالدین عرف قدوۃ الدین تھا، ان کا زمانہ کہا جاتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی کا تھا۔ اور وہ محمود غزنوی کے ہم عصر تھے، بعد میں ان کا نام زبانوں پر محض قاضی قدوہ رہ گیا، مشہور ہے کہ سلطان محمود ہی کے زمانے میں کسی لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے اور قصبہ اجودھیا (ضلع فیض آباد) میں مقیم ہوگئے''۔[1]

قاضی معزالدین عرف قاضی قدوۃ کی آمد سے متعلق کوئی بنیادی ماخذ نہیں مل سکا، اور جو منقولہ روایات ملتی بھی ہیں ان میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔

قاضی صاحب کا شجرۂ نسب حضرت ہارون علیہ السلام سے ہوتا ہوا حضرت لاوی (انگریزی میں (LEVI) فرزند سوم حضرت یعقوب علیہ السلام تک جا ملتا ہے۔ ایک قول یہ بھی مشہور ہے کہ قاضی قدوہ صاحب نسباً اسرائیلی نہیں تھے۔ بلکہ سادات میں سے تھے، لیکن چونکہ اسرائیلیوں کے شاہی خاندان میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے تھے، اس لئے خود بھی اسرائیلی مشہور ہوگئے، مگر یہ روایت ضعیف ہے۔

قاضی قدوہ صاحب کی آٹھویں پشت کے بعد ایک نمایاں ہستی مخدوم شیخ محمد آبکشؒ (متوفی ۸۸۴ھ/ ۱۴۷۹ء) گزری ہے۔ قاضی صاحب کے پیرومرشد ابوالفتح چشتی نظامی تھے۔

منشی برج بھوکن لال تاریخ دریاباد میں لکھتے ہیں کہ:

''مولانا عبدالماجد کے مورثِ اعلیٰ شیخ محمد آبکش چشتی نظامی شاہانِ شرقیہ جونپور کے عہد میں اپنے جدامجد قاضی عبدالکریم سرسنڈوی کے پاس سے پڑوس کے قصبے محمود آباد میں آئے'' ۔[۲]

مولانا عبدالماجد نے ''آپ بیتی'' میں تحریر فرمایا ہے کہ شیخ محمد آبکش صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، آپ کے کشف وکرامات کے متعدد واقعات زبانِ زدِ عوام ہیں۔

منشی برج بھوکن لال مخدوم آبکش کے مجاہدہ اور وجہ تسمیہ کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''حضرت مخدوم آبکش صاحب کا خاص مجاہدہ یہ تھا کہ کنویں سے پانی بھر کر لوگوں کو پلاتے اور نمازیوں کو وضو کراتے۔ اس خدمت کی بناء پر ان کا لقب ''حضرت مخدوم آبکش'' پڑ گیا۔ آپ کا تذکرہ کتب مشائخ میں موجود ہے مثلاً مرأۃ الاسرار (فارسی) کتاب شیخ نامہ (فارسی) وغیرہ'' ۔[۳]

اس کے علاوہ ''خزینۃ الاصفیاء'' میں بھی آپ کا ذکر ملتا ہے۔

مولانا عبدالماجد ''آپ بیتی'' میں لکھتے ہیں کہ:

''شاہان شرقیہ جون پور کے عہد میں اپنے جدامجد قاضی عبدالکریم سرسنڈوی کے پاس کے پڑوس کے قصبہ محمود آباد میں آئے، وہاں سے شاہی عامل دریا خان نایے جا کر انہیں اس خطۂ ویران میں لے آئے اور حضرت مخدوم نے ان کے نام پر اس کا نام دریاباد رکھ کر اس کی آبادی کی بنیاد ڈالی'' ۔[۴]

مخدوم آبکش نے یہیں انتقال فرمایا مولانا عبدالماجد مرحوم کے مکان کے متصل ان کا سادہ سا مزار ہے اور خود مولانا عبدالماجد بھی ان کے پہلو میں مدفون ہیں۔

مولانا دریابادیؒ کے پردادا مولوی مخدوم بخشؒ کے چار فرزند تھے: نور کریم، مظہر کریم، مرتضیٰ کریم، کرم کریم۔ یہ

چاروں ہی صاحبزادے بڑے ہی علم وفضل، جود وسخا اور حلم و بردباری میں معروف تھے۔
منشی برج بھوکن لال لکھتے ہیں کہ:

''مولوی محمد نور کریم ۱۲۰۸ھ۔۱۲۸۸ھ بمقام دریاباد پیدا ہوئے علوم عربیہ وفارسیہ کی تحصیل علماء فرنگی محل سے کی۔ علم طب ہندوستان کے مشہور وکہنہ مشق حکیم محمد علی عرف حکیم بنّا (لکھنؤ سے حاصل کی اور وہ قابلیت پیدا کی کہ استاذ کو شاگرد پر ناز ہو گیا''۔۵

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''علمی حلقہ میں حکیم صاحب ''طبیب گر'' کے خطاب سے مشہور ہو گئے تھے''۔۶

منشی برج بھوکن طبی اور غیر طبی خدمات کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''ضلع بارہ بنکی میں اول طبیب تھے جنہوں نے طب کی کتابوں کو عربی وفارسی سے اردو ادب کے قالب میں جلوہ گر فرما کر اپنی شاندار خدمت کا علمی ثبوت پیش کیا۔ مخزن الادویہ جو علم الادویہ میں مستند کتاب ہے، مطلع العلوم کیمیائے عناصری شرح اسباب وغیرہ کتابوں کے اردو نثر میں ترجمے کئے جو بارہا چھپ چکے ہیں''۔۷

حکیم صاحب عمدہ وضع قطع کے پابند صوم وصلوۃ خداترس انسان تھے۔ آپ کی دیانت داری اور مہمان نوازی مشہور تھی کوئی دن خالی نہ جاتا تھا جب دو چار مہمان دسترخوان پر موجود نہ ہوں۔ لغت، تفسیر، طب، تاریخ، حدیث وغیرہ کی بیسیوں کتابیں اپنے قلم سے لکھ ڈالیں، عمر کے آخری دور میں بڑودہ میں طبی خدمات کے فرائض انجام دیئے، اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

شیخ مخدوم محمد آ بکشؒ کی دسویں پشت میں عبدالماجد دریابادیؒ کے حقیقی دادا مفتی مظہر کریم ابن مولوی مخدوم بخش تھے۔ وہ شاہجہاں پور میں عدالت کلکٹری سررشتہ دار فوجداری بھی تھے اور صاحب افتاء مفتی بھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی جدوجہد کے لئے آزادی کے علم برداروں کی میٹنگوں کا انعقاد انہی کے مکان پر ہوتا تھا۔

اور انہوں نے جہاد کے فتویٰ کا اجراء بھی باقاعدہ اپنے دستخط سے کیا تھا۔ مولانا مظہر کریم کے متعلق یہ بات بھی مشہور ہے کہ غدر کی شورش میں کسی انگریز کو اپنے گھر کے بکس میں چھپا کر اس کی جان بچائی تھی لیکن جب شورش اور ہنگامہ تھما اور وہ جانے لگا تو کسی اور نے اس کو قتل کر دیا جس کا الزام ان کے سر آیا۔ اسی الزام میں ان کو ۹ ؍سال کی قید کی سزا عبور دریائے شور (جزائر انڈمان) کی سنادی گئی تھی۔

عبدالماجد دریابادیؒ ان کی اسیری اور علمی مشغلہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''اس اسیری اور جلاوطنی میں رفاقت متعدد علمائے وقت کی حاصل رہی۔ دو کے نام تو متعین طور پر معلوم ہیں۔ایک مولانا مفتی عنایت احمد (صاحبِ تواریخ الٰہ) دوسرے معقولی فضل حق خیرآبادی جلاوطنی کے گیارہ بارہ سال کٹ چکے تھے، کہ اپریل ۱۸۶۹ء میں گورنمنٹ کا یہ اشتہار شائع ہوا کہ مفید عام ترجمے پر اہلِ علم کو بشرط ہند حکومت سے معقول نقد انعام عطا ہوگا۔ مفتی عنایت احمد صاحب الٰہ مولانا مظہر کریم دونوں صاحبوں نے اس اعلان سے فائدہ اٹھا کر عربی جغرافیہ کی ایک مشہور کتاب ترجمے کے لئے انتخاب کر لی۔ مفتی صاحب نے تقویم البلدان کو لیا اور مولانا نے مراصدالاصطلاع کو اور جب انعام کا وقت آیا تو بجائے کسی نقد رقم کے رہائی کو پیش کیا۔ چنانچہ بقیہ میعاد معاف ہوگئی اور مولانا غالباً شروع ۱۸۷۰ء میں جلاوطن واپس آ گئے اس کے بعد وطن ہی میں خانہ نشین رہے۔ خاموشی کے ساتھ علمی و دینی خدمات میں لگے رہے یہاں تک کہ ۱۵/شعبان ۱۲۸۹ھ/۱۴/اکتوبر ۱۸۷۳ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا''۔[8]

مولوی مخدوم بخش کے تیسرے صاحبزادے حافظ مرتضٰی کریم تھے۔ وہ بڑے باہمت اور بلند حوصلہ کے مالک تھے، مذہبی فرائض کی انجام دہی میں سبقت رکھنے والے تھے، ساتھ ہی ساتھ فن خطاطی وخوش نویسی کے ماہر تھے۔

مولانا دریابادیؒ نے ان کے احوال وکوائف کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ صرف ''تاریخ دریاباد'' میں ان کے متعلق مختصر احوال درج ہیں وہی اصل ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عبدالماجد دریابادیؒ کے اجداد میں چوتھے نمبر پر شیخ کرم کریم عرف چھیدا میاں کا ذکر آتا ہے۔ یہ صوم وصلوٰۃ کے پابند، خدا اور رسولؐ کے سچے عقیدت مند تھے، بلاتفریق مذہب ہندوؤں ومسلمانوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے اور سیکولر کردار کے حامل تھے۔ خوشامد وچاپلوسی سے سخت نفرت تھی۔ مفلسوں وغریب رشتہ داروں اور رعایا کا بڑا خیال رکھتے تھے۔

قول وفعل کے سچے اور بات کے دھنی تھے، فیاضی اور سخاوت سے فطری لگاؤ تھا اور اس بارے میں دور دور تک ان کا کوئی مدِ مقابل نہ تھا۔ عُمّالِ شاہی میں خاص طور پر اثر ورسوخ حاصل تھا۔

**والدین:**

مولانا عبدالماجدؒ کے والد مولوی عبدالقادر ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ مفتی مظہر کریم کے

چھوٹے صاحبزادے تھے۔تعلیم وتربیت اپنے وقت کی مشہور ومعروف دانشگاہ فرنگی محل سے حاصل کی۔دینی اور بعض نصابی کتابوں کی تعلیم مشہور عالم وفاضل اور شیخ طریقت استاذ مولوی محمد نعیم فرنگی محل سے حاصل کی۔اور انہی سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت بھی تھے، بڑے عابد وزاہد تھے۔

مولانا عبدالماجد لکھتے ہیں:

''با قاعدہ عالم تو نہیں لیکن درس کی اکثر کتابیں پڑھ لیں اور عملاً عالم درجہ میں آہی چکے تھے عربی وفارسی میں دستگاہ کے ساتھ اردو کی بھی استعداد اچھی خاصی حاصل کر لی تھی''۔9

سلیم الفطرت تھے، مطالعے اور مضمون نگاری کا شوق شروع ہی سے تھا، اخباروں، رسالوں کے علاوہ معلوماتی اور مذہبی کتابوں کے مطالعے کا شوق آخر عمر تک برقرار رہا اور کچھ نہ کچھ لکھنے لکھانے کا شوق رکھتے تھے۔

پینشن لینے کے بعد اس وقت کے مشہور اخباروں مثلاً روزنامہ اودھ اخبار، گورکھپور کے سہ روزہ ریاض الاخبار اور پھر اسی کے جانشین، ہفتہ وار مشرق میں مذہبی معاشرتی ونیم مذہبی مختلف عنوانات پر برابر لکھتے رہے۔ انگریزی بھی اپنے مطالعے کے زور سے بقدرِ ضرورت سیکھ لی تھی۔مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ وکالت کا امتحان پاس کیا لیکن اس سند کو کسب معاش کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔اپنے ہی ضلع بارہ بنکی میں ایک چھوٹے سے سرکاری اسکول میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا، پھر ہردوئی میں کسی انگریز افسر کو فارسی پڑھائی۔جس نے خوش ہو کر اس نے اپنی خصوصی سفارش سے ان کو عدالت فوجداری کی سرشتہ داری دلا دی، پھر یہ اپنی محنت و دیانت داری، جفاکشی، فرض شناسی سے تحصیل داری کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔

مولانا عبدالماجد کی پیدائش سے قبل ہی ان کے والد ڈپٹی کلکٹری کے معزز عہدے پر پہونچ گئے یہ عہدہ اس وقت ہندوستانیوں کے لئے خصوصی اعزاز سمجھا جاتا تھا۔اس وقت ان کو ماہانہ تنخواہ کا گریڈ ۴۰۰ روپیہ ملتا تھا۔عبدالقادر ہردوئی بارہ بنکی، لکھیم پوری کھیری، گونڈہ، بستی، گورکھپور، فیض آباد، سیتاپور میں ڈپٹی کلکٹر رہے اور ہر جگہ ہر دلعزیز رہے۔موصوف نے اپنی محنت دیانت داری، انسانیت اور خدمتِ خلق کو اپنا مذہب ومسلک بنالیا تھا، بلاتفریقِ مذہب ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑی عزت واحترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ چنانچہ بہنوں بیواؤں اور یتیموں کی مدد اپنی جیب سے کرتے تھے۔

مزارات کے معتقد تھے مگر زیادہ بدعات سے دامن ہمیشہ بچائے رکھا۔

۱۹۰۴ء میں شیخ عبدالقادر صاحب ڈپٹی کلکٹری عہدہ سے سبکدوش ہوگئے اور ماہانہ پینشن ڈھائی سو روپیہ ملنے لگی۔

اکتوبر ۱۹۱۲ء میں مولانا عبدالماجد کے والد محترم مع اہل وعیال کے سفر حج کے لئے روانہ ہوئے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس سفر حج کا ذکر بہت ہی رقت آمیز اور مؤثر انداز میں کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

> ''رخصتی کے وقت والد محترم کی آنکھوں سے آنسو زار وقطار جاری تھے، بالکل خلاف معمول اور آہ! کہ عالم آب وگل میں یہ آخری رخصتی تھی۔ میں شقی القلب وناداں ان کی اس رقّتِ قلب اور فطری بارشِ مہر کو حیرت سے دیکھتا اور بے محل سمجھتا''۔۱۰

ارکانِ حج کی ادائیگی کے بعد منیٰ ۱۲؍ذی الحجہ ۱۳۳۰ ہجری/ ۱۴؍نومبر ۱۹۱۲ء کی شب میں ہیضہ کے شکار ہوگئے اور اونٹ پر ڈال کر مکہ معظّمہ لائے گئے، روتا پیٹتا سارا قافلہ ساتھ آیا۔ ۱۴؍ذی الحجہ اذان فجر کے وقت انتقال ہوا اور رب کعبہ کے حضور میں حاضر ہوگئے۔

نماز جنازہ صحنِ حرم میں خانۂ کعبہ کے سایہ میں ادا کی گئی اور وہاں کے جنت المعلیٰ میں صحابیٔ رسول عبدالرحمٰن ابن ابی بکرؓ کے پہلو میں دفن کیا گیا، حضرت اکبرالٰہ آبادی نے مولوی عبدالقادر صاحب کی تعزیت میں مولانا ماجد کی درخواست پر یہ قطعہ ارشاد فرمایا تھا:

پیشوائے قوم والا مرتبت شیخ عبدالقادر والا صفات
آخرت ہی پرنظر رکھتے تھے وہ سمجھتے تھے دنیائے دوں کو بے ثبات
جاو منصب میں وہ گو ممتاز تھے کرتے تھے یادِ خدا دن ہو کہ رات
ان کے ذکر وشغل کا تھا یہ اثر شغل ہی سے نکلی تاریخِ وفات

۱۳۳۰ھ

**والدۂ ماجدہ:**

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی والدہ محترمہ کا نام بی بی نصیر النساء تھا، مولوی حکیم نور کریم کی اولادوں میں نصیر النساء سب سے چھوٹی تھیں، عبدالقادر کا نکاح اپنے بڑے چچا مولوی حکیم نور کریم کی صاحبزادی نصیر

النساء کے ساتھ ہوا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنی ''آپ بیتی'' میں ان کا امکانی سالِ ولادت ۱۸۵۳ء لکھا ہے۔ وہ قرآن پاک اٹک اٹک کر ایک ایک لفظ نکال نکال کر پڑھتی تھیں، اس پر بھی تلاوت پابندی کے ساتھ عمر بھر قائم رہی۔ اردو میں صرف حرف شناس تھیں، مولوی اسماعیل صاحب کی پہلی یا دوسری ریڈر سے آگے نہ بڑھ سکیں اور اخیر عمر میں قوت حافظہ کمزور ہو گیا اور یہ سب بھی حافظہ سے محو ہو گیا تھا۔

پردہ نشین خاتون تھیں، پردہ کا بہت اہتمام تھا، ساتھ ہی امور خانہ داری کا سلیقہ، شوقِ عبادت میں اپنی نظیر آپ تھیں، اشراق، چاشت، تہجد اور نفلی نمازوں کا خاص اہتمام رکھتیں۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ مرحومہ کو اذان سے بھی عشق تھا۔

ان کا انتقال ۱۳/ اپریل ۱۹۴۱ء کو فیض آباد میں ہوا جہاں آپ کے بڑے لڑکے مولوی عبدالمجید ڈپٹی کلکٹر تھے، عبدالماجد دریابادیؒ کی زبان سے سورۂ یٰسین سنتے سنتے رحلت فرما گئیں عمر ۸۷۔ ۸۸ کی پائی۔ تدفین کے لئے فیض آباد سے دریاباد لایا گیا، ان کی وصیت اور خواہش کے مطابق خاندانی مسجد کی پشت پر قدیم قبرستان میں دفن کیا گیا۔

## فصل دوم:

# مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی مختصر

## سوانح از ولادت تا وفات

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ولادت باسعادت ایک معزز اور دیندار قدوائی خاندان میں ضلع بارہ بنکی کے ایک قصبے دریاباد میں ۱۶/مارچ ۱۸۹۲ء/ مطابق ۱۶/شعبان ۱۳۱۰ھ میں ہوئی۔ سن ہجری کے ماہِ شعبان اور انگریزی تاریخ دونوں غالباً ۱۶/تھی۔ عبدالماجد دریابادی اپنی ''آپ بیتی'' میں یہی لکھتے ہیں کہ:

''۱۸۹۲ء میں والد ماجد ضلع لکھیم پور کھیری میں ڈپٹی کلکٹر تھے، اور والدہ ماجدہ دریاباد آئی ہوئی تھیں، کہ میری پیدائش یہیں ہوئی۔ شب کا وقت تھا اور شعبان کی ۱۶/ویں کو میری پیدائش ہوئی۔ بڑے ہو کر میں نے منشی رحمت اللہ رعد کانپوری (بڑی جنتری والے) سے ٹھیک انگریزی تاریخ دریافت کی جواب آیا۔ ۱۶/شعبان ۱۳۱۰ھ کو مارچ ۱۸۹۲ء کی بھی ۱۶ ہی تھی''۔ واللہ اعلم۔[11]

عبدالماجد دریابادیؒ قصبہ کی اہمیت وقدامت اور محل وقوع بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''لکھنؤ سے یورپ کی جانب فیض آباد کو ریل سے چلئے جو خود اودھ کا دارالحکومت رہ چکا ہے شجاع الدولہ کے زمانے تک تو آدھو آدھ پر اسٹیشن ملے گا دریاباد اسٹیشن سے ڈیڑھ میل دور شمال میں چلئے تو اصل قصبہ میں پہنچ جایئے''۔[12]

قصبہ دریاباد کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے شاہانِ شرقیہ جونپور کے زمانے میں مولانا ماجد کے خاندان کے مورثِ اعلیٰ شیخ محمد آبکش چشتی اپنے جدِ امجد قاضی عبدالکریم سرسنڈوی کے پاس پڑوس کے قصبہ محمود آباد میں آئے، اس وقت ان اطراف کے حاکم کوئی دریا خاں نامی تھے وہ حضرت مخدوم کو اس خطۂ ویران میں لے آئے اور حضرت مخدوم نے اس مقام کا نام دریا خاں کے نام سے موسوم کر کے دریاباد رکھ دیا۔

### مولانا دریابادی کا بچپن اور ابتدائی تعلیم:

عبدالماجد کا بچپن فراوانی وخوشحالی میں گزرا چنانچہ اپنے قلم سے عہدِ طفل کی دلچسپ روداد اس طرح

بیان کرتے ہیں کہ:

''عمر ابھی چوتھے ہی سال اور ۱۸۹۵ء تھا کہ بسم اللہ کرنا طے پائی گئی۔ والد مرحوم لکھیم پور کھیری میں ڈپٹی کلکٹر تھے ایک سہ پہر کو محفل آراستہ ہوئی اور وطن کے ایک خوش اوقات وخوش صفات عالم صاحب، جو بھائی صاحب کی اتالیقی پر مامور تھے، وہ زنانہ مکان کے صحن میں بسم اللہ کرانے بیٹھے مٹھائی کے خوان سامنے رکھے ہوئے اور عزیزوں، نوکروں، چاکروں کا گروہ حلقہ جمائے ہوئے۔ مولوی صاحب بچارے پیار وشفقت کے لہجے میں کہا کہ کہو۔ بسم اللہ۔ یہاں جواب میں قطعی خاموشی اب اور لوگ بھی ان کے شریک کار ہوئے۔ لیکن اس صدی لڑکے کی زبان پر قفل لگا ہوا تھا۔ والد مرحوم کو آخر غصہ آیا اور کب تک نہ آتا۔ سمجھانے بجھانے چمکارنے کی حد ہو چکی تھی۔ چھڑی ہاتھ میں لے، انہوں نے جمانا شروع کر دی۔ لوگوں نے ہائیں ہائیں کر کے کسی طرح جان بچائی۔ چلمنوں کی آڑ سے والدہ ہمشیرہ یہ تکلیف دہ تماشہ دیکھتی رہیں اندر بلایا سمجھایا۔ آخر میں جو میری کھلائی تھیں ان بے چاری نے کہا کہ واہ میرے بھیا کو کیا بسم اللہ کہنا نہیں آتا۔ میں نے کہا آتا کیوں نہیں، بس میں ان کے ساتھ جا مولوی صاحب کے کمرے کے باہر ہی سے انہیں چلا کر سنا آیا۔ اداسی خوشی سے بدلی چہروں پر ہنسی آئی۔ اسی کو کہتے ہیں: ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو''۔[۱۳]

عبدالماجد دریابادی نے گھر ہی پر قرآن مجید ناظرہ اور اردو فارسی کی متداول کتابیں پڑھیں۔ مولوی اسماعیل میرٹھی کی ریڈریں، فارسی میں گلستاں، بوستاں اور سکندر نامہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اپنے فن پر بہترین فارسی کتاب ''کیمیائے سعادت'' کے بعض اجزاء کا مطالعہ کیا۔ اسی کتاب کے پہلو بہ پہلو ملا جامی کی یوسف زلیخا بھی پڑھی، اس ابتدائی خانگی تعلیم میں عربی کی شد بد حاصل کی۔ عربی کے پہلے استاد شیعہ عالم حکیم محمد ذکی تھے اس کے بعد مزید عربی زبان مولوی عظمت اللہ فرنگی محلی سے سیکھی، عبدالماجد نے ان سے فیض حاصل کیا اس اکتساب فیض کا کھل کر اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''عربی ٹوٹی پھوٹی جو کچھ بھی آئی ان (مولوی عظمت اللہ) کی بدولت آئی۔ بڑے شفیق بھی تھے اور قابل وفاضل بھی تھی''۔[۱۴]

انگریزی کی حرف شناسی بھی ایک شریف ہندو استاد سے حاصل کی جو ان کے بڑے بھائی کو انگریزی پڑھانے آتے تھے۔ مولانا عبدالماجد نے پرائمری سے لے کر دسویں تک کی تعلیم سیتاپور کے ہائی اسکول میں

پائی اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔

عربی کے پہلے استاد لکھنؤ کے ایک ذی استعداد شیعہ حکیم محمد ذکی مرحوم تھے۔ حکیم صاحب عبدالماجد پر بڑے مہربان تھے۔ کچھ روز بعد فرنگی محل کے ایک ممتاز استاذ مولوی عظمت اللہ فرنگی محل آ گئے۔

آگے تعلیم کے لئے عبدالماجد نے جولائی ۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج لکھنو میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ جو اس وقت الہٰ آباد یونیورسٹی کے ماتحت تھا، یہی کالج آگے چل کر لکھنؤ یونیورسٹی میں تبدیل ہوا۔

## اعلیٰ تعلیم:

عبدالماجد دریابادیؒ نے جولائی ۱۹۱۰ء میں کیننگ کالج میں بی۔اے کے سالِ اول میں داخلہ لیا۔ بی،اے میں ماجد کے مضامین انگلش ٹیکسٹ، جنرل انگلش، فلسفہ اور عربی تھے۔ پہلے دو مضامین لازمی تھے، فلسفہ و نفسیات سے آپ کو خصوصی تعلق تھا ۱۹۱۲ء میں نے بی،اے کا امتحان بھی درجہ دوم میں پاس کیا۔

کیننگ کالج کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا ماجد کے خصوصی مراسم محمد حفیظ سید اور مولانا عبدالباری ندوی سے رہے۔ چنانچہ مولانا عبدالباری ندوی نے عربی کورس مکمل کرایا اور مولانا ماجد نے انگریزی تعلیم میں ان کی مدد کی۔

کیننگ کالج سے باہر جن عظیم شخصیات اور کرم فرماؤں سے تعلقات اسی زمانۂ طالب علمی میں استوار رہے۔ ان میں سرفہرست مولانا شبلی نعمانی، عبدالحلیم شرر، مولانا ابوالکلام آزاد، مرزا محمد ہادی رسوا، پنڈت بشن نرائن، سید سلیمان ندوی، راجہ محمود آباد خصوصیت سے لائقِ ذکر ہیں۔

چونکہ کیننگ کالج لکھنؤ میں ایم۔اے فلسفہ میں کرنے کی سہولت میسر نہ تھی اس لئے عبدالماجد نے اے ایم اے (فلسفہ) کے لئے ایم۔اے او کالج علی گڑھ (موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں داخلہ لیا۔ پہلے سال کا امتحان الہٰ آباد یونیورسٹی سے دیا کیونکہ علی گڑھ کالج نے اس وقت تک یونیورسٹی کا درجہ حاصل نہیں کیا تھا۔ بدقسمتی سے ماہر و مشفق استاذ اور نصابی کتابوں کے نہ ملنے کی وجہ سے عبدالماجد امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد اسی مضمون میں سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخلہ لیا، عین اسی زمانہ میں نومبر ۱۹۱۲ء میں ان کے والد بزرگوار کا انتقال مکہ معظّمہ میں ہو گیا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ حادثہ وقوع پذیر ہوا کہ جس بینک میں ان کے والد محترم نے رقم جمع کر رکھی تھی اس بینک کا دیوالیہ نکل گیا۔ جس کی وجہ سے ان کو مزید پریشانیوں کا سامنا

کر پڑا،اس کے بعد مروجہ اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع کر دینا پڑا۔

## زمانۂ الحاد وتشکیک:

عبدالماجد دریابادیؒ ایک معزز اور مذہبی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ابتدائی تعلیم وتربیت مذہبی ودینی خطوط پر ہوئی تھی،بچپن سے ہی مذہبی کتابوں کے پڑھنے لکھنے کا شوق رہالیکن کالج کی ابتدائی زندگی میں ان کے فکروذہن میں مذہب واخلاق کے بتائے ہوئے ضابطۂ زندگی کے خلاف بغاوت وسرکشی کے جذبات پیدا ہونے لگے،جس کے نتیجے میں عبدالماجد دریابادیؒ تقریباً نودس سال تک ملحد و مذہب بیزار رہے۔

لکھنؤ آنے کے بعد سب سے پہلے جس کتاب کے مطالعہ کا موقع ملا وہ کٹر ملحد ڈاکٹر ڈریسڈیل (Dr. Dyresdale) کی کتاب ELEMENTS OF SOCIAL SCIENCE تھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس کتاب کے متعلق اپنی ''آپ بیتی'' میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''کتاب کیا تھی ایک بارود بچھی ہوئی سرنگ تھی،حملہ کا اصل ہدف وہ اخلاقی بندشیں تھیں جنہیں مذہب کی دنیا اب تک بطورِعلوم متعارفہ کے پکڑے ہوئے ہے اوران پر اپنے احکام کی بنیادر کھے ہوئے ہے، مثلاً عفت وعصمت، کتاب کا اصل حملہ انہی بنیادی،اخلاقی قدروں پر تھا،اس کا کہنا تھا کہ جنسی خواہش تو جسم کا ایک طبعی مطالبہ ہے،اسے مٹاتے رہنا اوراس کے لئے باضابطہ عقد کا منتظر رہنا، نہ صرف ایک فعل عبث ہے بلکہ صحت کے لئے اور جنسی قوتوں کی بالیدگی کے لئے سخت مصر ہے اس لئے ایسی قیدوں پابندیوں کو توڑ ڈالو،مذہب اوراخلاق کے گھڑے ہوئے ضابطۂ زندگی کو اپنے پیروں سے روند ڈالو۔ صرف یہ ایک مضمون بیان ہوا،اسی طرح کتاب کی زد آکر ہر ایسی قدر پر پڑتی تھی جو مذہب اوراخلاق کو ہمیشہ عزیز رہے ہیں،اندازِ بیان بلا کا زور دار اور خطیبانہ تھا سولہویں سال کا ایک طفل ناداں اس سیلاب عظیم میں اپنے ایمان واخلاق کی ننھی منی سی کشتی کو کیسے صحیح وسالم پاتا ہے!''۔۱۵

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جن فلسفیوں سے بے حد متاثر ومرغوب ہوئے ان میں مل ہیوم، اسپنسر ، چارلس بریڈلا، بوشنر،انگرسول سرِفہرست شامل ہیں۔مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو ایمان واسلام سے برگشتہ کرنے میں ملحدوں اورنیم ملحدوں کی تحریریں نفسیات کے موضوع پر دستیاب ہوتی گئیں اور تشکیک والحاد کی فکر مستحکم ہوتی گئی۔

عبدالماجد دریابادیؒ نے کالج میں اختیاری مضمون فلسفہ بھی لیا تھا،اس زمانے میں نفسیات

(Psychology) بھی فلسفہ ہی کا حصہ تھی، اسی عرصہ میں ماہر فن ڈاکٹر ماؤسلے کی دو مشہور کتابیں جن کے اصل نام درج ذیل ہیں۔ مولانا نے جم کران دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا۔

مرضیات دماغی- The Pathology of Mind

عضویات دماغی-The Physiology of Mind

چنانچہ ان کتابوں نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو ایمان واسلام سے برگشتہ کرنے میں اہم رول ادا کیا اور ان کی الحادی فکر کو جلا بخشی۔

عبدالماجد دریابادیؒ اپنی ''آپ بیتی'' میں ذکر یوں کرتے ہیں کہ:

''مثلاً ایک شخص گزرا ہے ڈاکٹر ماڈسلی (Maudesley) اس کی دو موٹی موٹی کتابیں اس زمانہ میں خوب شہرت پائے ہوئے تھیں۔

ایکMental Physiology(عضویات دماغی)

دوسریMental Pathology(مرضیات دماغی)

اس دوسری کتاب میں اختلال دماغی اور امراض نفسیاتی کو بیان کرتے کرتے یک بیک وہ بد بخت مثال میں وحی محمدی کو لے آیا، اور اسم مبارک کی وہ اپنا کوئی بڑا کارنامہ دنیا کے لئے چھوڑ جائے!۔

ایمان کی بنیادیں کھوکھلی تو پہلے ہی ہو چکی تھیں، اب ان کم بخت ''ماہرین کی فن'' کی زبان سے اس قسم کی تحقیقات عالیہ سن کر رہا سہا ایمان بھی رخصت ہو گیا، اور الحاد وارتداد کی منزل تکمیل کو پہنچ گئی!''۔[۱۶]

رفتہ رفتہ اب اسلام کے نام سے بھی شرم آنے لگی اور انٹرمیڈیٹ کے سالانہ امتحان کا جب وقت آیا تو امتحانی فارم کے خانہ مذہب میں بجائے مسلم کے درج صرف ''ریشنلسٹ'' کیا۔

الحاد وتشکیک اور ریشنلزم کی یہ کیفیت کم وبیش دس سال تک قائم رہی اسی زمانہ میں انہوں نے علامہ شبلی نعمانیؒ کی معرکۃ الآراء تصنیف ''الکلام'' کو تنقید کا نشانہ بنا ڈالا، جس میں عقائدِ اسلامی، وجودِ باری تعالیٰ، نبوت اور ضرورتِ مذہب پر اعتراضات تھے، یہ مضمون رسالہ الناظر کے مدیر نے قسط وار شائع کیا جو علامہ شبلی نعمانیؒ کے معاندین میں سے تھے۔

اسی الحادی فکر کے عرصہ میں انہوں نے نفسیات قیادت Psychology of Leadership

پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی جولندن سے شائع ہوئی، بعد میں اسے اردو کے قالب میں ڈھال کر فلسفۂ اجتماع نامی کتاب لکھ ڈالی۔ دونوں کتابوں میں مذہب بیزاری اور تشکیک آفرینی کے عکاسی نمایاں ہے، چنانچہ ان کتابوں پر مخالفانہ تبصرے ہندوستانی اخبارات ورسائل میں چھپے اور علماء نے ان پر کفر کا فتویٰ عائد کیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنے دورِ تشکیک والحاد پر اظہارِ ندامت وافسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''......رفتہ رفتہ ذات رسالتؐ سے ایک طرح بغض وعناد پیدا ہوگیا۔ لکھنؤ سے ایک ماہ نامہ الناظر نامی نکلنا شروع ہوا تھا، اس میں ایک لمبا چوڑا مضمون کئی قسطوں میں فرضی نام سے، مولانا شبلی کی کتاب الکلام کے رد میں یا تنقید میں لکھ ڈالا۔ مضمون تھا حقیقت میں مذہب اور مذہب اسلام کے ابطال میں۔ لیکن اس پر پردہ پڑا ہوا تھا مولانا شبلی کی کتاب کی تنقید کا، اس لئے ایڈیٹر صاحب نے جو مولانا سے خفا تھے اسے بلا تأمل شائع کر دیا۔ سن شعور پر پہنچ کر پہلی بار باضابطہ کتاب 'فلسفہ جذبات' قلم سے ۱۹۱۳ء میں نکلی۔ سن کا اس وقت ۲۱/واں سال تھا۔ کتاب انجمن ترقی اردو نے لکھوائی اور اسی نے چھاپی، صحیح نام 'نفسیات جذبات' ہونا چاہئے تھا مگر نفسیات کی اصطلاح اس وقت نامانوس تھی۔ اب اس کوتاہیوں پر ہنسی تو کم آتی ہے، غصہ زیادہ آتا ہے۔ دوسری کتاب ہر اعتبار سے لغو 'فلسفہ اجتماع' لکھ ڈالی جس کا ایک ایک صفحہ الحاد سے داغدار، اس کی اشاعت وفروخت مدت دراز ہوئے بند کرا چکا ہوں''۔ ۱۷

## ازسرِ نو اسلام کے عبوری دور میں مولانا کے راہ نما:

آپ پر تشکیک والحاد کا یہ سلسلہ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک رہا، جس میں خارجی کتابوں کا مطالعہ اور فرنگی نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کا بھی خاصا دخل تھا، مولانا عبدالماجد دریابادی کو بحر ضلالت وتشکیک والحاد سے اسلام کی عظمت ومعنویت کی طرف لانے میں جن زندہ شخصیات نے اہم رول ادا کیا ان کا تذکرہ مولانا عبدالماجد نے بڑے ادب واحترام سے کیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ''آپ بیتی'' میں نامور حکیم شاعر اکبرالہ آبادی کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

''ایک روز بولے کہ ''کیوں صاحب، آپ نے تو کالج میں عربی لی تھی، پھر اب بھی اس سے کچھ مناسبت قائم ہے؟ علم وزبان کوئی بھی ہو، بہرحال اس کی قدر تو کرنی ہی چاہئے'' میں نے کہا ''اب اس کے لکھنے پڑھنے کا وقت کہاں ملتا ہے''۔ بولے کہ ''نہیں کچھ ایسا مشکل تو نہیں، قرآن کی بے مثل ادبیت کے تو اہل یوروپ بھی قائل ہیں، اور سنا ہے کہ جرمن یونیورسٹیوں میں قرآن کے آخری پندرہ پارے

عربی ادب کے کورس میں داخل ہیں، جتنے حصہ آپ کی سمجھ میں نہ آئیں، انہیں چھوڑتے جائیے، اور یہ سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے لئے نہیں لیکن آخر کہیں تو کچھ فقرے آپ کو پسند آ ہی جائیں گے۔ بس انہیں فقروں کو دو چار بار پڑھ لیا کیجئے اور آپ کے لئے کوئی قید و باوضو ہونے کی نہیں' یہ ایک نمونہ تھا، ان کی تبلیغ کا''۔۱۸

حضرت اکبرالہ آبادی مولانا دریابادیؒ کو وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی طرح قرآن کریم کی تلاوت اور اس کے معانی و تفسیر کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔

حضرت اکبرالہ آبادی کے بعد جس دوسری شخصیت کی تبلیغ و نصائح نے عبدالماجد دریابادیؒ کی تعمیر اور قلبِ ماہیت میں قابلِ قدر کردار ادا کیا ہے وہ مولانا محمد علی جوہرؒ کی شخصیت تھی، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو ان سے بے پناہ اور گہری عقیدت تھی۔ مولانا محمد علی جوہر بھی حضرت دریابادیؒ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، اور اپنے مخصوص انداز اور جوش و جلال میں پند و نصائح کہا کرتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی ''آپ بیتی''میں لکھتے ہیں کہ:

> ''میرے تو گویا محبوب ہی تھے، کبھی خط میں، اور کبھی زبانی، جہاں ذرا بھی موقع پاتے، ابل پڑتے، اور جوش و خروش کے ساتھ، کبھی ہنستے ہوئے، کبھی گرجتے ہوئے اور کبھی آنسو بہاتے ہوئے تبلیغ کر ڈالتے''۔۱۹

حضرت دریابادیؒ کی انگریزی کتاب 'THE PSYCHOLOGY OF LEADERSHIP' ۱۹۱۵ء میں لندن سے شائع ہوئی تو عبدالماجد دریابادی نے ایک نسخہ مولانا محمد علی جوہر کی خدمت میں ارسال کیا۔ اس پر جو مولانا محمد علی جوہر نے خط کے ذریعہ تبصرہ کیا، وہ ایک مفصل مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مفصل خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

مولانا محمد علی جوہر لکھتے ہیں کہ:

> ''میری تنقید کا آخری عنوان آپ کے ان تذکروں سے متعلق ہے جو آپ نے پیغمبر خدا اور قرآن مجید کی تمثیل لاتے وقت کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سچے اور حقیقی مسلمان ہیں۔ اس بناء پر مجھے سخت حیرت ہو رہی ہے کہ آپ نے ایسی مقدس شخصیت اور ایسی مقدس آسمانی کتاب کا ذکر کس ہلکے پن سے کیا ہے کیا یہ آورد و تصنع اپنی ''ناطرف داری'' اور خالص علمی تحقیق کے اظہار کے لئے ہے یا کیا؟......

............آپ کے لب ولہجہ میں تو صاف عیسائی مشنریون کی بو آ رہی ہے‘‘۔[۲۰]

تیسری نامی گرامی شخصیت اور ناصح حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ تھے جنھوں نے اپنے مکتوبات کے ذریعہ عبدالماجد دریابادیؒ کو ان کی فکری ارتداد اور غیر اسلامی حالت بدلنے میں زبانی اور تحریری طور پر بڑی کوششیں کیں۔اسی زمانہ میں حضرت دریابادیؒ ''سائیکلو جی آف دی قرآن لکھنا اور قصۂ یوسفؑ کو ڈرامائی شکل دینا چاہتے تھے۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ۱۳ر دسمبر ۱۹۹۵ء کے ایک خط میں تحریر کیا کہ:

''نفسیات القرآن بشوق لکھئے لیکن داد دینے کیلئے نہ کہ عیب جوئی کے لئے۔بہر حال اگر آپ اسلام کی حمایت کا اس سے کام لیں گے تو خدارا جلد لکھئے اور اگر کچھ اور نیت ہے تو اس امت مرحومہ پر للّٰہ رحم فرمایئے‘‘۔مزید لکھا کہ:''یوسف کا قصہ آپ قرآن سے لے کر کیوں لکھیں تورات سے لکھئے کہ دو اور قومیں بھی آپ کی ممنون ہوں‘‘۔[۲۱]

اس کے علاوہ مہدی افادی نے بھی انتہائی محبت اور حکمت کے ساتھ عبدالماجد دریابادی کی فہمائش کرتے رہے۔مسلم شخصیات کے علاوہ چند غیر مسلم شخصیتوں نے بھی مولانا کو مذہب اسلام کی طرف مائل کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ان میں سرِ فہرست لائقِ ذکر شخصیت بھگوان داس کی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنی آپ بیتی میں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے کہ:

''ڈاکٹر بھگوان داس سے ملا کتابیں پڑھ کر گرویدہ ہو ہی چکا تھا عجیب بزرگ تھے۔فلسفی تو خیر تھے ہی ساتھ ہی ہندو جوگ کے طریقہ کی خوب ریاضتیں لئے ہوئے آنکھوں میں چمک چہرہ پر ایک طرح کا نور باتیں بڑی حد تک حقیقت سنجی کی کرتے رہے۔اور میرا الحاد کسی نہ کسی حد تک ان کی روحانیت سے متاثر رہا‘‘۔[۲۲]

افراد و شخصیات کے علاوہ عبدالماجد دریابادیؒ نے جن کتب سے کسی نہ کسی درجے میں اثر قبول کیا ان میں ایک تو شبلی نعمانیؒ کی ''سیرت النبیؐ'' ہے، دوسری ''مثنوی معنوی''، ہے اور تیسری ''مکتوبات مجدد الفِ ثانی'' ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کی سیرت النبیؐ (حصہ اول) کے اکتساب فیض کا ذکر کرتے ہوئے عبدالماجدؒ لکھتے ہیں کہ:

''نفس شوم کو سب سے بڑی ٹھوکر جو لگی تھی وہ اس سیرتِ اقدس ہی کے متعلق تھی۔مستشرقین و محققین

فرنگ کے حملوں کا اصل ہدف تو ذاتِ رسالت ہی تھی۔شبلی نے (اللہ ان کی تربت ٹھنڈی رکھے اصل دوا اسی درد کی کی۔مرہم اس زخم پر کھا اور کتاب جب بند کی تو چشمِ تصور کے سامنے رسول عربی ﷺ کی تصویر ایک بڑے مصلح قوم وملک اور ایک رحم دل فیاض حاکم کی تھی جس کو جدال وقتال سے کام لینا پڑا تھا تو بالکل آخر درجے ہیں''۔۲۳؎

مولانا دریابادیؒ نے ۱۹۱۹ء کے آخر میں مثنوی معنوی'' کے دفاتر کا مطالعہ شروع کیا،اس کتاب سے جو تاثر لیا اسکے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''کتاب شروع کرنے کی دیر تھی کہ یہ معلوم ہوا کہ کسی نے جادو کر دیا۔کہاں کا کھانا پینا اور کیسا سونا بس جی میں یہی کہ کمرہ بند کر کے خلوت میں کتاب پڑھتے جایئے کہیں کہیں آنسو بہایئے بلکہ کہیں کہیں چیخ بھی پڑیئے!''۔۲۴؎

تیسری کتاب مکتوبات مجدد سرہندی ہے اس کے مطالعے سے بھی مولانا دریابادیؒ کی طبیعت پر کافی گہرا اثر پڑا،اور اتباع شریعت کی متعین شاہراہ مل گئی۔اور بالآخر بڑی قوت کے ساتھ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور اسلام کی دعوت وتبلیغ میں پوری قوت صرف کی۔

## ملازمت وذریعۂ معاش:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ۱۹۱۳ء میں رسمی تعلیم مکمل کی۔والد محترم کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ چکا تھا۔تعلیمی فراغت کے بعد معاشی مسائل کے حل کے لئے حصول ملازمت کی جدوجہد شروع کردی۔انہوں نے ملازمتوں مثلاً اسٹنٹ پروفیسر،ریلوے،اور پوسٹ آفس وغیرہ میں افسر گریڈ کی ملازمت کا ارادہ کیا مگر کامیابی مقدر نہ ہوئی۔البتہ بقدرِ ضرورت معاوضہ اردو رسالوں میں مضمون نگاری اور تراجم سے ملتا رہا۔اتفاق سے کیننگ کالج لکھنؤ میں اسسٹنٹ پروفیسر یا جونیئر لیکچرر کی جگہ نکلی،اس وقت مولانا دریابادیؒ کی علمی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔فلسفہ میں مولانا کو امتیازی مقام حاصل تھا،مولانا شبلی مرحوم نے مولانا دریابادیؒ کی استعداد اور علمی اوصاف کی بناء پر ایک زبردست سفارشی خط پرنسپل کے نام تحریر فرمایا،جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نعمانیؒ مولانا دریابادیؒ کی قابلیت اور علمی بصیرت سے کس قدر متاثر تھے۔علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں کہ:

''مولوی عبدالماجد صاحب بی اے کو ایک مدت سے جانتا ہوں ،ان کے علمی اور خصوصاً فلسفیانہ مضامین میں نے کثرت سے پڑھے ہیں ،مجھ کو یہاں تک معلوم ہے کہ ہندوستان میں کوئی شخص ایسا

نہیں ہے، جو نہایت دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس خوبی سے ادا کر سکتا ہو، جس طرح عموماً مولوی عبدالماجد صاحب کے مضامین پائے جاتے ہیں' ۔ میں انگریزی نہیں جانتا لیکن مصر و شام میں یورپ کا فلسفہ جس قدر عربی میں منتقل ہوا ہے، سب میرے پیشِ نظر ہے، میں بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ کسی عربی ترجمہ یا مستقل تصنیف میں فلسفیانہ مسائل اس خوبی سے ادا نہیں کئے گئے ہیں ۔ مولوی صاحب موصوف بالطبع فلاسفر ہیں، انکا ذوق خالص علمی ذوق ہے وہ ہر وقت فلسفہ اور متعلقات فلسفہ کے مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں، اور یہ بالکل قطعی ہے کہ گو وہ فلسفہ میں ایم اے نہیں ہیں، لیکن کثیر التعداد ایم اے سے بہتر ہیں، اگر وہ فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوں تو میں کالج کی خوش قسمتی سمجھوں گا ۔ ان اوصاف کے علاوہ ان کے ذاتی اخلاق وعادات اور متانت وسنجیدگی اور شرافت نسب کی بہتر سے بہتر شہادت دے سکتا ہوں'' ۔ ۲۵؎

مگر مولانا دریابادیؒ فلسفیانہ استعداد وصلاحیت اور علامہ شبلیؒ کی سفارش اور مسٹر کیمرن سے ذاتی مراسم کے باوجود کینگ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر نہ بن سکے ۔

''۱۹۱۶ء آ گیا اور شروع جون میں شادی ہوگئی ،علی گڑھ کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے میری انگریزی کتاب سے خوش ہو کر مجھے کانفرنس آفس میں بہ طور لٹریری اسسٹنٹ طلب کیا اور ۷۵ر تنخواہ مکان منت گویا ۲۰۰ر اور صاحبزادہ صاحب کام سے خوش بھی رہے، لیکن کا کیا علاج کہ نئی اور محبوب میر کو چھوڑ کر گیا تھا، جی نہ لگا، چھوڑ کر چلا آیا ۔'' ۲۶؎

مگر دریابادیؒ علی گڑھ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے ان کی طبیعت ہر قسم کی قید وبند کو بار سمجھ رہی تھی ،محبوب بیوی سے جدائی اس لئے ملازمت چھوڑ کر چلے آئے ۔صحت وطبیعت کی ناسازی کے عذر پر استعفیٰ دے دیا، ممکن ہے کہ ملازمت چھوڑنے کی ایک وجہ آفتاب احمد خاں کے مزاج کی سختی اور علی گڑھ کے ماحول سے دل برداشتگی بھی ہو، لیکن ہٹنے کے بعد تمام دل برداشتگیوں کا قصوروار اپنے ہی کو ٹھہرایا ۔

۱۹۱۷ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مولانا کو حیدرآباد بلا لیا ۔ وہاں آپ کو سررشتہ تالیف وترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی منطق وفلسفہ کے مترجم کی حیثیت سے ملازمت کا موقع ملا ۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے جولائی ۱۹۱۸ء تک اس شعبہ سے وابستہ رہے، پہلی اگست ۱۹۱۸ء میں وہاں سے بھی استعفیٰ دے دیا۔

## گھریلو حالات اور شادی:

ہندوستانی معاشرہ بیشتر روایات سے جڑا ہوا تھا، اس زمانہ میں دیگر رسومات کے ساتھ منگنی اور بچپن کی شادی کا بھی رواج تھا۔ چنانچہ آٹھ نو سال کی عمر میں مولانا کی نسبت ایک قریبی عزیزہ سے ٹھہرا دی گئی، اس میں عبدالماجد کی مرضی یا پسند کا کوئی دخل نہیں تھا، بلکہ خاندان کے بزرگوں نے اپنی مرضی سے یہ رشتہ طے کر دیا تھا۔ مولانا کی مخطوبہ ان سے عمر میں آٹھ سال چھوٹی تھیں، مگر امورِ خانہ داری میں ماہر، سلیقہ مند، خوبصورت تھیں، مولانا کو یہ رشتہ پسند نہ آیا اور اپنی پسند کی شادی کی۔

مولانا ان منسوبہ کے متعلق ''آپ بیتی'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اسکول کا دور ختم ہوا اور کالج میں آ گیا۔ سن بھی کوئی ۱۶، ۱۷ کا، اب کبھی شادی کا خیال آنے لگا، دل کو ٹٹولا تو کوئی کشش اس لڑکی کی بابت نہ پائی، وہ خوبصورت تھی، سلیقہ مند تھی، خوش اطوار تھی، لیکن بہر حال دیہات کے ماحول میں پرورش پا رہی تھی، اور بھولی بھالی تھی، علوم وفنون کی تعلّی اور شہر کی چلت پھرت سے کوسوں دور اور یہ مجھ فرنگیت زدہ اور سُودہ ''ریشنلسٹ'' کی نگاہ میں سو جرموں کا ایک جرم، سو عیبوں کا ایک عیب تھا''۔[۲۷]

عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنی اس بے زاری اور ناپسندیدگی کا اظہار اپنے بے تکلف دوست سے کر دیا، اس بات کا علم جب آپ کی والدہ ماجدہ کو ہوا تو انہیں بڑی فکر لاحق ہوئی کہ کہیں ان کا بیٹا کوئی فرنگن نہ لے آئے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے خاندان کی ایک شاخ باندا (بندیل کھنڈ) میں قیام پذیر تھی اور وہیں آپ کے حقیقی خالہ زاد بھائی شیخ یوسف الزماں ایک خوشحال رئیس اور مجسٹریٹ کے عہدہ پر تھے۔ ان کے بیٹے شیخ مسعود الزماں انٹرمیڈیٹ تک ہم جماعت رہ چکے تھے اور یوں ماجد کا آنا جانا گاہے بگاہے رہتا تھا۔

اتفاق سے شیخ یوسف الزماں کی چھوٹی صاحبزادی عفت النساء اپنی بڑی بہن کی شادی کے کام کاج میں بارش سے بھیگ کر بخار اور شدید درد میں مبتلا ہو گئی، علاج ومعالجہ کی جملہ تدابیر کے باوجود صحت یاب نہ ہوئی، عبدالماجد اس زمانے میں بطور ہپناٹزم کے مشہور ومعروف ہو گئے تھے اور آپ کے ذریعہ سے بہت سے مریض شفایاب ہو چکے تھے۔ چنانچہ شیخ یوسف الزماں اور کچھ عزیزوں کے اصرار پر عبدالماجد نے مریضہ کا

علاج کیا اور مریضہ ان کے عمل سے شفایاب ہوگئی مگر عبدالماجد ان کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ عبدالماجد دریابادیؒ "آپ بیتی"، میں رقمطراز ہیں کہ:

"نوجوان قبول صورت لڑکی کی مسکراہٹ اور پرمسرت آواز میں جادو کا اثر تھا! مریضہ کا چہرہ آناً فاناً معالج کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن گیا! اب وہ مریضہ نہ تھی، اتنی ذرا سی دیر میں، کچھ اور، بن گئی تھی، اور معالج اب خشک معالج نہ رہا، خود علاج طلب مریض سا بن گیا۔ شکار کرنے کو آئے شکار ہو کر چلے"۔

۲۸

شدید انتظار اور کوششوں کے بعد طرفین کے والدین کی رضامندی سے اپنے ہی خاندان کی لڑکی کا انتخاب ہوا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا عقد مسنون ۲/جون ۱۹۱۶ء بروز جمعۃ المبارک لکھنؤ میں عفت النساء سے ہوا، اس تقریب عقد میں ملک کے نامور و ممتاز شعراء، ادباء، روسا اور اصحاب علم و فضل بالخصوص اکبر الہ آبادی، راجہ صاحب محمود آباد، سید سلیمان ندوی، جسٹس کرامت حسین اور مرزا محمد ہادی، عزیز لکھنوی، عبد الحلیم شرر، سید سجاد حسین یلدرم شریک ہوئے۔

تقریب شادی کے موقع پر اکبرالہ آبادی نے (فروغ ماجد) سے مادۂ تاریخ نکالا۔ سید سلیمان ندویؒ اس مبارک موقع پر درج ذیل رباعیاں کہیں جس کا ذکر مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی "آپ بیتی"، میں کیا ہے:

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد — نوشاہ بنے ہیں آج عبدالماجد
وہ روزِ سعید بھی خدا لائے — جلد بن جائیں وہ جب کسی کے والد ماجد
گر وحدتِ حق کا کلمہ گو ہونا ہے — معلوم ہو ہر بشر کو جو ہونا ہے
بندہ ہو خدا کے مثل ناممکن ہے — وہ ایک ہے جب تو ہم کو دو ہونا ہے
منکر ہو نہ کوئی اپنی ہمسائی کا — یہ کام کبھی نہیں دانائی کا
اللہ نے اب غرور ان کا توڑا — دعویٰ تھا مرے دوست کا یکتائی کا

مولانا عبدالماجد کی ازدواجی زندگی بحیثیت مجموعی خوش گوار اور پرسکون گزر رہی تھی۔ عقد ثانی کے مختصر عرصہ میں ان کی زندگی انتشار اور بے چینی کا شکار ہوگئی، جب انہوں نے ایک عزیز مرحوم دوست عبدالرحمٰن

نگرامی کی بیوہ سے ۱۹۳۰ء میں بطور انسانی ہمدردی کے عقد ثانی کرلیا۔ کچھ مدت کے بعد مجبوراً مولانا نے اپنے مرشد مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مرشد تھانویؒ سے مشورہ کرنے کے بعد طلاق دے دی اور مہر بھی ادا کر دیا، دوسری بیوی جب تک حیات رہیں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہے۔ طلاق کو موضوع بنا کر حریفوں نے خوب قلم کارفرمائی دکھائی اور مولانا ماجد کی شخصیت کو داغ دار کرنے کی ناکام کوششیں کی گئیں۔

**اولاد:**

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شادی جون ۱۹۱۶ء میں ہوئی ،شادی کے ایک سال بعد ہی توأم اولادیں ہوگئیں۔ دولڑکوں کی ولادت ہوئی، ایک لڑکا پیدا ہوتے ہی اس دارِفانی سے کوچ کرگیا، دوسرا لڑکا تیرہ ماہ تک زندہ رہا۔ عبدالماجد نے اکبرالہ آبادی سے عقیدت کے نتیجے میں نومولود کا نام اکبر رکھا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے یہاں کئی بیٹے اور بیٹیاں ہوئیں مگر زندہ صرف چار صاحبزادیاں رہیں۔ چاروں کی شادیاں اپنے حقیقی بھتیجوں (بڑے بھائی عبدالمجید مرحوم کے صاحبزادوں) سے کردیں، بڑی بیٹی کا نام رافت النساء (ولادت اگست ۱۹۱۹ء لکھنؤ میں ہوئی ، وفات:۱۹؍دسمبر ۱۹۹۶ء لکھنؤ میں ہوئی) زوجہ حکیم عبدالقوی دریابادیؒ، دوسری بیٹی کا نام حمیرا خاتون (ولادت :مئی ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ میں ہوئی ،وفات:۱۶؍اپریل ۲۰۰۵ء میں ہوئی۔ زوجہ حبیب احمد قدوائیؒ) یہ مولانا دریابادیؒ کی سب سے زیادہ مزاج شناش تھیں مولانا ان کو مشورے اور انتظام وانصرام میں شریک رکھتے تھے۔ ان کے چار لڑکے، دولڑکیاں ہوئیں۔

تیسری بیٹی زہیرا خاتون (ولادت، ۱۹۳۱ء میں دریاباد میں ہوئی) وفات:۱۲؍جنوری ۲۰۰۵ء میں اس دارِفانی سے کوچ کرگئیں زوجہ ڈاکٹر محمد ہاشم صاحب،قدوائی مدظلہ العالی) خوبصورت اور خوب سیرت سب بہنوں پر سبقت رکھتی تھیں،ان کے یہاں دولڑکے، تین لڑکیاں ہوئیں۔ سب سے چھوٹی صاحبزادی زاہدہ خاتون کا عقد (ولادت:۱۹۳۳ء میں دریاباد میں ہوئی وفات:۱۳؍ستمبر ۱۹۹۳ء میں ہوئی) عبدالعلیم قدوائی سے ہوا۔ تعلیم میں سبھی بہنوں پر فوقیت رکھتی تھیں لیکن طبیعت اکثر علیل رہتی تھی۔ دبلی پتلی اور مختلف بیماریوں کی مریضہ تھیں۔ ان کے یہاں بھی دولڑکے اور تین لڑکیوں کی ولادت ہوئی۔ مولانا دریابادیؒ کی چاروں صاحبزادیاں نماز، روزہ، زکوٰۃ کی پابندی، غرباء پروری، نہایت ہی سلیقہ مند تھیں، اور آپ کے نواسے بھی علمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

## حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے مراجعت:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا خاندان شروع ہی سے ایک علمی وروحانی خاندان تھا۔ جس میں علم وفضل کے ساتھ ساتھ بزرگوں کی صحبت اور رواجی تصوف وسلوک کا چرچا رہا ہے۔ کئی پشتوں تک سلسلۂ چشتیہ سے وابستہ رہے۔ پھر قادریت کا اثر غالب آ گیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تشکیک والحاد سے اسلام کی طرف مراجعت میں تصوف کی کتابوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے کچھ عرصہ رواجی تصوف کو اپنایا اور مختلف اور مزارات پر حاضری دی، عرس اور قوالی کی محفلوں میں شرکت اور چلہ کشی شروع کر دی۔ مگر انہیں ایک مرشد معنوی کی تلاش تھی۔ اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے متعدد سفر کئے۔

چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس دور کا ذکر کرتے ہوئے اپنی مشہور کتاب ''حکیم الامت: نقوش و تاثرات میں لکھتے ہیں کہ:

> ''مرشد کی تلاش ایک عرصے سے جاری تھی۔ تصوف وسلوک کا ذخیرہ جتنا کچھ بھی فارسی اور اردو اور ایک حد تک عربی میں ہاتھ لگ سکا تھا پڑھ لیا گیا تھا، اتنی کتابیں پڑھ ڈالنے اور اتنے ملفوظات چاٹ ڈالنے کے بعد اب آرزو اگر تھی تو ایک زندہ بزرگ کی۔ حیدر آباد، دہلی اور لکھنؤ جیسے مرکزی شہر اور اجمیر، کلیر، دیوہ اور بانسہ اور ردولی اور صفی پور چھوٹے بڑے آستانے خدا معلوم کتنے دیکھ ڈالے۔ اور سُن گن جہاں کہیں بھی کسی بزرگ کی پائی حاضری میں دیر نہ لگائی۔ حال والے بھی دیکھنے میں آ گئے اور قال والے بھی۔ اچھے اچھے عابد، زاہد مرتاض بھی اور بعض بڑے دکان دار قسم کے گیسو دراز بھی۔ آخر فیصلہ یہ کیا کہ حق حلقہ دیوبند میں محصور ہے۔ انتخاب کے دائرہ کو محدود کر کے اب تفصیلی جائزہ اسی حلقہ کا لیجئے اور جس نے بہترین متن سلوک (مثنوی معنوی) بہترین شرح لکھ ڈالی (مراد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ہیں) اور اپنے چھوٹے چھوٹے سہل فقروں میں حقائق ومعارف کی روح بھر دی ہے، دامن اسی کے کسی تربیت یافتہ کا تھامئے''۔ [۲۹]

۱۹۲۷ء میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید اور ممتاز ادیب وصل بلگرامی نے مولانا دریابادیؒ کو حضرت تھانویؒ کے مواعظ وخطبات دیئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ان مواعظ وخطبات کا مطالعہ شروع کیا، عبدالماجدؒ کو ان میں حقائق ومعارف اور تصوف کے اسرار ورموز منکشف ہوتے گئے اور حضرت تھانویؒ سے ذہنی وفکری قربت بڑھتی گئی۔ حالانکہ ان سے اعراض وبے توجہی صرف اس وجہ سے تھی

کہ ان کی شہرت ایک ظاہری عالم اورفقیہ کی حیثیت سے تھی اوردوسرے یہ کہ تحریک خلافت کے مخالف تھے۔مولانا دریابادیؒ ان مواعظ حسنہ کے مطالعہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ حضرت تھانویؒ سے مراسلت شروع کردی۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ۳۰؍جون ۱۹۲۸ءکواپنے رفیق سفرمولوی عبدالباری ندویؒ کے ساتھ تھانہ بھون پہنچ گئے۔آپ کے ساتھیوں میں مولانا حسین احمد مدنیؒ اورمولانا عبدالباریؒ بھی تھے۔حضرت تھانویؒ نے طویل نشستوں کے بعد حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کومشورہ دیا کہ وہی ان حضرات کو بیعت کرلیں۔ چنانچہ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے حضرت تھانویؒ کے مواجہے میں مولانا دریابادیؒ مولوی عبدالباریؒ کو بیعت کرلیا۔ بیعت تو مولانا مدنیؒ نے کرلیا رفتہ رفتہ مرکز عقیدت دیو بند کی بجائے تھانہ بھون بنتا چلا گیا۔حضرت تھانویؒ روحانی مرشدومربی اورمحبوب ومقتدابن گئے، گوکہ رشدوہدایت کا اصل مرکز مرشد تھانویؒ ہی رہے۔

حضرت تھانویؒ سے عشق وعقیدت کا اندازہ ان کی مشہور کتاب ''حکیم الامت:نقوش وتاثرات کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے کہ جس میں مولانا دریابادیؒ حضرت تھانویؒ کو''اتے تو افلاطون وجالینوس ما'' سے مخاطب کیا اور''حکیم الامت:نقوش وتاثرات جیسی کتاب منظرعام پرآ گئی۔

## لباس،مخصوص عادات ومعمولات ماجدی:

عبدالماجد دریابادیؒ نے قیام لکھنؤ کے دوران انگریزی لباس پہنا کرتے تھے،۱۹۲۱ءمیں پرتعیش اور پُرتکلف طرزِ معاشرت ترک کرکے کھدر کے کرتے پاجامے رنگین عبا، کپڑے کا گلوبند پہننے لگے،کشتی نما سر پر کھدرکی ٹوپی اور پیر میں چپل،اونچے قد گول اورسفید داڑھی کا ذکر مختلف لوگوں نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

مولانا دریابادیؒ کے لباس کا جاذب نقشہ سرداراحمد علیگ نے کھینچا ہے کہ سرداراحمد رقمطراز ہیں کہ:

> ''کھدّرکا لباس،سُرخ وسپید رنگت،داڑھی سفید گول اورنورانی مجمع میں کھڑے ہونے پرسب میں کچھ نکلتا ہوا قد،آنکھوں پرچشمہ،لباس کے اوپر کھدرکی ایک عبا،اورسر پر کھدرکی اپنے ہی طرز کی ایک ٹوپی جس کی بناوٹ اوردیواروں کی اونچائی،عام ٹوپیوں سے مختلف۔طبیعت ومزاج میں اعتدال اورسکون اورگفتگو کا نرم وچچا تُلا انداز''۔۳۰

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شخصیت کی تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ مخصوص اطوار اورمعمولات کا

ذکر کیا جائے وہ مقرر نہیں تحریر کے آدمی تھے۔ان کے مزاج میں صاف گوئی، کسی قدر اکل کھرا پن، انضباطِ اوقات میں رسوخ اسلامی حمیت و بے باکی، حاضر جوابی سکون پسندی، روشن خیالی اور وسعتِ قلبی، علم وعمل کی خوش امتزاجی پائی جاتی تھی۔مولانا دریابادی ترتیب و تنظیم اور انضباطِ وقت کی اعلیٰ مثال تھے۔اسی وجہ سے فضولیات ولغویات میں اپنا قیمتی وقت کبھی ضائع نہیں کیا۔نظام الاوقات کا یہ عالم تھا کہ عبادت وریاضت، علمی وادبی کاموں کیلئے ایک وقت مقرر کر رکھا تھا۔وقت کی حفاظت ہی کی وجہ ہے کہ انہوں نے مذہب، فلسفہ، اخلاق، تمدن، انگریزی اور اردو میں ترجمہ وتفسیر قرآن، سیرت نبوی، نفسیات، انشاء پردازی وغیرہ پر ۶۰ / سے بھی زائد کتابیں اہم موضوعات پر قیمتی علمی سرمایہ فراہم کیا ہے۔چنانچہ وقت بچانے کے لئے دوپہر کا کھانا تناول نہیں کرتے تھے بلکہ ہلکا ناشتہ کر کے علمی مشاغل میں مصروف ہوجاتے تھے۔عبدالماجد دریابادیؒ کے مزاج میں غصہ اور بے حد شدت تھی لیکن وقت کے ساتھ غصہ پر اعتدال اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فیضِ صحبت اور اصلاحی تعلق سے اس پر قابو پالیا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی ''آپ بیتی'' میں حضرت تھانویؒ کے فیضِ صحبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''خلقۃً میں بڑا غصہ ور تھا اور اس وقت بجائے اس کے کہ کوئی مخلص ملامت یا نصیحت کرتا، الٹی اس کی داد ملتی تھی اور ذکر تحسین سے کیا جاتا، اب بھی غصہ ور ہوں تو اللہ کے فضل سے اور حضرت تھانوی کے فیض صحبت سے اس کی کیفیت وکمیت دونوں میں بہت کمی آ گئی ہے''۔[۳۱]

عبدالماجد دریابادیؒ غیبت اور دنیوی وسماجی معاملات میں منافقانہ قسم کے رکھ رکھاؤ سے اجتناب کرتے تھے، بلکہ ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں وسیع القلبی، رواداری اور حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ اعتدال اور توازن پایا جاتا تھا۔

مصروف ومنظّم زندگی گزارنے کے باوجود سفر کرنے کا بہت شوق تھا، حج بیت اللہ اور پاکستان اور ملک کے مختلف مقامات کے اسفار مختلف ضرورتوں سے کئے، اپنے سفروں کے تجربوں اور روداد مولانا ہفتہ وار اخبارات میں لکھتے اور شائع کرتے تھے جن کی ادبیت مسلّمہ ہے۔

## علالت اور انتقال:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی جسمانی صحت عام طور پر بہتر رہی سوائے آنکھوں کی روشنی بعض بے احتیاطیوں کی وجہ سے کمزور ہوگئی اور تحریر پڑھنا سخت دشوار ہوگیا تھا۔ اپنی ان بے احتیاطیوں کو انہوں نے حماقتوں سے تعبیر کیا ہے، حیدرآباد کے دوران قیام ورم معدہ میں مبتلا ہوئے اور یونانی علاج سے افاقہ ہوا۔ مولانا دریابادیؒ کو قبض کی شکایت جوانی ہی سے پیدا ہوگئی تھی۔ ۴۲/سال کی عمر میں قلبی تکلیف میں مبتلا ہو گئے، اس سے افاقہ کے بعد ورزش اور صبح پیدل ہواخوری شروع کی جس سے مولانا دریابادیؒ کی صحت بہت حد تک درست ہوگئی تھی۔

۱۴/مارچ ۱۹۷۴ء کو عبدالماجد دریابادیؒ پر حملۂ فالج ہوا، ہومیو پیتھک علاج سے مرض میں تخفیف ہوئی مگر اس بیماری سے ان کی صحت جسمانی پر گہرا اثر پڑا، یہاں تک کہ لکھنا پڑھنا بہت کم ہوگیا تھا نیز نسیان بڑھ گیا تھا، پھر بھی مختلف مقامات کے سفر ہوتے رہے، مارچ ۱۹۷۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں لکھنؤ میں ''خاتون منزل'' میں دوران قیام گر جانے کی وجہ سے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس حادثہ کے بعد مولانا دریابادیؒ کی زندگی کمرہ کے ایک چوبی تخت تک محدود ہو کر رہ گئی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ بالخصوص حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ برابر آتے رہتے تھے۔ وفات سے ایک دن قبل دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ عیادت کے لئے تشریف لائے مگر اسوقت مولانا بالکل غافل تھے، غفلت کے باوجود ہاتھ کان تک اٹھا کر پھر نیچے لاکر نماز کی طرح نیت باندھ لیتے۔ جمعرات ۴/جنوری ۱۹۷۷ء کو سوا چار بجے صبح حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

حضرت مولانا دریابادیؒ مرحوم کی وصیت کے مطابق نماز جنازہ ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ نے پڑھائی۔ اس کے بعد جنازہ دریاباد لایا گیا، ان کے آبائی مکان کے ملحق حضرت مخدوم آبکش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب تدفین ہوئی۔ رحمهم الله رحمةً واسعة

''میر غلام رسول نازکی (سری نگر) نے آیت قرآن ورفعنا لک ذکرک سے ہجری

تاریخ ۱۳۹۷ھ نکالی۔اس میں بعض اور حضرات کو بھی توارد ہوا۔مغیث الدین فریدی استاذ:(دہلی یونیورسٹی) نے قطعہ کہا۔

''تاریخِ رحلت بے ہنگام'' سے سال عیسوی (۱۹۷۷ء) نکالا ہے۔

مولانا کے ہم وطن جناب رہبر تابانی دریابادی نے اس شعر سے بڑی رواں تاریخ کہی:

افسوس نہ خاک ہے آرام پذیر
وہ محرم لیلائے سخن نکتہ شناس ۱۹۷۷ء

''مولانا مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں تقریباً بارہ ہزار کتابیں اردو، انگریزی، عربی اور فارسی کی موجود تھیں جس میں بہت سی قیمتی اور نایاب کتابیں بھی تھیں چنانچہ اپنی زندگی ہی میں انہوں نے انگریزی کتابیں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شبلی لائبریری اور اردو فارسی عربی کی کتابیں مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی کو اپنی زندگی ہی میں دے دی تھیں تاکہ وہ محفوظ رہیں اور ان سے تحقیق واستفادہ ہوتا رہے۔ جناب عبدالعلیم قدوائی صاحب نے سچ، صدق اور صدق جدید کی مکمل فائلوں کی فوٹو کاپی کروا کر کے مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی کو بھیج دی ہیں تاکہ اردو صحافت کا یہ قیمتی ورثہ محفوظ رہے۔

جناب عبدالعلیم قدوائی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''مولانا نے دریاباد میں دو مکان چھوڑے ہیں ایک قدیم جدی مکان جہاں ان کی پیدائش ہوئی تھی، مکان بہت شکستہ حالت میں ہے آج کل اس کی تعمیرِ نو کا کام اللہ کے فضل سے چل رہا ہے۔ دوسرا مکان جو ان کے والد مرحوم نے بنوایا تھا اس میں وہ آخر تک وہ مقیم رہے اس میں آج کل ندوۃ العلماء کے زیرِ اہتمام مدرسہ معین الاسلام چل رہا ہے، جہاں دینی وعصری تعلیم کے ساتھ حفظِ قرآن کا خصوصی اہتمام ہے''۔۳۲

فصل سوم:

# مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی علمی وادبی خدمات اور سیاسی زندگی

## ترجمہ نگاری:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تصنیف وتالیف کا دور ثانی ترجمہ نگاری سے ہوتا ہے۔ ترجمہ نگاری ایک مستقل فن ہے جس کے کچھ ضابطے ہوتے ہیں، ان ضابطوں سے وہی شخص بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوسکتا ہے، جو دونوں زبانوں میں قدرت ومہارت تامہ کے ساتھ عام وفہم اور فطری زبان میں ترجمہ کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔

مولانا دریابادیؒ نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز پہلے مضمون نگاری، بعد میں ترجمہ نگاری سے کیا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ کی سیرت النبیؐ کے لئے مختلف انگریزی کتابوں کے اقتباسات وتلخیص کرتے رہے، مولانا دریا بادیؒ کو ترجمہ سے طبعی مناسبت تھی، وہ متعدد زبانوں فارسی عربی، انگریزی اردو زبان کے رمز شناس تھے، اس دور میں ان کے قلم سے مختلف موضوعات کی کتابوں کے تراجم نکلے جو اردو ادب میں نہایت قیمتی مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولانا کے اہم تراجم میں مکالماتِ برکلے، پیامِ امن، ناموران سائنس اور قرآن مجید کا ترجمہ اردو اور انگریزی شمار ہوتا ہے، آپ کے تراجم میں بڑی وسعت اور تنوع ہے۔ انھوں نے بعض کتابوں کا ملخص ترجمہ کیا ہے۔ مثلاً تاریخ اخلاق یورپ، تاریخ تمدن، منطق (استخراجی واستقرائی) مناجاتِ مقبول چہل حدیث وغیرہ اور اصل کتابوں کے مطالب ومفاہیم کو اردو میں نہایت خوش اسلوبی سے منتقل کر دیا ہے۔

مولانا اپنی ''آپ بیتی'' میں ترجمہ نگاری کے طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''میرے ترجمہ کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے پوری کتابیں پڑھ ڈالتا اس کے بعد ایک ایک باب پڑھتا۔ تیسری مرتبہ دو صفحہ تین صفحہ، غرض اتنا پڑھ لیتا جتنا ترجمہ اس دن مقصود ہوتا۔ چوتھی بار ایک ایک

پیرا گراف پڑھتا اس طرح مطلب و معانی پر پورا عبور ہو جاتا اور پھر قلم برداشتہ ترجمہ کر ڈالتا''۔[۳۳]

مولانا کو زبان و بیان پر کمال درک حاصل تھا، ترجمہ نگاری کا کمال یہ مانا جاتا ہے **اصل متن** کی روح صفحہ قرطاس پر منتقل کی گئی ہو۔ اس لئے کہ مترجم **متن** کو سامنے رکھ کر صاحب **متن** کی منشا کو مد نظر رکھتا ہے اور اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ بڑا مشکل ترین عمل ہے۔

عبدالماجد دریابادیؒ کے قلم سے خالص تراجم کی فہرست میں مکالمات برکلے، پیامِ امن، ناموارانِ سائنس اور قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ شامل ہے۔

## مکالماتِ برکلے:

''مکالمات برکلے'' جارج برکلے کی مشہور انگریزی کتاب ''مکالمات مابین ہائلس وفلونیس''

Tree Dialogues Between Hylas and Philonous In

Opposition To Skepties and Atheists

کا اردو ترجمہ ہے۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ (''مکالمات برکلے'' کے نام سے) دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ترجمہ کے طرزِ اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ترجمہ مکالمات میں حتی الامکان لفظی پابندی ملحوظ رکھی گئی ہے لیکن نہ اس حد تک کہ کتاب چیستان ہو جائے، کتاب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اسے پڑھیں، اگر وہ پڑھنے والوں کی سمجھ سے بالاتر ہوئی تو اس کا عدم و وجود یکساں ہے، البتہ پڑھنے والوں سے سنجیدہ ناظرین کی جماعت مراد ہے، فلسفہ کتنی ہی سلیس زبان میں بیان کیا جائے پھر بھی فلسفہ ہی ہے، برکلے کا طرز ادا نہایت ہی سلیس وقریب الفہم ہے، تاہم وہ فلسفہ کو ناول نہیں بنا سکتا تھا۔ بعض مقامات پر جہاں توضیحی الفاظ یا فقروں کا اضافہ ضروری معلوم ہوا، ان کو خطوط وحدانی (بریکٹ) میں رکھ کر ان پر ''م'' کا نشان بنا دیا ہے کہ وہ منجانب مترجم ہیں، جا بجا مبادی کے حوالے بھی اس کے اردو ایڈیشن کے مطابق اضافہ کر دیئے ہیں''۔[۳۴]

عبدالماجد دریابادیؒ کی دوسری ترجمہ کردہ کتاب ''پیام امن'' ہے جو موسیو پال رچرڈ کی انگریزی کتاب To The Nation کا اردو ترجمہ ہے۔

مولانا ماجد نے کتاب کے موضوع کی اہمیت وافادیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کا اردو ترجمہ ''پیام

امن'' کے نام سے کیا۔

مولانا'' آپ بیتی'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک فرنچ فلسفی پال رچرڈ کی انگریزی To The Nation نظر سے گزری، عین جنگ کے خاتمہ پر مستقل پیام امن کی دعوت لے کر شائع ہوئی۔ میں نے اسے اردو میں شروع ۱۹۲۰ء ہی میں اپنالی اور پیام امن کا نام دے کر پھر اس کے مقدمہ اور مفصل تبصرہ وغیرہ کا اضافہ کر کے اسے بجائے ترجمہ کے تالیف سے قریب تر کردیا۔ طبع واشاعت کی نوبت تین ساڑھے تین سال بعد، کہیں اخیر ۱۹۲۳ء میں آئی''۔ ۳۵

## ناموران سائنس:

عبدالماجد دریابادیؒ کی تیسری ترجمہ کردہ کتاب ''ناموران سائنس'' ہے یہ کتاب بھی تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکی۔ لیکن ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب اس کتاب کی اہمیت ومعنویت اور زبان وبیان کے متعلق بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔

## انگریزی ترجمۂ قرآن وتفسیر:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے تصنیفات وتالیفات کا جو اثاثہ چھوڑا ہے، ان میں قرآن مجید کے اردو اور انگریزی تراجم موسوم بہ تفسیر القرآن کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا دریابادیؒ انگریزی زبان پر کامل دسترس، عربی زبان کی باریکیوں، فلسفے اور اپنے عہد کی علمی اور ذہنی تحریکوں سے کماحقہٗ واقف تھے۔ مولانا دریابادیؒ مستشرقین کی تصانیف اور اپنے مخاطبین کی ذہنی سطح سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا ان کا انگریز ترجمۂ قرآن اپنے حکیمانہ حواشی کی مدد سے مغربی تعلیم یافتہ طبقے کے لئے تریاق ثابت ہوا۔ مولانا دریابادیؒ تفسیر ماجدی کے نام سے اردو میں بھی تحریر کی ہے لیکن انگریزی ترجمۂ قرآن وتفسیر اور تفسیر ماجدی ایک دوسرے کا چربہ نہیں ہیں بلکہ الگ الگ دو مستقل تصانیف ہیں۔ انگریزی تفسیر کے اصل مخاطب مغربی تعلیم یافتہ طبقہ اور مغربی تہذیب وتمدن سے متاثر مسلمان ہیں۔

عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنا انگریزی ترجمۂ قرآن ۱۹۴۱ء ہی میں مکمل کرلیا تھا لیکن موصوف کی عزلت نشینی کے باعث یہ ترجمۂ قرآن مع تفسیری نوٹس ۱۹۵۷ء میں تاج کمپنی، کراچی پاکستان سے شائع ہوا۔

مولانا دریابادیؒ کے انتقال کے بعد اس وقیع تصنیف کی اشاعت عمل میں آئی۔ ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۵ء کے درمیان ندوۃ العلماء لکھنؤ کے علمی اور تفسیر کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ۴ جلدوں

Tafsirul Quran Translation and Commentary of Holy Quran

کے عنوان سے شائع ہوا۔

مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے ایماء واشارہ پر انگلستان کے مشہور ناشر اسلامک فاؤنڈیشن نے ۲۰۰۱ء میں اس ترجمۂ قرآن وتفسیر کا ایک جلد میں ملخص ایڈیشن شائع کیا۔ بفضلہٖ تعالیٰ اس ملخص ایڈیشن کا نومسلم حضرات اور مغربی تعلیم یافتہ طبقہ میں بڑی پذیرائی ہوئی۔

۲۰۰۶ء میں اسی ملخّص ایڈیشن کا چربہ صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے شائع کیا تاکہ برصغیر کے قارئین بھی بہ آسانی اس سے استفادہ کرسکیں۔

عبدالماجد دریابادیؒ کے ملخص ترجموں میں ''تاریخ اخلاق یورپ''، و''تاریخ تمدن''، منطق اشخر اجی واستقرائی'' شامل ہیں۔

## تاریخ اخلاقِ یورپ:

انگلستان کے مشہور فاضل مصنف ایڈورڈ یول لیکی، کی انگریزی تصنیف History of Europian morals کا عام فہم سلیس وشگفتہ ملخص ترجمہ'' تاریک اخلاقِ یورپ'' کے نام سے عبدالماجد دریابادیؒ نے دوجلدوں میں کیا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ''تاریخ اخلاقِ یورپ'' کے دیباچے میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''ترجمہ کو صحیح معنوں میں ترجمہ کہنا درست نہیں اس لئے کہ اس میں مصنف کے الفاظ کی پابندی ایک مقام پر بھی نہیں کی گئی، صرف اس کے مفہوم کوشش نظر رکھ کر اس کے اصل خیال کو اردو میں ادا کر دیا گیا''۔ ۳۶

اس کتاب میں یورپ کے قدیم ترین اخلاقی، معاشرتی، تہذیبی اور تاریخی احوال پر بحث کی گئی ہے۔ آخر میں یونانی مسیحیوں کے اخلاقی حالات اور ان کے اثرات ونتائج کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق اور ان کی حیثیت کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے۔

## تاریخ تمدن:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے ملخص تراجم میں تاریخ تمدن ہے ۔تاریخ تمدن مسٹر ہنری ٹامس کی انگریزی کتاب History of Civilization England کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ منشی احمد علی مرحوم نے پہلے حصہ کا ترجمہ کیا تھا جو تاریخ تمدن ( جلد اول ) اور تاریخ تمدن ( حصہ دوم ) سے پہلے چھ ابواب پر مشتمل ہے۔اس کتاب کی ترجمہ نگاری میں انہوں نے مصنف کے افکار و خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمانی کی ہے۔

## منطق استخراجی واستقرائی:

پروفیسر پی۔ کے رے کی "Text Book of Dedvltive Logic" ایک مشہور ومعروف کتاب ہے جس کا ترجمہ مولانا دریابادیؒ نے منطق استخراجی واستقرائی کے نام سے کیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''عثمانیہ یونیورسٹی نئی نئی قائم ہورہی تھی اور اس کا پیش خیمہ سرشتہ تالیف وترجمہ وجود میں آچکا تھا، یہ اگست ۱۹۱۷ء تھا، میں اسی سرشتہ میں بحیثیت مترجم وفلسفہ بلایا گیا تھا، مشاہرہ تین سو روپے ماہوار سے شروع ہوا، ۱۹۱۷ء کے تین سو ۱۹۶۷ء کے دو ہزار سے اوپر ہوئے، میں نے اپنے فن میں خالص ترجمہ نہیں کیا، بلکہ ایک دو انگریزی کتابوں کو اپنا کر ایک مستقل کتاب'' منطق استخراجی واستقرائی'' تیار کردی''۔[۳۷]

اس لئے کہ:

(۱) اس میں لفظی ترجمہ کی پابندی ایک مقام پر بھی نہیں کی گئی ہے بلکہ مصنف کے مطالب کو اردو میں ادا کردیا گیا ہے۔

(۲) بعض مثالیں نئی اضافہ کردی گئیں ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس کتاب کے دیباچہ میں مولانا نذیر احمد کے رسالہ ''مبادی الحکمہ'' کا توصیفی ذکر کیا ہے اور منطق وفلسفہ کے طلباء کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی ہے جس کا مطالعہ طلباء کے لئے بے حد مفید ہے۔

## ڈرامہ نگاری:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے مختلف اصناف ادب پر اپنے قلم کی جولانی کو بکھیرا، اور جس صنفِ ادب پر بھی قلم اٹھایا اپنی انفرادیت کو ضرور برقرار رکھا۔

چنانچہ بیسویں صدی کے اوائل ہی میں جب تھیٹر اور نوٹنکی وغیرہ کا دور شروع ہوا تو عبدالماجد بھی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، زمانۂ طالب علمی ہی میں ڈراموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا، ماجد اس وقت آٹھویں کلاس میں تھے تو ان کے اسکول میں ایک ڈرامائی اسٹیج سجایا گیا، جس میں ماجد نے ڈاکوؤں کے سردار کا اہم رول ادا کیا، بالآخر یہ تخلیقی ادب کا سلسلہ چلتا رہا، مئی ۱۹۱۵ء میں مولانا دریابادیؒ نے ریل سے ممبئی سفر کے دوران ڈرامہ ''زودِ پشیماں'' شروع کیا اور سفر ہی میں مکمل کر ڈالا۔ یہی ڈرامہ مولانا دریابادیؒ نے بطور یادگار چھوڑا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی تحقیق کے مطابق ڈرامہ ''زودِ پشیماں'' ماہنامہ ''الناظر'' جون ۱۹۱۶ء میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ، عبدالحلیم شررؔ، مرزا محمد ہادی رُسواؔ اور سید سجاد حیدر یلدرمؔ نے اس پر دیباچے تحریر کئے ہیں، یہ ڈرامہ اہلِ علم کے مابین کم یاب اور معدوم ہے نیز اہل علم نے اس کو داد و تحسین سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی ''زودِ پشیماں'' کے متن سے استفادہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''اس میں بعض حقائق تو ایسے ہیں جو خود ماجد کی آپ بیتی معلوم ہوتے ہیں، ڈرامے کا یوسف خود ماجد کی شخصیت کا مثنیٰ لگتا ہے اور حسنیٰ ان کی بیگم (عفت النساء) کی ہم زاد، یوسف کی علمی دلچسپیوں کی جو تفصیل ان اوراق میں جھلکتے ہیں، یہ خود ماجد کی اپنی شخصیت کے جوہر تھے، پھر حسنیٰ کو ایک بے حد امیر گھرانے کی لڑکی بتایا گیا ہے، اور یہی حال ماجد کی سسرال کا تھا۔ جس طرح یوسف، حسنیٰ کی محبت میں گرفتار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اور اس کے معاشرتی تفاوت کی وجہ سے تذبذب اور کشمکش کا شکار نظر آتا ہے یہی کیفیت شادی سے پہلے ماجد کی تھی''۔ ۳۸

اس کے بعد ڈاکٹر تحسین فراقی نے ڈرامہ کے خصائص وکوائف کو مولانا دریابادیؒ کی شخصیت میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے، اور یوسف کو ماجد کا ہمراز قرار دیا ہے، مزید برآں عبدالماجد کے ''زودِ پشیماں'' سے خوش نہ ہونے کی وجہ محبت کے مطوّل اور مفصل احوال کے کھل کر سامنے آجانے کا اندیشہ ظاہر کیا ہے۔ ڈاکٹر فراقی کی

اس بات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے کیونکہ مولانا دریابادیؒ نے اپنی ۸۵ر سالہ زندگی کی روداد جس سچائی اور حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہ طور عبرت کے اپنی بیتی میں جمع کی ہے اس کی مثال خودنوشت سوانح نگاری میں کم ہی مل سکے گی، بلکہ تحسین فراقی خود اس بات کے معترف ہیں۔فراقی صاحب ڈاکٹر فضل اقبال کے ایک انگریزی مضمون "A Fascinating Maulana" میں اس فرضی واقعہ کی تردید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''..................پھر جہاں ماجد اپنی خودنوشت سوانح میں اپنے عقد ثانی کا ذکر تفصیل سے کر چکے ہیں اور زندگی کے بہت سے نشیب وفراز بغیر خوف لومۃ لائم پیش کر چکے ہوں وہاں یہ واقعہ پیش کرنے سے احتراز کرتے''۔۳۹؎

فراقی صاحب نے عشرت رحمانی کی کتاب ''اردو ڈراما کا ارتقاء'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے، اس اقتباس کے اس جملے ''مولانا نے اصلاحی انداز میں معاشرتی ڈراما ''زودِ پشیماں'' لکھا جس میں کم سنی کے شادی کے نقائص بڑی خوبی سے تحریر کئے ہیں''۔اس سے قدرے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ ڈراما تو اصل میں شدید مادہ پرستی کے مہلک نتائج کا آئینہ ہے اور اسی شدید زر پرستی ہوسِ جائیداد نے اس ڈرامے کو بالآخر ''المیہ کا رنگ دیا ہے''۔۴۰؎

اس کے علاوہ مولانا موصوفؒ نے ایک ڈرامہ ''بدسرشت'' کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا لیکن یہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا، بہرحال مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے اس ''ڈرامہ'' کے تذکرہ سے خوش نہ ہونے کی وجہ ماہیئت قلب کے ساتھ ساتھ بعض روحانی افراد کے فیضِ صحبت کا بھی دخل رہا ہے، اس کے بعد مولانا دریابادیؒ نے ڈرامہ نگاری کو نہ کوئی وقعت دی اور نہ بنظرِ تحسین دیکھا بلکہ اس کو اپنے لئے باعثِ ننگ وعار سمجھنے لگے تھے۔

ایک موقع پر ڈاکٹر محمد حسن صاحب (سابق استاذ جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی) نے مولانا دریابادیؒ سے ڈرامہ ''زودِ پشیماں'' کو اسٹیج کرنے کی اجازت طلب کی تو مولانا دریابادیؒ نے نہایت حیرت وتعجب کا اظہار کرتے ہوئے ۱۴ر مئی ۱۹۵۶ء کو انہیں ایک خط لکھا اور اس تعلق سے ندامت وشرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

’’آپ کا خط پا کر آپ کی ستم ظریفی کا قائل ہوگیا،تھیٹر کو فروغ دینے کی کوشش میں ترغیب وتحسین کی توقع مجھ دقیانوسی ملا مدیرِ صدق سے!

عشق ومزدوری عشرت کہ خسرو کیا خوب!

زورِ پشیماں بالکل نوعمری کی تصنیف ہے اوروہ بھی بڑی حد تک قلم برداشتہ،شیکسپیئر کا نشہ اس وقت سوار تھا اور دو چار کتابیں فن پر الٹی سیدھی پڑھ ڈالی تھیں۔اب اگر کتاب پر نظر ثانی کروں تو پچاس فیصدی بدل ڈالوں،ایسی کتاب کو آپ یاد ہی کیوں دلاتے ہیں جس کے ذکر سے ہی شرمندہ ہوا جاتا ہوں‘‘۔[۴۱]

## شاعری یا تک بندی:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ایک ایسی ہمہ جہت وعبقری شخصیت کا نام ہے کہ جب ان کا ذکر کیا جارہا ہوتو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک شخصیت کا ذکر نہیں ہورہا بلکہ کئی شخصیت کے متعلق بات ہورہی ہے۔انہوں نے اپنی عمرعزیز کے قیمتی اوقات میں سے صرف چند ہی سال شعروشاعری پر صرف کئے ہیں،اسی وجہ سے ان کا شعری اثاثہ بہت ہی مختصر ہے مگر پھر بھی اس کاوش سے کلیۃً نظر انداز نہیں کیا جاسکتا،آپ کے اشعار میں وہ تمام فنی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جو اچھے اشعار میں ہوا کرتی ہیں،خواہ ان کا تعلق شعری حسن سے ہو،یا جذبات قلبی وسادگی اور شگفتگی سے،عین فطرت بشری کے مطابق مولانا دریابادیؒ کو بچپن ہی سے شعروشاعری کا شوق و ذوق تھا،گھریلو تعلیم کے لئے جو استاذ مقرر تھے انہیں کے زانوئے تلمذ میں رہ کر اشعار پڑھنا سیکھے،چنانچہ وہ نظمیں لکھ دیا کرتے تھے اور عبدالماجد ان کی قائم کردہ نشست میں خوب کڑک کر پڑھ دیا کرتے تھے۔

مولانا دریابادیؒ اپنی ’’آپ بیتی‘‘ میں شعرگوئی کے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

> ’’شاعری کہئے یا تک بندی اس کا تھوڑا بہت خبط بچپن ہی سے سر میں سمایا ہوا تھا،ٹوٹے پھوٹے شعر جو اِدھر اُدھر کہیں سُن پاتا،یا کہیں پڑھ لیتا،بس اکثر ہی یاد ہوجاتے اور انہیں موقع بے موقع پڑھ کر سنا دیا کرتا! نو دَس سال کا سن ہوگا کہ گھریلو تعلیم کے لئے جو مولوی صاحب رہتے تھے،انہوں نے ایک ننھے منے سے مشاعرہ کی طرح ڈالی،ایک چپراسی کو پکڑ کر وحشت بنا دیا،دوسرے سپاہی کو تخلص دہشت عنایت کیا،اور کچھ تخلص میرا بھی رکھ دیا،خود ہی الٹی سیدھی نظمیں ہم سب کی طرف سے کہہ دیتے،اوراُن تک بندیوں میں جو سب سے بہتر ہوتی وہ مجھ سے پڑھوا دیتے،میں خوب کڑک کر اسے پڑھ دیتا‘‘۔[۴۲]

آگے چل کر مولانا دریابادیؒ تفصیل سے وضاحت کرتے ہیں کہ دیوان حالی کا موقع ملا،کلامِ حالی اور دیگر

اخبار ورسائل میں چھپنے والی شاعری سے مناسبت اسی زمانے کی دین ہے، لیکن طبعی طور پر مولانا دریابادیؒ کا رجحان شعروشاعری کے بجائے شعری تنقید کی طرف بڑھ گیا، اور کچھ معنی تنقید سمجھ میں آنے لگے۔ خود لکھتے ہیں کہ:

''یاد ہے کہ جس مضمون میں کسی شاعر کے کلام پر اعتراض ہوتا، وہ پڑھ کر بڑا خوش ہوتا''۔ [۴۳]

پھر جب مولانا دریابادیؒ نے کالج میں پڑھنے کے لئے لکھنؤ کا سفر کیا، تو قدرۃً یہ رنگ اور گہرا ہو گیا، اب ان کو شعری مناظروں ''معرکۂ چکبست وشرر'' وغیرہ سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی، کالج ہی کے زمانہ میں کسی صاحب سے کچھ نوک جھونک ہوگئی، تو انہوں نے ان کی ہجو میں ایک مکمل نظم کہہ ڈالی، اگر چہ یہ نظم بے تکی اور بے وزنی ہی سہی۔

۱۹۱۴ء میں عبدالماجدؒ نے باضابطہ چند شعراء کے زیرِ اصلاح غزل گوئی شروع کردی، اکبرالٰہ آبادی سے مانوسیت مولانا دریابادیؒ کو اگر چہ پہلے ہی سے تھی لیکن ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد یہ عقیدت و نیازمندی اور بھی گہری ہوگئی، یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ شاعری کا بغیر عشق حقیقی ومجازی کے تصور نہیں ہوسکتا۔ ۱۹۱۴ء میں جب عبدالماجد کو اپنی ایک عزیزہ سے عشق ہو گیا تو ان کے اندر بھی عشق ومحبت کے شاعرانہ جذبات پیدا ہونے لگے۔ اس طرح جذبۂ عشق ومحبت میں غزلوں پر غزلیں کہہ ڈالیں۔ اردو شعراء میں ماجد اگر چہ معتقد غالبؔ کے رہے لیکن حوصلہ وہمت ان کے رنگ میں کہنے کا کبھی نہ ہوا۔

مولانا ماجد نے غزل گوئی میں جن شعراء کی تقلید کی ہے ان میں مومنؔ، حسرتؔ شیفتہ، داغ، اور ریاض خیرآبادی وغیرہ کا ذکر نمایاں طور پر ملتا ہے، عبدالماجد دریابادیؒ اکثر و بیشتر اپنے اشعار بغرضِ اصلاح حضرت اکبرآبادی کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ حضرت اکبرالٰہ آبادی توصیفی کلمات لکھ کر دریابادیؒ کی خوب حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ مولانا دریابادیؒ نے اپنی پہلی غزل اکبرؔ کی خدمت میں بھیجی تھی۔ جس پر انہوں نے نہایت خوشی اور تعجب کا اظہار کیا، جس کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

رہی ہر چند عقل صبر آموز
نہ گئیں بے قراریاں نہ گئیں

اس شعر کی خوب داد وتحسین دیتے ہوئے حضرت اکبرالٰہ آبادی نے لکھا تھا کہ:

''آپ کی غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا، یہ شعر ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ رہی ہر چند...... کیا

خوب کہا ہے، آپ انشاء اللہ بڑی باطنی ترقیاں حاصل کریں گے‘‘۔[۴۴]

عبدالماجد دریابادیؒ نے ایک دوسری غزل حضرت اکبرالہ آبادی کی خدمت میں بھیجی تھی، حضرت اکبرالہ آبادی نے اس غزل کے ہر ہر شعر کی اصلاح اور تعریف وتوصیف کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے مقام ومرتبہ کا تعین کیا ہے۔

اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جانبازیوں کو خبط سے تعبیر کر چلے
تم یہ تو خوب عشق کی توقیر کر چلے

غالب زبان شوق پہ آیا نہ رعب حسن
لوہم تمہارے آگے بھی تقریر کر چلے

مجھ کو تو خیر غیر سے تھیں بدگمانیاں
یہ کیا ہوا کہ آپ بھی شرما کے رہ گئے

ترکیب سیرت بشری کچھ عجیب ہے
یعنی وفا بھی اس بُتِ پشیماں شکن میں ہے

اس قدر محویت معاذ اللہ
ان کے آنے کی بھی خبر نہیں ہوئی

اور بالخصوص اس شعر کو سراہا ہے ؎

حیراں ہوں ان کے حسن میں کیا ایسا سحر تھا
میرے بھی دل کو جس سے وہ تسخیر کر چلے

۱۵ر فروری ۱۹۹۵ء کے خط میں حضرت اکبرالہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

’’آپ کی غزل دیکھ کر تعجب کم ہوا، اور زیادہ خوشی ہوئی، تعجب اس بات کا کہ ابتدا ہی میں ایسے کھرے شعر آپ کہنے لگے تعجب میں کمی اس لئے کہ اچھی فطری سمجھ اور علم نے آپ کی طبیعت کو معنی کا عمدہ سانچا بنا دیا ہے، نقص وزیادت کو دخل نہیں، خوشی اس بات کی کہ ان خیالات کو میں نے پسند کیا طریقۂ اظہار بھی خوب ہے، شاعری، پالیٹکس، اخلاق، علمی فلسفہ سب کی جھلک ہے رکاکت سے خالی۔
اہل وفا بھی الخ خوب ہے، نہایت صحیح وبامعنی ہے، غالب زباں شوق۔الخ

بہت ہی بلیغ ہے، یہ کیا ہوا، الخ اس میں بھی معلوم سے نا معلوم کیا لطیف صعود...... حیراں ہوں، الخ وجد آفریں شعر ہے۔ "میرے دل کو بھی" اس "بھی" میں کیا بلاغت ہے۔ ماشاء اللہ چشم بدور، الغرض سب شعر کم وبیش اچھے ہیں اب رہی زبان وطرز بیان۔ اس میں کوئی نقص نہیں۔ البتہ افزائشِ حسن کی گنجائش ہے طبیعت کا نشو ونما خود اس کو پیدا کرے گا"۔ ۴۵

عبدالماجد دریابادیؒ کی طبیعت میں غزل گوئی کا ذوق بدرجہ اُتم موجود تھا، لیکن ان کی یہ رفتار نہایت سست رہی، جب کہ لسان العصر اکبرالہ آبادی کی یہ دلی خواہش تھی کہ آپ شعر وشاعری کا سلسلہ جاری رکھیں، اور ایک باکمال شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوں۔ اکبرالہ آبادیؒ کے متعدد خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ آپ عبدالماجد کو بار بار شعر گوئی کی طرف متوجہ کرتے رہے ہیں، ۱۸؍ستمبر ۱۹۱۵ء کے خط میں آپ نے عبدالماجد کی شاعری اور شعر وسخن کا حال دریافت کیا ہے۔ ۹؍فروری ۱۹۱۶ء کے خط میں دو چار شعر ضرور کہنے کی ترغیب دی ہے۔ لہٰذا مولانا دریابادیؒ نے حکم کی تعمیل میں اپنی کچھ جدید وقدیم غزلیں اکبرالہ آبادی کی خدمت میں بغرضِ اصلاح بھیج دیں۔

۳۰؍نومبر ۱۹۱۶ء کو ان غزلوں کی اصلاح کے تعلق سے اکبرالہ آبادی نے لکھ بھیجا کہ:

"ان غزلوں میں وسعتِ خیال زیادہ ہے، لیکن بہ لحاظ قواعد زبان سابق کی غزلیں زیادہ کھری تھیں، اس کا سبب زبانی کہوں گا، اگر زندہ رہا، جہاں آپ کو بجا شبہ ہے نہ صرف وہاں بلکہ اور مصرعوں میں بھی تغیر وتبدل کی ضرورت ہے، انشاء اللہ دو چار دن میں واپس بھیج دوں گا"۔ ۴۶

عبدالماجد دریابادیؒ کی شاعری کا دورِ ثانی از ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۴ء کے مختصر عرصہ کو محیط ہے۔

اب اس شاعری کا اصل جذبہ ومحرک عشق مجازی نہیں بلکہ عشق حقیقی اور لذت آشنائی ہے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی محبت وعقیدت میں ڈوب کر دل کی گہرائیوں سے نعتیہ غزلیں کہہ ڈالیں۔

مولانا دریابادیؒ کو مولانا محمد علی جوہرؒ سے بے پناہ محبت وعقیدت تھی، اور نعتِ نبیؐ کا یہ تمام تر رنگ مولانا محمد علی جوہرؒ کے نعتیہ اشعار پڑھ کر مولانا دریابادیؒ پر بھڑک اٹھا۔

پہلی نعتیہ غزل جوہؔر ہی کی زمیں میں تھی، مولانا محمد علی جوہر کا مطالعہ ملاحظہ ہو ؎

تنہائی کے سب دن میں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق وفاجر میں اور ایسی کراماتیں

(محمد علی جوہرؔ)

مولانا دریابادیؒ نے بھی اسی زمین پر غزل کہی تھی، آپ کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

پڑھ صلّ علیٰ حق کے محبوب کی ہوں باتیں
رحمت کی گھٹائیں ہوں اور نور کی برساتیں
محشر میں اماں پائی صدقے میں درودوں
دشواری میں کام آئیں بھیجی ہوئی سوغاتیں
غم خواری امت سے اک آن نہیں غافل
ظاہر میں تو ہے پردہ، پردے میں ملاقاتیں

(عبدالماجد ناظرؔ)

مولانا دریابادیؒ کی ایک نعتیہ غزل بہت مقبول و مشہور ہوئی، مدارس کے جلسوں اور محفلوں میں خوب گائی گئی، بالخصوص عرسوں میں قوالوں نے اپنی قوّالیوں میں خوب گایا، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پڑھتا ہوا محشر میں جب صَلِّ علیٰ آیا
رحمت کی گھٹا اٹھی، اور ابر کرم چھایا
چرچے ہیں فرشتوں میں، اور رشک ہے زاہد کو
اس شان سے جنت میں شیدائے نبی آیا
عزت کی طلب چھوڑی، حکمت کا سبق چھوڑا
دنیا سے نظر پھیری، سب کھو کے تجھے پایا
اک عمر کی گمراہی، اک عمر کی سرتابی
جز تیری غلامی کے آخر نہ مفر پایا

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مولانا دریابادیؒ نے اپنے جذبات و احساسات واردات قلبی کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیئے ہیں، آپ کی شاعری کی نمایاں خصوصیت مضمون آفرینی ہے، اور خیال بلندی ہے اور یہی خصوصیت آپ کی ادبی زندگی اور آپ کے طرزِ فکر کے مطالعہ میں معین و مددگار ثابت ہوتی ہے۔

## مولانا دریابادیؒ بحیثیت محقق وتنقید نگار:

لفظ ''تحقیق'' کے لغوی معنی کسی چیز کی حقیقت جاننا، تلاش کرنا، چھان بین کرنا، تحقیق کے لئے انگریزی زبان میں استعمال ہونے والا لفظ ''ریسرچ'' ہے، اس کے ایک معروف ومشہور معنی دوبارہ تلاش کرنے کے ہیں۔ جبکہ دوسرے معنی توجہ سے تلاش کرنے کے ہیں، نامعلوم کو معلوم کرنا، موجود ومعلوم کی تصدیق وتردید، تدوین وترتیب، تعبیر وتشریح، یہ سب تحقیق ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔

محقق اپنی تحقیق وطرزِ مطالعہ کے توسّط سے موجودہ مواد کے صحیح یا غلط ہونے کو بعض مسلّمات کی روشنی میں پرکھتا ہے، اور ناقد کسی موجودہ مواد کی خوبی، خرابی، فائدے، نقصان کی جانچ پڑتال کر کے فیصلہ دیتا ہے۔

تنقیدی ادب میں یہ مستقل بحث ملتی ہے کہ تحقیق وتنقید دو الگ الگ پہلو ہیں۔ یا ایک دوسرے سے مختلف الگ الگ چیزیں ہیں۔ بعض اہل علم کے نزدیک یہ دونوں مخالف اشیاء ہیں، ان کا آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، لیکن کچھ کی رائے اس کے برعکس ہے، یہ صحیح ہے کہ ایک خاص حد تک دونوں کا دائرے عمل الگ الگ ہے لیکن کچھ امور میں دونوں ہم قدم اور ہم رِکاب ہیں، دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ ادبیات میں تحقیق اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک تنقید کا سہارا نہ لیا جائے، لہٰذا محقق میں تنقیدی شعور کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

### فیہ مافیہ:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے تحقیق وتدوین کے میدان میں بہت زیادہ کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکے، لیکن پھر بھی جو کارنامے اس سلسلہ میں چھوڑے ہیں ان کی اہمیت وافادیت مسلم الثبوت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، تحقیق وتدوین کے باب میں مولانا دریابادیؒ کا جو سب سے پہلا کارنامہ ہے وہ مولانا جلال الدین رومیؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ''فیہ مافیہ'' کی ترتیب وتدوین ہے۔ آپ نے اس نسخہ کو ترتیب وتدوین کے بعد بہت اہتمام سے شائع کیا۔

مولانا دریابادیؒ کو یہ نسخہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۰ء میں ریاست رام پور کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا، اس کے بعد ۱۹۲۳ء کے آغاز میں حیدرآباد تشریف لے گئے، تو دو مزید مخطوطے اور مل گئے۔

مولانا دریابادیؒ اپنی ''آپ بیتی'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''............رام پور جانا ہوا اور پہلے وہاں کے اعلا سرکاری کتب خانہ میں الٹ پلٹ میں نظر مولانائے رومی کی ''فیہ مافیہ'' پر نظر پڑ گئی، اور وہاں سے اس کی نقل منگانے کا انتظام کر آیا، پھر کچھ روز بعد حیدرآباد جانا ہوا، اور وہاں بھی نواب سالار جنگ کے نادر کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ مل گیا، اور یہ بھی اللہ کا مزید کرم کہ ایک تیسرا نسخہ حیدرآباد کے سرکاری کتب خانہ میں نکل آیا، یہ تین تین نسخوں کا ہاتھ آ جانا بغیر کسی تلاش و جستجو و تفحص کے، محض اللہ کی دین نہیں تو اور کیا کہا جائے''۔[۴۷]

اسی اثنا میں مولانا دریابادیؒ اور کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور استاد عربی پروفیسر آر۔اے نکلسن کے درمیان مراسلت شروع ہو چکی تھی، مولانا نے انہیں خط لکھا، انہوں نے ایک نسخہ قسطنطنیہ سے خوشخط اور صحیح نقل مولانا کو ارسال کر دیا، جس پر مولانا دریابادیؒ نے پروفیسر نکلسن کا نہایت شکریہ ادا کیا۔

مولانا دریابادیؒ نے اس نسخہ اور تینوں ہندوستانی نسخوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے ''فیہ و مافیہ'' کی تصحیح و تدوین کا کام شروع کر دیا، اس میں تمام آیات قرآنی، اور احادیث نبویؐ کی تخریج و تصحیح میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے سید سلیمان ندویؒ اور عبدالرزاق ملیح آبادیؒ سے معاونت لی، جن کی معاونت سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکا، اگرچہ مولانا دریابادیؒ کی یہ تحقیق جدید اصول و ضوابط پر مکمل طریقے سے کھری نہیں اترتی، لیکن پھر بھی اس کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

مولانا دریابادیؒ اپنے مدوّن کردہ نسخہ کی ترتیب و تہذیب میں عدم مہارت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مگر یہ نقلیں جو ہو کر آئیں، خود ہی بہت غلط تھیں، ان غلط در غلط نسخوں کا مقابلہ اور پھر تصحیح! کام کی دشواریاں بہت بڑھ گئیں، پھر اپنی ایک تو فارس میں استعداد واجبی سی، اور اس سے بڑھ کر ترتیب و تہذیب (ایڈیٹ کرنے کا کام میں عدم مہارت، نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب بالکل چوپٹ ہو کر نکلی، اور کتاب میں غلطیاں لاتعداد رہ گئیں، سالہا سال بعد جب ایران کے وزیر تعلیم ڈاکٹر بدیع الزماں فروزاں فر نے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ذریعوں کو کام میں لا کر اعلیٰ نفیس ایڈیشن شائع کیا، تو اپنی نااہلی اور اپنے کام کی انتہائی پستی کا مشاہدہ برائی العین ہو گیا''۔[۴۸]

ظاہر ہے کہ مولانا دریابادیؒ نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ میرے پاس ایسے ترقی یافتہ وسائل نہیں تھے جس طرح ڈاکٹر بدیع الزماں فروز انفر کو مہیا تھے، ان تمام وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ڈاکٹر

بدیع الزماں نے تقریباً ۶؍قلمی اور دو مطبوعہ نسخوں کی مدد سے اعلیٰ نفیس ایڈیشن تیار کر کے شائع کیا۔

۱۹۹۶ء میں ایک اور اردو نسخہ منظر عام پر آیا جس کی اساس بھی مولانا دریابادیؒ کے مدوّن کردہ نسخہ پر رکھی گئی، مزید اس کے بعد ناشر رومی پبلشنگ ہاؤس کراچی نے بدیع الزماں کے نسخے میں ترمیم وتصحیح اور جدید فصول قائم کر کے شائع کر دیا، اور اس کے مقدمہ کا اردو ترجمہ مولانا شمس بریلوی سے کرایا گیا جس سے اس کا حسن دوبالا ہوگیا، مولانا دریابادیؒ کو اردو ادب میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے، اور ''فیہ مافیہ'' کا اردو دنیائے ادب میں اول اول متعارف کرانے کا سہرا بھی مولانا دریابادیؒ کو جاتا ہے۔

### مثنوی ''بحرالمحبت'':

مولانا دریابادیؒ کے ذخیرۂ تحقیق وتدوین میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی مثنوی ''بحرالمحبت'' کا ذکر آتا ہے، مولانا دریابادیؒ کو مصحفی کی یہ مثنوی اپنے خالہ زاد بھائی شفاء الملک حکیم عبدالحسیب دریابادیؒ کے ذاتی کتب خانہ سے دستیاب ہوئی، اس نسخہ کو طاہر الزماں نے اپنی کتابت سے آراستہ کیا تھا، مولانا دریابادیؒ نے اس کا دوسرا نسخہ تلاش کرنے کی بہت کوشش کی کہ جس سے تقابل وموازنہ کر لیا جائے مگر دوسرا نسخہ تلاش بسیار کے دستیاب نہ ہوسکا، چنانچہ یہی نسخہ مولانا دریابادیؒ کے پیشِ نظر رہا، لہٰذا اس کو جدید اصول وضوابط کے مطابق مرتب کر کے شائع کیا، مولانا دریابادیؒ نے اس نسخہ کے شروع میں ایک دیباچہ اور مقدمہ قائم کیا، مقدمہ میں مصحفی کی سوانح حیات کو بیان کیا اور اس کے بعد ان کے کلام کی تشریح وتوضیح کی۔

مصحفی کے دل میں مثنوی ''بحرالمحبت'' کو لکھنے کا اصل جذبہ میر تقی میرؔ کی مثنوی ''دریائے عشق'' سے متاثر ہو کر پیدا ہوا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں کہ:

''آغاز کتاب میں یہ عبارت درج ہے:

''مثنوی میاں مصحفی سلمہ کہ برطبق مضمون مثنوی دریائے عشق کہ از میر تقی میر مرحوم است گفتہ اند''۔[۴۹]

آگے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے لکھا ہے کہ کاتب صاحب کو فن کتابت کے اسرار ورموز سے کم واقفیت ہے، کیونکہ ان سے املاء وکتابت میں نہایت فحش غلطیاں سرزد ہوئیں ہیں، مثنوی کو ہر مقام پر مسنوی لکھتے ہیں۔ اسی طرح تہیہ کو تحیہ، وقس علی ھذا۔ مزید براں کوئی دوسرا نسخہ بھی دستیاب نہ ہوسکا، اسی وجہ سے مولانا

دریابادیؒ نے کتاب پر جا بجا حواشی قائم کرنے کا اہتمام کیا ہے۔لہٰذا ان تمام دشوار کن مراحل سے گزرتے ہوئے مولانا دریابادیؒ نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، اوراس نسخہ کو۱۹۲۲ء میں طبع کرایا، اس طباعت کے تقریباً دوسال بعد اس مثنوی کا دوسرا نسخہ مل گیا، اس نسخہ کے اصل مالک شاکر حسین نکہت سہسوانی تھے، سید محفوظ علی بدایونی کے توسط سے آپ تک پہنچا، مولانا دریابادیؒ نے ان دونوں نسخوں کا موازنہ کیا، پھر بھی یہی کہتے ہیں کہ بہ حیثیت مجموعی میرا نسخہ اس نسخہ سے صحیح تر ہے۔مولانا دریابادیؒ نے اپنے نسخہ میں یہ طریقۂ تالیف اختیار کیا ہے کہ اپنے نسخہ کو''الف'' اور دوسرے کو''ب'' کے نام سے موسوم کیا ہے، اور جن الفاظ میں قیاس سے کام لیا ہے ان کو حرف''میم'' کی علامت سے ظاہر کیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے مصحفی کے حالات تفصیل سے قلمبند کئے ہیں، اور آپ نے اس کتاب کی ترتیب وتسوید میں جن کتب سے استفادہ کیا ہے، ان میں سرفہرست محمد حسین آزاد کی آب حیات، اور مرزا غالب کی گلِ رعنا، تذکرۃ الشعراء، سراپا سخن، تذکرہ گلشنِ ہند، گلشن بے خار وغیرہ پیشِ نظر رہیں۔

مولانا دریابادیؒ نے مثنوی میں اشعار کی توضیح وتشریح کے ساتھ ساتھ مشکل الفاظ کی فرہنگ کا اضافہ کیا ہے جس سے اس کی اہمیت ومعنویت دوبالا ہوگئی۔

## تحفۂ خسروی:

آزادی کے طویل عرصہ بعد بھی ہندوستان سیاسی، سماجی ومعاشی اعتبار سے انتشار کا شکار تھا، ہر طرف بدامنی، بغاوت، قتل وغارت اور خوں ریزی کا بازار گرم تھا، حق تلفی، ناانصافی، ظلم وستم، جبرواستبداد کی فضا عام تھی، حاکم اور محکوم کے بیچ رشتۂ محبت ختم ہو چکا تھا، حاکم اور رعایا اپنے اپنے فرائض فراموش کئے ہوئے تھے، چنانچہ غیر معمولی قسم کی کش مکش برپا تھی یہ کش مکش اتنی گہرائی تک اتری ہوئی تھی کہ حاکم اور رعایا کو نزاع کے میدان میں کھینچ لائی تھی۔

بہرحال کسی بھی قوم کی نشو ونما اور تعمیر وترقی کے لئے عدل وانصاف ایک بنیادی ضرورت ہے اگر عدل وانصاف ہی ختم ہوجائے تو دنیا کا سارا نظام ہی درہم برہم ہوجائے۔ایسے پرآشوب و پرفتن دور میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو یہ شدید احساس پیدا ہوا کہ ایک ایسی کتاب منصّۂ شہود پر لائی جائے جس سے مظلوم کی نصرت اور ظالم کا قلع قمع اور جھگڑوں کا فیصلہ کیا جاسکے اور معاشرے کے ہر فرد کی جان ومال، عزت وآبرو

اور مال واولاد کی حفاظت کی جا سکے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ''تحفۂ خسروی'' کا نایاب تحفہ انسانیت کوعنایت کیا،مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے سب سے پہلے اس کتاب کی تصنیف وتالیف میں آیات قرآنی اوراحادیث نبویؐ سے استفادہ کیا ہے،اس کے بعد ''کیمیائے سعادت'' اخلاق جلالی،گلستاں، بوستاں، بہارستاں، سیاست نامہ، ہندنامہ عطار، مثنوی معنوی، اور یونانی حکماء کے اقوال وغیرہ سے جامع نصیحت آموز اقتباسات جمع کر کے مرتب کیا ہے اور ان اقتباسات کوآٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے،اس میں قائم کردہ عنوانات درج ذیل ہیں:

۱) نیابت الٰہی وشکر نعمت،خوف خداوطاعت گزاری

۲) عدل دادگستر

۳) شفقت وعفو،حلم وتحمل،رحم مغفرت

۴) جودوکرم،سخاوعطا

۵) انتخاب صحبت وحفظ مراتب ارباب علم

۶) فرائض رعایا،اطاعت،خیرخواہی ووفاداری

۷) وصایائے افلاطون

۸) وصایائے ارسطاطالیساطالیس

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا انتخاب نہایت عمدہ ہے،اگرچہ تدوین واشاعت کے بعد مولانا دریابادیؒ نے اس کتاب کو بنظرِ تحسین نہیں دیکھا اور نہ اس کتاب کو کچھ زیادہ اہمیت دی، بلکہ آپ کو اپنی جانب اس کتاب کی نسبت کرتے ہوئے شرم ہونے لگی۔

اگراس مختصر دیباچہ میں ناگزیر حواشی وتعلیقات،مشکل الفاظ کی فرہنگ اور بعض تشریحات کے ساتھ مزین کیا جاتا تو غالب گمان ہے کہ اس کتابچہ کی معنویت واہمیت میں گراں قدر اضافہ ہوجاتا،لیکن یہ اضافہ مولانا دریابادیؒ کے بعد اب بھی کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی ''تحفۂ خسروی'' میں شامل اقتباسات،حکیمانہ نکات، دلپذیر نصائح اوراس کتاب کی تعریف واہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''سلطانِ عادل کا ایک یومِ عدل ساٹھ سالہ عبادت سے بہتر ہے، دنیا وآخرت کی مثال کوزۂ سفالیں اور کوزۂ زریں کی ہے کہ کوزۂ سفال کو بقا نہیں جب کہ کوزۂ زرّیں کبھی ٹوٹتا نہیں، سیاستِ فاضلہ امامت کا درجہ رکھتی ہے، اور اس میں امورِ معاش ومعاد دونوں آتے ہیں۔ درجۂ بادشاہی درجۂ نبوت کے بعد ہے۔ پہلوان وہ ہے جو اپنے غصہ کو پچھاڑ سکے، حضرت عیسیٰ سے پوچھا گیا کہ کس چیز کے ذریعہ غضب الٰہی سے بچا جا سکتا ہے، فرمایا ترکِ غضب کے ذریعے۔ جس میں احسان نہیں، وہ انسان نہیں۔ سخی کی مثال کف گیر کی ہے کہ دوسروں کو رزق مہیا کرتا ہے اور خود خالی رہتا ہے، امیرِ وقت کا کہا سنو خواہ وہ حبشی غلام اور کم عقل ہی ہو، غرض یہ کتاب حکمت، دانش، متوازن ملفوظات اور اقوال رفیعہ کا ایسا خزینہ ہے، جس کی آج بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کل تھی۔ ۵۰

## خطوطِ مشاہیر:

خطوط نویسی کی تاریخ اتنی قدیم ہے کہ یہ بذاتِ خود اردو ادب میں ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیا کر چکی ہے، ہر انسان خطوط کے ذریعہ سے اپنی بات اور دلی جذبات واحساسات مکتوب الیہ تک باآسانی پہنچا دیتا ہے، اس طرح دونوں ایک دوسرے کی خیر وعافیت اور حالات وکوائف سے واقف ہو جاتے ہیں۔ مکتوب نگار کبھی کبھی اپنے مکتوب میں ان معاشرتی حالات وواقعات کو بھی قلم بند کر دیتا ہے جو اس کی نجی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ خطوط نگاری میں طنز ومزاح کے علاوہ مسرت وتعزیت کا اظہار، ہجر ووصال کی باتیں لکھی جاتیں ہیں، جب کوئی شخص اپنے دور میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کو علمی وادبی اور سیاسی انداز میں تحریر کرتا ہے تو ایسے خطوط تاریخ رقم کرنے میں بہترین ومستند ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہمارے اس دورِ جدید کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ اب خطوط لکھے ہی نہیں جا رہے ہیں۔ خطوط اردو ادب ہی میں منحصر نہیں بلکہ ہر فن کے نابغۂ روزگار کے خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ برقی ذرائع ابلاغ نے حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل دیئے ہوں، ای میل، فیس بک، واٹس ایپ، نے فاصلوں کی طنابیں کتنی ہی کیوں نہ کھینچ دی ہوں، لیکن اس کے باوجود خطوط کی ترسیل کا سلسلہ جاری ہے۔

خطوط نویسی کو غالب نے باقاعدہ فن کی حیثیت سے فوقیت وجلا بخشی، چنانچہ ان کے خطوط فارسی اور اردو (عودِ ہندی، رقعات غالب، اردوئے معلیٰ) دونوں زبانوں میں دستیاب ہیں۔

علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط بھی ان کے سیاسی اقتصادی اور ادبی رجحانات کے سمجھنے

میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

''خطوط مشاہیر'' ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مشاہیر علم وفن علامہ شبلی نعمانی، حضرت اکبرالہٰ آبادی، اور مولانا محمد علی جوہرؒ نے اپنے قلم سے مولانا دریابادیؒ کو لکھے تھے۔ان تینوں عظیم شخصیات کے ساتھ مولانا دریابادیؒ کے علمی، فکری، ذہنی روابط تھے، اوران حضرات کو بڑے ہی ادب واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے، اور ظاہر ہے کہ ان تینوں عظیم شخصیات کا مولانا دریابادیؒ کوتشکیک والحاد سے راہِ راست پر لانے میں بڑاا اہم رول رہاہے، جس کا اعتراف مولانا نے بڑی ممنونیت سے کیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے نام لکھے گئے خطوط کا مجموعہ اردو ادب میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔

مولانا دریابادیؒ نے ان خطوط کوترتیب وتدوین کے بعد ''خطوط مشاہیر'' کے نام سے تاج کمپنی سے شائع کر دیا، اس کی تفصیل آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ:

> ''وقت کے مشاہیر اہل علم، اہل شعروادب واہل سیاست کے خطوں کا ذخیرہ اپنے پاس ایک عرصہ سے موجود تھا، جی میں آیا کہ انہیں مرتب کر کے اوران پر اپنے حاشیے بڑھا کر انہیں چھاپ دیجئے، چنانچہ پہلی جلد ''خطوط مشاہیر'' کے نام سے مولانا شبلی اور اکبرالہٰ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر کے خطوں کی اپنے دیباچوں اور بہ کثرت حاشیوں کے اضافے کے ساتھ تاج کمپنی کو پانسونقد کے معاوضہ پر دے دی اوراس نے غالباً ۱۹۴۷ء میں چھاپ دی''۔ ۵۱

اس کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ''خطوط مشاہیر'' کی نظر ثانی فرمائی، اور جابجا عبارات میں ترمیم کر کے مزید حواشی کے تحت بہت سی وضاحتوں کا اضافہ کیا، تقریباً ۲۳ رسال بعد ۱۹۶۹ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع کرایا۔

مولانا دریابادیؒ نے ایک مستقل دیباچہ کے علاوہ ہر شخصیت کے خطوط سے قبل ایک جامع ضمنی دیباچہ تحریر کیا ہے، جسے بعنوان ''خطوط شبلی یا شبلی نامہ''، ''خطوط اکبرالہٰ آبادی''، ''خطوط محمد علی جوہر، جوہر نامہ''۔

اس مجموعۂ خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ادبی وعلمی شخصیات میں کس قدر مجتہدانہ بصیرت، تحقیق وجستجو، زندہ دلی اور وجدانیت تھی، خطوط نویسی کے طالب علم کو چاہئے کہ ان خطوط کا بغور مطالعہ کرے کیونکہ عصر حاضر میں ان خطوط کی معنویت اتنی زیادہ ہے جتنی پہلے تھی، اس مجموعۂ خطوط میں کل صفحات کی تعداد

۳۲۳؍ رہے۔

## مکتوبات سلیمانی:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے نام سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے لکھے گئے خطوط کو دو جلدوں میں مرتب کیا، اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع کرایا، جلداول کی اشاعت ۱۹۶۳ء میں ہوئی، جبکہ جلد ثانی کی نشرواشاعت ۱۹۶۷ء میں ہوسکی، جناب چودھری طارق اقبال نے ان دونوں جلدوں کو نہایت عمدہ اور دیدہ زیب ٹائٹل میں بعنوان ''سید سلیمان ندوی کے خطوط عبدالماجد دریابادیؒ کے نام'' سے نفیس اکیڈمی کراچی سے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا ہے، یہ نسخہ طلبہ ریسرچ اسکالر اور محققین کے لئے بڑا مفید اور کارآمد ہے، کیونکہ دونوں جلدوں کے یکجا ہونے کی شکل میں بڑی آسانی ہوگئی ہے۔اس مجموعۂ خطوط میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے تقریباً ۲۷۷؍خطوط شامل ہیں، مزید یہ کہ مولانا دریابادیؒ نے اپنے تشریحی حواشی کا اضافہ کیا ہے جن کی مجموعی تعداد ۲۲۰۰؍ کے قریب ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان خطوط کے مطالعہ سے ایک طرف نہ صرف سید سلیمان ندویؒ کے منفرد اسلوب نگارش، صنعت رعایت لفظی، ذہنی وفکری شعور، طنز وظرافت کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف مولانا دریابادیؒ کی سحر انگیز طرزِ نگارش، صنعت لفظی کا بھرپور علم ہوتا ہے۔

## سوانح نگاری:

تاریخ اسلام میں سوانح نگاری کا آغاز وارتقاء سیرت نگاری کے زیرِ اثر ہوئی، سب سے پہلے منظوم ومنثور سیرت نگاری کی داغ بیل پڑی، اس کے بعد مختلف زبانوں میں سوانح عمریاں وجود میں آئیں جن سے مذہبی سرمایۂ ادب میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، پہلی مرتبہ باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز خواجہ الطاف حسین حالی سے ہوا، جس کے نتیجہ میں تین سوانح عمریاں مثلاً حیات سعدی، یادگارِ غالب اور حیات جاوید وجود میں آئیں، لیکن جس شخصیت نے اس صنف کو عروج پر پہنچادیا وہ علامہ شبلی نعمانی ہیں۔راقم کے نزدیک بھی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر ''بیان القرآن'' کے بعد علامہ شبلی نعمانی کا سب سے بڑا کارنامہ ''سیرت النبی ﷺ'' ہے۔علامہ شبلی نعمانیؒ کے حاشیہ نشینوں میں مولانا دریابادیؒ کا نام بھی بحیثیت سیرت نگار اور سوانح نگار کے آتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ذات وشخصیت متنوع کثیرالجہت تھی، آپ نے بحیثیت محقق ومترجم عظیم مذہبی خدمات کے ساتھ ساتھ ادبی وسیاسی خدمات انجام دی ہیں، مولانا دریابادیؒ نے مختلف اصناف نثر کی طرح سوانح نگاری کے موضوع پر قلم اٹھایا، اور اردو زبان وادب کی مختلف اصناف کے سرمایۂ ادب کو اپنی صلاحیتوں سے مالا مال کیا، آپ کو فن سوانح نگاری کے اصول وضوابط اور حدود قیود سے کما حقہ واقفیت تھی، اسی وجہ سے آپ نے اردو ادب اور قوم کو فن سوانح نگاری کی نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کسی بھی شخصیت پر قلم اٹھاتے تو اس کے تمام پہلوؤں کا اس طرح ہمدردانہ جائزہ لیتے کہ ہر ہر پہلو قاری کے سامنے واضح ہو جائے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے فن سوانح نگاری میں بھی اپنی اسلوب نگارش اور انشاء پردازی سے ایسی شان پیدا کردی کہ آپ کی تحریریں دلنشیں اور اثر انگیز ہوگئیں، اور اس معاملے میں ہرگز افراط وتفریط سے کام نہیں لیا، بلکہ موزوں ومناسب ڈھنگ سے حالات وواقعات کا جائزہ لے کر صفحۂ قرطاس پر اتار دیا۔

سوانح نگاری کے سلسلے میں مولانا دریابادیؒ کے قلم سے جو کتابیں منظر عام پر آئیں، وہ درج ذیل ہیں:

۱) حکیم الامت نقوش وتاثرات ۲) محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق
۳) آپ بیتی ۴) سیرت نبویؐ قرآنی
۵) ذکر رسول یا مردوں کی مسیحائی ۶) معاصرین
۷) وفیات ماجدی یا نثری مرثیے ۸) اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں

## حکیم الامت نقوش وتاثرات:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی سیرت وسوانح اپنے مخصوص وشگفتہ اسلوب میں لکھی، مولانا دریابادیؒ نے اپنے مرشد روحانی کے متعلق یہ سوانحی اور علمی مرقع بڑے متوازن اور منصفانہ انداز میں تحریر کیا ہے اس میں جوش عقیدت اور خروش وارفتگی اور بعض مقامات پر غلو ومبالغہ کا پہلو بھی نظر آتا ہے، تاہم اعتدال وانصاف کا عنصر غالب ہے۔

بہر حال مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی یہ تصنیف باضابطہ سوانح نگاری کے اصولوں پر نہیں اترتی، لیکن اپنے بے مثال اور منفرد اسلوب، شگفتگی کی بنا پر اردو ادب کی مؤثر اور اعلیٰ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، ہندو

بیرونِ ہند کے علمی وادبی حلقوں میں خاصی مقبول ہے، چنانچہ اب تک اس کتاب کے ہندوستان وپاکستان میں کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

بیسویں صدی کے نامور عالم دین مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، آپ کی ذات وشخصیت مجموعہ کمالات اور جامع الحیثیات تھی، آپ باعمل عالم، مستند ومفسرِ قرآن، محدث، فقیہ، متکلم، متبع شریعت، مناظر، واعظ، سلوک ومعرفت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، جس کی شہادت آپ کے آثار علمیہ سے ملتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو حضرت تھانویؒ سے جو محبت وعقیدت اور تعلق خاطر تھا، اس کے سب معترف ہیں، اس کا اندازہ حکیم الامت نقوش وتاثرات کے مطالعہ سے بحسن وخوبی ہوسکتا ہے۔ اس کتاب کی ہر ہر سطر بلکہ ہر لفظ سے عقیدت ومحبت کی خوشبو پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس کتاب کی اصل بنیاد مراسلت وخطوط پر ہے، مولانا دریابادیؒ نے اپنے اور حضرت تھانویؒ کے درمیان ہوئی مراسلت وخطوط کو محور بناتے ہوئے اپنے طویل اور سابقہ تجربات ومشاہدات کی بنیاد پر ان کے بارے میں نقوش وتاثرات سپرد قرطاس وقلم کردیئے ہیں۔

چنانچہ مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''حضرت تھانوی کی وفات جولائی ۱۹۴۳ء میں ہوئی، اس کے کچھ ہی روز بعد خیال آیا کہ اپنے اور حضرت کے تعلقات پر، حضرت کے خطوط کی روشنی میں کچھ لکھ ڈالوں، خطوط سیکڑوں کی تعداد میں محفوظ مل گئے، میرے اصل عریضے بھی اوران ہی پر حضرت کے جوابات بھی، بڑا وقت ان کے چھانٹنے اور تاریخ وار مرتب کرنے میں لگ گیا، پر کتاب کو بھی قدرۃً ضخیم ہی ہونا تھا، خیر خدا خدا کرکے کتاب ۱۹۵۰ء میں حکیم الامت نقوش وتاثرات کے عنوان پر تیار ہوگئی اور ۱۹۵۲ء میں پریس سے باہر آگئی''۔[۵۲]

مولانا اشرف علی تھانویؒ کو خانقاہی نظام اور تصوف وسلوک میں اتنی شہرت ومقبولیت ہوگئی تھی کہ لوگ دور دراز مقامات کا سفر طے کرکے آتے تھے، اور عام طور سے لوگ صاحب کشف وکرامات، الہامی وجلالی بزرگ سمجھتے تھے، اس لئے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے حضرت تھانویؒ کا تعارف مرتبۂ ولایت ومعرفت اور

مناقب عرفانی ومدارج روحانی کی حیثیت سے نہیں کرایا بلکہ ایک بہترین انسان کی حیثیت سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے، مولانا نے نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ حضرت تھانویؒ کے عالمانہ وحکیمانہ اوصاف جمیلہ ان ''نقوش وتاثرات'' کے اندر قلم بند کردینے کی کوشش کی ہے، تطویل لاطائل اور غیر ضروری باتوں سے بالکلیہ احتراز کیا ہے۔

اس کتاب میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے حضرت تھانویؒ کے ساتھ پندرہ سولہ سال کے ذاتی تعلقات، مشاہدات، علمی، فقہی، کلامی، تفسیری، سیاسی، مذہبی، سماجی اور ذاتی مسائل پر اپنے اور ان کے اختلافی تسامحات پر کھل کر بحث وتمحیث کی ہے۔

اپنے نجی مسائل، گھریلو معاملات، مشکلات اور الجھنیں ان کے سامنے بذریعہ خطوط یا زبانی پیش کی ہیں تاکہ ہدایت ورہنمائی مل سکے، جس کی وجہ سے کتاب بڑی دلچسپ اور عمدہ ہوگئی ہے مگر اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مرشد تھانویؒ اور مسترشد دریابادیؒ کا تعلق کہیں سے روایتی اور اکابر پرستی کا نظر نہیں آتا بلکہ اس سلسلہ میں مولانا دریابادیؒ کا اصول یہ ہے کہ اصل تابعداری کتاب وسنت اور شریعت کی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنے موقف کی کھل کر وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> ''کسی بزرگ کو بزرگ معظم ماننے سے ہر گز لازم نہیں آتا کہ اس کی ساری ہی باتیں دل میں اتر جائیں اور اس کا ایک ایک جزئیہ واجب التسلیم ہوجائے، کم از کم اپنا عقیدہ تو یہی ہے کہ اطاعت مطلق وغیر مشروط صرف رسل معصوم کا حق خصوصی ہے''۔[۵۳]

حقیقت یہ ہے کہ ان خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے حضرت تھانویؒ سے نہایت عزیزانہ اور بے تکلفانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے، اور حضرت تھانویؒ نے بھی آپ کو اپنے مریدین سے کہیں زیادہ مراعات دے رکھی تھیں، اس کتاب کی پہلی اشاعت ۱۹۵۶ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ہوئی، اور دوسری مرتبہ نشر واشاعت ۱۹۶۷ء میں لاہور سے ہوئی، اور تیسری مرتبہ اشاعت سعادت علی قاسمی نے سعدی بکڈپو الٰہ آباد سے کرائی لیکن اس وقت جو میرے پیش نظر نسخہ ہے وہ عبدالمنان ہلالی کے زیر اہتمام دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ یوپی سے شائع شدہ ہے۔

## محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق:

برصغیر میں بیسویں صدی کے اوائل میں جو عظیم شخصیت نمودار ہوئی وہ رئیس الاحرار شہید آزادی، قائد ملت مولانا محمد علی جوہرؒ کی ذات گرامی تھی۔

دستِ قدرت نے مولانا محمد علی جوہرؒ کو بے مثل قیادت وسیادت، صحافت وخطابت، صدق گفتاری، بے باکی، بے خوفی، خوداعتمادی وخودداری، دینِ خداوندی کی سربلندی کی تڑپ کے ساتھ ساتھ مجاہدانہ کردار اور حوصلہ مندعزم واستقلال جیسے بیش بہا کمالات وامتیازات سے نوازا تھا۔

مولانا دریابادیؒ کو اس دل نواز شخصیت سے بھی شدید فکری وجذباتی ہم آہنگی تھی، مولانا دریابادیؒ کے مولانا محمد علی جوہر سے تقریباً ۱۸/سال تک قلبی تعلقات استوار رہے۔ مولانا دریابادیؒ نے اپنی زندگی میں جن عظیم شخصیات کے اثرات قبول کئے ہیں ان میں سرفہرست علامہ شبلی نعمانی، اکبرالٰہ آبادی، مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ساتھ ساتھ مولانا محمد علی جوہرؒ کی ذاتِ عالی کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ مولانا محمد علی جوہرؒ سے اپنے قرب واتصال اور آپ کی سیرت وشخصیت سازی کی تشکیل میں جوان کے اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ میرے گویا محبوب تھے ان کا نام بچپن سے سننے میں آرہا تھا، اور ان کی انگریزی مضمون نگاری اور انشاپردازی کی دھاک شروع سے دل میں بیٹھی ہوئی تھی، عمر میں مجھ سے چودہ سال بڑے تھے، شخصی تعارف اخیر ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ محبت وعقیدت دور ہی سے بڑھتی رہی، ستمبر ۱۹۲۱ء میں جب یہ دوبارہ اسیرفرنگ ہوئے اور کراچی میں سزایاب، تو زبان ودماغ پر ان کی اخلاقی وروحانی عظمت کا کلمہ رواں تھا۔ اور ان کی ذات سے شیفتگی درجۂ عشق تک پہنچ چکی تھی، ۱۹۲۳ء کے آخر سے ختم ۱۹۳۰ء تک قرب واتصال کے مواقع کثرت سے حاصل رہے اور عشق میں ترقی بھی ہوتی رہی، ان کی نہ کوئی بات دل کو بری لگتی نہ ان پر کسی حیثیت سے بھی تنقید کرنے کو جی چاہتا، یہی جی میں رہتا تھا کہ ان کے قلم اور ان کی انگلیوں کو چوم چوم لوں اسلام اور رسولؐ اسلام سے اس درجہ شیفتگی، اللہ کے وعدوں پر اس شرط سے اعتماد، یہ اخلاص، یہ للّٰہیت، تصنع ومنافقت سے اس درجہ گریز، حق کے معاملہ میں عزیزوں، قریبوں، بزرگوں تک سے بے مروتی اور پھر ایسی فہم وذکا علم وآگہی، غرض میرے لئے تو ایک بے مثال شخصیت تھی، اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے''۔[۵۴]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علی جوہرؒ کی وفات کے بعد اپنے دلی تاثرات اپنے اخبار ''سچ'' میں بعنوان ''مولانا محمد علی جوہر'' قلم بند کئے، بس انہیں کو اساس و بنیاد بنا کر دو جلدوں میں ایک مبسوط مسوّدہ شائع کیا جواب ''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق'' کے نام سے معروف و مشہور ہے، لیکن حقیقت میں یہ تفصیلی مرقع مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے اصلی جوہر اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز وطرزِ سیاست، غیر منقسم ہندوستان کی تاریخ آزادی، تحریک خلافت و ترک موالات، اسلام اور مسلمانوں کے تئیں ان کی اخوت و مودت کے بےلوث جذبات ان کی دینی غیرت و حمیت کے باب میں ایک مستند و معتبر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا محمد علی جوہرؒ کے ان تمام اوصاف و کمالات کے باوجود قوم و ملت نے آپ کی قدر و منزلت کو نہیں پہنچانا اور آپ کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، مولانا محمد علی جوہرؒ کی طبیعت میں کروفر جاہ و جلال اور جذباتیت غالب تھی، اس لئے آپ کی عمر عزیز کے آخری چند سال تنازع کے نذر ہو گئے۔ غرضیکہ مولانا دریابادیؒ نے مولانا محمد علی جوہرؒ کی افتادِ طبع کی منظر کشی بہت ہی دیانت داری اور جذباتیت کے ساتھ کی ہے جس سے لوگوں کا اعتقاد و حسن ظن مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ بڑھ جاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''سردارِ ملت کی عمر کے آخری ۵۔۶ سال ملت ہی کے بعض طبقات سے شدید اختلافات میں گزرے۔ جنگ و مقابلہ آج اس طبقہ سے ہے کل اس طبقہ سے، اور اخیر زمانہ میں تو ان کے خلاف بغاوت بہت عام ہو گئی تھی۔ یہ ساری داستان یقیناً بڑی تلخ ہے اور بہت سے اکابر معاصرین کے عقیدت مندوں کے جذبات کو اس حصہ سے ضرور ٹھیس لگے گی۔ لیکن اگر اس جزو کو سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو پھر کتاب کے لئے رہ ہی کیا جاتا، اپنی والی پوری کوشش اس کی البتہ رہی ہے کہ ان تلخیوں کو زیادہ سے زیادہ نرم اور ہلکے پیرایہ میں پیش کیا جائے، بعض پڑھنے والوں کی دل شکنی اور ناگواری کسی نہ کسی حصہ سے ناگزیر ہے۔ یہ اگر جرم ہے تو اللہ معاف فرمائے اور پڑھنے والے بندے بھی آگے پڑھنے سے قبل عفو و درگزر کی نیت اپنے دل میں پختہ کرلیں''۔[۵۵]

یہ کتاب مولانا محمد علی جوہر کے میدان خطابت و صحافت، سیاست و صداقت میں ماجدی اسلوب کا شاہ کار ہے، اور اس کا اندازِ بیاں بے حد تاثیر انگیز اور سائنٹفک ہے، یادآفرینی، سلاست بیانی اور ادبی چاشنی کے

سبب اردو کی سوانحی ادب میں ایک امتیازی وانفرادی مقام رکھتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے منفرد اسلوب میں اور ایک انوکھے انشاء پرداز کے قلم سے اور ایک انوکھے قائد کی سوانح کے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں ملاحظہ ہوں:

''۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی قید فرنگ سے رہا ہوئے تو کانگریس پارٹی کے صدر منتخب ہوئے اسی زمانے میں لکھنؤ آئے، یہاں ان کو متعدد جگہوں پر ایڈریس دیے گئے، مدرسہ نظامیہ فرنگی محل کی طرف سے مولانا کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے عصرانے کا اہتمام کیا، بعد مغرب امین الدولہ پارک میں عظیم الشان جلسہ عام ہوا۔اس کی صدارت لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر اور معروف لیڈر چودھری خلیق الزماں نے کی۔مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں برادران وطن بھی شریک جلسہ تھے۔اسی جلسے میں کچھ شریروں نے ہینڈ بل تقسیم کرنے شروع کر دیے کہ یہ محمد علی وہی ہیں جنہوں نے جامع مسجد علی گڑھ میں ایک تازہ تقریر میں کہا ہے کہ میں ایک فاجر و فاسق مسلمان کو بھی گاندھی جی پر ترجیح دیتا ہوں، ایسا شخص بھلا کانگریس پارٹی کا صدر کیسے مانا جا سکتا ہے؟

احباب و مخلصین کچھ پریشان سے ہو گئے، بہتوں نے کہا کہ سوال بالکل بے محل ہے، خود صدر جلسہ نے سائل کو خاموش ہو جانے اور بیٹھ جانے کا حکم دیا، لیکن ہزاروں کے اس مجمع میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو سوال سے مطلق نہ گھبرایا، وہ دل میں پورا اطمینان رکھے ہوئے تھا اور وہ شخص خود محمد علی تھا! صدر نے سائل سے پکار کہا'' آپ بیٹھ جائیے، میں سوال کی اجازت نہیں دیتا''۔معاً محمد علی چمک کر بولے مگر میں اجازت دیتا ہوں، آپ اپنے سوال کا جواب لیجئے اور اس کے بعد یوں گویا ہوئے:

''علی گڑھ میں میں نے جو کچھ کہا اسے دہرانے کے لیے یہاں بھی تیار ہوں اور ہر جگہ، گاندھی جی اس وقت آزادیٔ ملک کے لیے جو خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کے لحاظ سے وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے اور جہاں تک ان کی بیش بہا خدمات وطن کا تعلق ہے، میں مہاتما جی کو اپنے ہی سے افضل نہیں، بلکہ اپنی والدہ ماجدہ سے بھی زیادہ قابل تعظیم اور اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بھی بڑھ کر قابل احترام سمجھتا ہوں، لیکن ایک دوسری حیثیت اعتقاد و ایمان کی ہے، میں عقیدتاً مسلمان ہوں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ عقیدۂ اسلام کو اور تمام عقائد سے کہیں بہتر اور اعلیٰ تر سمجھتا ہوں اور اس لحاظ سے، یعنی جہاں تک عقائد ایمانی کا تعلق ہے، میں اکیلے گاندھی جی ہی سے نہیں تمام ہندوں، تمام عیسائیوں، تمام غیر مسلموں کے مجموعے سے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان، ہر بدعمل سے بدعمل کلمہ گو کو بہتر

سمجھتا ہوں۔اسلام کی افضلیت میرا جزوایمان ہے۔اگر آج میں خدانخواستہ اس کا قائل نہ رہو تو پھر مسلمان رہنے کی بھی کوئی وجہ نہیں رہتی۔میری بات کوئی انوکھی بات نہیں ،جس طرح میں اپنے عقیدے کی افضلیت کا قائل ہوں، اسی طرح ہرمذہب والا اپنے عقیدے کو افضل تسلیم کرتا ہے، کیا پنڈت مدن موہن مالوی جی اپنے عقیدے کو افضل خیال نہیں کرتے؟''۔۵٦

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لندن کی گول میز کانفرنس میں جابر حکمراں کے روبرو شیر خدا مولانا محمد علی جوہرؒ کی آخری گرج اور یلغار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''............لارڈ ریڈنگ سے مجھے انتقام لینا مقصود نہیں،لیکن اپنے ملک کی آزادی کا تو میں اس وقت قائل ہوں گا، جب مجھے یہ اختیار حاصل ہوجائے کہ میں جب چاہوں ، لارڈ ریڈنگ کو ان کے کسی جرم پر جیل بھجوادوں''۔

میں درجۂ نوآبادیات کا قائل نہیں۔میں تو آزادئ کامل کو اپنا مسلک قرار دے چکا ہوں۔ برطانیہ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کو نامرد و بزدل بنا دیا ہے،لیکن ۳۲؍کروڑ (خیال رہے کہ یہ تعداد ۱۹۳۰ء کی ہے ) کی جس آبادی نے خود اپنے میں مرجانے کی ہمت پیدا کرلی ہے،اسے مارڈالنا کچھ آسان نہیں۔اصلی مسئلہ اس وقت ہندومسلم مفاہمت کا مسئلہ ہے۔دونوں کو آپس میں لڑا کر حکومت کرانے کا مسئلہ اب ایک بھولا ہوا خواب ہے۔میں مریض ہوں اور اپنے بستر مرض ہی سے یہاں آیا ہوں، اب میں اس وقت تک اپنے غلام ملک میں زندہ واپس نہ جاؤں گا جب تک کہ اپنے ہم راہ روح آزادی کو لے کر نہ جاؤں ۔اگر آپ نے یہ نہ دیا تو میرے لئے اپنے ہاں قبر کی جگہ دیجئے''۔۵۷

فروری ۱۹۲٦ء میں مولانا محمد علی جوہرؔ سخت علیل ہوگئے اسی دوران علالت گوناگوں اسباب کی بنا پر ان کا مشہور انگریزی ہفتہ وار اخبار'' کامریڈ(The Comrade) بند ہوگیا اس کا تذکرہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بڑے ہی درد بھرے انداز میں کیا ہے کہ:

''اس طرح کوئی ۱۵؍مہینے کی آب وتاب کے بعد یہ آفتاب صحافت غروب ہوگیا اور اب کی مرتبہ اس کی تدفین انگریز حکومت کے جبر وتشدد کے ہاتھوں نہیں،خود اپنی قوم کی ناقدریوں کے ہاتھ ہوئی۔

محمد علی جوہرؒ جوہر تحریر اردو کا نہیں، انگریزی انشاء کا میدان تھا،ساتھ ہی قوت استدلال غضب کی،

بیان کی دل آویزی، زبان کی شگفتگی، دلائل کی قوت، بحث کے اطراف وجوانب کی جامعیت، سب مل ملا کر عجب سماں پیدا کر دیتے ...... ''کامریڈ'' جس دن بند ہوا ہے حکام والا مقام کے علاوہ خود ہم چشم لیڈروں میں سے بھی خدا جانے کتنوں نے اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ ایک بڑا کانٹا پہلو سے دور ہو گیا، وہ دُرّۂ احتساب گم ہو گیا جو بڑے اور چھوٹے کے درمیان صرف انصاف کرنا جانتا تھا۔'' کامریڈ'' نامی ایک اخبار بند نہیں ہوا، مظلوموں کا ایک فریاد رس اور مسلمانوں کا ایک بڑا ترجمان دنیا سے اٹھ گیا''۔۵۸

بہر حال مولانا محمد علی جوہرؒ کے سانحۂ ارتحال (جنوری ۱۹۳۱ء) کے بعد ہی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے ہفتہ واری اخبار'' سچ''، لکھنؤ میں یہ'' ڈائری'' سلسلہ وار لکھنا شروع کی تھی جو ۷ار قسطوں شائع ہوئی تھی۔ جس کی پہلی جلد ۱۹۵۴ء میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی بہت ہی کوششوں اور کاوشوں کے بعد شائع ہوئی، اور جلد ۱۹۵۶ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی، اور ایک ایڈیشن پاکستان کے صاحب علم اور دریابادیؒ کے نادیدہ معتقد جناب محمد راشد شیخ صاحب نے اپنے اشاعتی ادارۂ علم وفن، کراچی، پاکستان سے ۲۰۰۱ء میں دیدہ زیب ٹائٹل میں دونوں جلدوں کو یکجا کر کے شائع کیا ہے، اسی ایڈیشن کا عکس لے کر صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

## آپ بیتی:

سلسلۂ سوانحی ادب میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا لاثانی اور شاہ کار کارنامہ خود اپنی'' آپ بیتی'' ہے۔ اس کتاب کو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شخصیت کے افہام وتفہیم میں کلیدی وامتیازی مقام حاصل ہے۔ اور اس خودنوشت سوانح کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مولانا دریابادیؒ نے صدق گفتاری، راست گوئی، واقعہ نگاری کا ثبوت پیش کیا اور اس میں کہیں سے کہیں تک آپ کی طرف سے کذب بیانی، دروغ گوئی سخن طرازی اور خودستائی کا ذرہ برابر میلان نظر نہیں آتا ہے۔

بلکہ مولانا دریابادیؒ نے اپنی ۸۵ر سالہ زندگی کی روداد واحوال وکوائف جس سچائی اور دیانت داری کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر قلم بند کئے ہیں۔ اس کی نظیر اردو زبان میں لکھی گئی آپ بیتیوں سرگزشتوں میں کم ہی مل سکے گی۔

گزشتہ صفحات میں'' آپ بیتی'' سے جابجا اقتباسات نقل کئے جا چکے ہیں، اس لئے مزید اقتباسات

کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے، مولانا دریابادیؒ کو بڑے بڑے انقلابات اور نشیب وفراز سے گزرنا پڑا، اور فکری الحاد وارتداد کے بعد اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کو ہدایت واستقامت سے نوازا، یہ آپ بیتی ان کی حیات اور عہد کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

مولانا دریابادیؒ نے کتاب کے آغاز میں اپنے عہد کے پس منظر کی تفصیل عہد طفیل کے رسوم ورواج، طفولیت کی حرکات وسکنات اوران پر ندامت وشرمندگی کا اظہار، والدین، اعزاء واقرباء، سواریاں، توہمات، اعمال وعقائد، معاشی ومعاشرتی سیاسی حالات، بسم اللہ کی تقریب، گھریلو تعلیم وتربیت، اسکولی وکالجی زندگی، اردو انگریزی مضمون نگاری، صحافت، تشکیک والحاد، دوبارہ اسلام کی طرف بازگشت، شادی واولاد۔ بیعت وارادت، مخصوص عادات ومعمولات، چند مظلوم شخصیتیں، مخالفین ومعاندین، عام نتائج وتجرباتِ زندگی کا نچوڑ، وغیرہ اہم موضوعات کو نہایت ہی سلاست وشگفتگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مولانا دریابادیؒ کی ''آپ بیتی'' پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ نے نہایت ہی جامع ''پیش لفظ'' تحریر کیا ہے۔ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نفسِ کتاب اور اس کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> ''غرض یہ کتاب ان کی زندگی کا مرقع ہے ہی، اس دور اور معاشرت کا بھی آئینہ ہے، جس میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور زندگی کا سفر طے کیا، کسی زمانہ میں بلکہ قریبی زمانہ میں ان اہل قلم اور مؤرخوں کو بھی اس سے بڑی مدد ملے گی، جو اس دور کے تمدن ومعاشرت پر کچھ لکھنا چاہیں گے، اس کتاب میں ان کو بعض ایسے اشارے ملیں گے جن سے وہ بہت کام لے سکتے ہیں، اور اس زمانہ کی بولتی ہوئی تصویر پیش کر سکتے ہیں، ادب کے طالب علموں بلکہ ادب کے استادوں اور معلموں کو بھی اس میں ادب وزبان کی خوبیاں، لکھنؤ اور اودھ کے محاورے، اساتذہ کے آبدار اشعار اور جاندار مصرعے، اردو زبان وادب کے گزشتہ دور، اور لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں سے تعارف ہوگا، دین واخلاق اور اصلاح وتربیت نفس کے سلسلہ میں بھی اس سے رہنمائی حاصل ہوگی''۔ ۵۹

غرض مولانا دریابادیؒ کی یہ ''آپ بیتی'' سادگی اور بے ساختگی، جزبات واحساسات کی مکمل ترجمان ہے، اور تمام تر خصوصیات سے مالا مال ہے۔

## اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں:

مولانا دریابادیؒ نے اردو کے باکمال شاعر حضرت اکبرالہ آبادی پر متعدد تنقیدی مضامین تحریر کئے ہیں، اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں ان ہی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس کو اب کتابی شکل میں یکجا کر کے شائع کر دیا گیا ہے، مولانا دریابادیؒ اور حضرت اکبرالہ آبادیؒ کے درمیان خلوص ومحبت کا تعلق خاطر تقریباً دس سال تک قائم رہا، تشکیک والحاد کے بحرظلمات میں سرگرداں رہنے کے بعد مذہب کی طرف واپس لانے اور اسلام کی عظمت وحقانیت کا راسخ نقشہ بٹھانے میں جن عظیم شخصیات کا نہایت اہم کردار رہا ہے ان میں سرِ فہرست حضرت اکبرالہ آبادی کی تربیت کا بڑا دخل رہا ہے۔

مولانا دریابادیؒ نے کلامِ اکبر کو خود ان کی زبانی سنا اور سمجھا تھا، اس لحاظ سے مولانا دریابادیؒ کلامِ اکبر کے مستند ناقد وشارح ہیں، مولانا دریابادیؒ اکبرالہ آبادی پر لکھنے لکھانے کا اتفاق اور اکبرنامہ کی اشاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''شاعروں مین سب سے زیادہ لکھنے لکھانے کا اتفاق اکبرالہ آبادی پر ہوا، خدا معلوم کتنے مضمون، مقالے، نوٹ ان پر لکھ ڈالے، اور نشریئے اس کے علاوہ۔ ۱۹۱۵ء میں نظر ثانی کر کے بہت سی تحریروں کو یکجا کر کے اور نام ''اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں'' کے رکھا اور ۱۹۵۴ء میں لکھنؤ کے ایک پبلشر نے اسے چھاپ دیا''۔[۶۰]

اکبرنامہ اگرچہ مستقل سوانحی تصنیف نہیں ہے، مگر ایک سوانح نگار کو اس میں جگہ جگہ ان کے سوانحی حالات مل جائیں گے، یہ اکبر کی شخصیت اور ان کے فن کے متعلق سمجھنے میں بے حد معین ومددگار ثابت ہوں گے۔

اکبرالہ آبادی نے اپنی ذہانت وفطانت کا کبھی غلط استعمال نہیں کیا بلکہ معرفتِ علم وفن کی خاطر اپنی ہستی کو خاک میں ملا دیا۔ ہمارے تنقید نگاروں نے اکبرالہ آبادی کی شخصیت سمجھنے میں عجلت سے کام لیا ہے۔ اکبرالہ آبادی نے شاعری کے مردہ جسم میں ایک نئی روح پھونکی، ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت قافیہ آرائی ہے، اور ان کی شاعری میں طنز وظرافت کا پہلوں نمایاں نظر آتا ہے، اور وہ اس سلسلہ میں ارباب علم وفن سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں، ان کے شاعری میں طنز ظرافت کا سیلاب جو ہمیں امنڈتا ہوا نظر آتا ہے

یہ ان کی سالہا سال کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اس سلسلہ میں اکبر خود شعر گو ہیں کہ:

شعر اکبر میں کوئی کشف وکرامات نہیں: دل پہ گزری نہ ہو جو ایسی کوئی بات نہیں۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اصطلاح منطق میں طنز وظرافت میں عموم خصوص مطلق کی نسبت پائی جاتی ہے۔طنز کے لئے ضروری نہیں کہ اس میں ظرافت کا پہلو موجود ہو مگر ظرافت میں طنز کا پہلو ضرور نمایاں ہوتا ہے۔طنز انسان کے چہرے سے نور سلب کر لیتا ہے جبکہ ظرافت انسان کو اپنی معیت میں قہقہوں کی منزل تک پہنچاتی ہے۔

یہ مجموعہ اکبر الہ آبادی کی شخصیت،ان کا مشرقی تصور،مغربی نظریات کی اندھی تقلید سے بیزاری،اور ہندوستان کے معاشرتی،تہذیبی ومشرقی اقدار کی پامالی کے سمجھنے میں معاون ہوگا۔

## ''معاصرین''اور وفیات ماجدی یا نثری مرثیے'':

سلسلۂ سوانح نگاری کے ضمن میں مولانا دریابادیؒ نے اپنی وفات کے بعد دو مجموعے''معاصرین''اور ''وفیات ماجدی یا نثری مرثیے''غیر مرتب شکل میں چھوڑے ہیں۔یہ دونوں مجموعے اپنے منفرد اسلوب وتاثر کے لحاظ سے بے مثل ہیں اور اُردو زبان وادب میں ایک امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔معاصرین میں مولانا دریابادیؒ کے قلم سے لکھے ہوئے تقریباً اسّی خاکے شامل ہیں۔دوسرے مجموعے''وفیات ماجدی یا نثری مرثیے''کو مولانا دریابادیؒ کے بھتیجے اور داماد جناب حکیم عبدالقوی صاحبؒ نے ذیلی عناوین قائم کر کے شائع کیا ہے۔ان سوانحی خاکوں میں مولانا دریابادیؒ کے ہم عصر معاصرین کے ادبی وسیاسی رویوں اور معاشرتی و ثقافتی نظریات کی مکمل ترجمانی کی گئی ہے اور ضمنی طور پر اس زمانہ کے کام احوال سے واقفیت کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔وفیات ماجدی میں وہ تمام تر نثری مرثیے ہیں جو مولانا دریابادیؒ نے اپنی زندگی میں''سچ''اور ''صدق جدید''میں شائع کئے تھے۔یہ مجموعی تعداد کے لحاظ سے ۶۲ ہیں۔

## سفرنامہ نگاری :

مولانا دریابادیؒ کے مزاج وطبیعت میں فطری طور پر خلوت پسندی تھی اس سے بظاہر یہ تصور ہوتا ہے کہ آپ کو اسفار کی عادت نہیں ہوگی،لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ آپ نے دیگر علمی وادبی معمولات کے

ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً ملک و بیرونِ ملک کے متعدد سفر کئے ہیں۔اوران اسفار کی روداد تحریری شکل میں لکھ دی ہےاوران کوآپ نے اپنے ہفتہ واراخبار ''سچ'' میں قسط وار شائع کیا،اوران کی عوام وخواص میں بڑی مقبولیت وپذیرائی ہوئی۔یہ سفرنامے حسب ذیل ہیں :

(۱) سفرحجاز (۲) ڈھائی ہفتہ پاکستان میں بامبارک سفر (۳) گیارہ سفر یا سیاحت ماجدی

(۴) تاثرات دکن

## (۱) سفرحجاز :

۱۹۲۹ء میں مولانا دریابادیؒ کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی، اوراس کی روداد اپنے ہفتہ وار اخبار ''سچ'' میں قلم بند کی جو بعد میں کتابی شکل میں ''سفرحجاز'' کے نام سے شائع ہوئی، اس سفر نامہ میں مولانا دریابادیؒ نے حج بیت اللہ سے متعلق اپنے عینی مشاہدات وقلبی تاثرات اور تجربات کو بڑے ہی دل آویز اور والہانہ انداز میں پیش کیا ہے جس کی مثال اردو میں لکھی گئی بیشتر کتابوں میں کم ہی مل سکے گی۔اس وجہ سے اس کتاب کو ہراعتبار سے اوّلیت وفوقیت حاصل ہے۔اس کتاب کے تقریباً پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔زبان واسلوب بیان بہت عمدہ ہے۔اس کتاب کو حج کے سفر ناموں میں گراں قدر اہمیت حاصل ہے۔

مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی لکھتے ہیں کہ :

> ''بلاخوف وتردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ''سفرحجاز'' اپنے عہد میں لکھے گئے حج کے سفر ناموں میں گل سرسبد کی حیثیت بھی رکھتا ہے اوراوّلیت کا مشرف بھی۔حج کا یہ ماجدی سفر نامہ مولانا دریابادیؒ کے باطنی احساسات وجذبات کے مدوجزر کی ایک انوکھی داستان ہے۔یہ سفرنامہ مولانا دریابادیؒ کے قلبی تاثرات وواردات کا ایک ایسا مجلیٰ ومصفیٰ آئینہ ہے جس میں عاشقان رسولؐ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔یہ محبت اوروالہانہ شیفتگی کا سفرنامہ ہے''۔[۶۱]

مولانا دریابادیؒ نے ''سفرحجاز'' میں تاریخی وجغرافیائی معلومات اور مقاماتِ مقدسہ کا تذکرہ قدیم و جدید علوم سے استفادہ کرتے ہوئے لکھا ہے اورحج وزیارت کے آداب وشرائط کو بیان کیا ہے۔ملت اسلامیہ کے عروج وزوال اورمسلمانوں کے درخشاں ماضی کا بیان بڑے ہی مؤثر انداز میں کیا ہے۔

ڈاکٹرتحسین فراقی ''سفرِ حجاز'' کی اثر انگیزی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''سفرحجاز'' کے بعض ابواب تو اپنی تاثر آفرینی کے ضمن میں بے مثال کہے جاسکتے ہیں مثلاً ''دیار حبیب''''الوداع'' وغیرہ، ماجد نے مدینہ سے رخصتی کا ذکر کرکے کس قدر رگداز کے عالم میں لکھا ہے کہ یہ رخصتی تو اصل میں لڑکی کی، ماں کے گھر سے، رخصتی کے مترادف ہے۔ بہرحال حرمین شریفین سے تمام تر عقیدت اور شدید سپردگی کے باوجود ماجد نے حزم واحتیاط اور آداب زیارت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ تاثیر اور گداز میں بہت کم سفرنامے اس کے مقابل میں رکھے جاسکتے ہیں''۔۶۲؎

## ڈھائی ہفتہ پاکستان میں:

سلسلۂ سفرناموں میں ''ڈھائی ہفتہ پاکستان میں'' مولانا دریابادیؒ کا ایک طویل سفرنامہ ہے مولانا دریابادیؒ نے اس سفرنامے میں نہ صرف پاکستان کے سیاحتی مقامات کا تفصیلی ذکر کیا ہے بلکہ وہاں کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات کا ایک دانشور کی حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ ماضی کے مشاہدات اور حال کی تصویر ثبت کردی ہے اور وہاں کے پُر آشوب حالات اور مفسدات کو بڑے ہی فکر انگیز اور درد بھرے لہجے میں بیان کیا ہے: مولانا نے پاکستانی عوام کی ذہنی وفکری، ثقافتی، سماجی، تہذیبی احوال کا بغور مطالعہ کیا اور وہاں کی خوبیاں بیان کیں، اور انہیں خوب سراہا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پاکستانی مسلم تہذیب وثقافت کا صحیح نمونہ دنیا کے سامنے پیش کردیا ہے تو بے جانہ ہوگا۔ یہ سفر ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد کی دعوت پر اختیار کیا تھا۔ جس کی روداد آپ نے صدق میں پھر کتابی شکل میں شائع کی۔ یہ سفرنامہ ۱۸/ابواب اور مختلف عناوین پر مشتمل ہے۔ مثلاً تقریب سفر پر طرح طرح کی طبع آزمائیاں، مسافرنوازیاں، مشاہدات وزیارت، خاطر داریاں، مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں، لاہور سے کراچی تک، ایک سرسری جائزہ، زہر اس کا تریاق، خوشگوار تجربے، پرانی یادیں نئے نظارے، حاصل سفر، اور آخر میں دو ضمیمے بھی ہیں۔ مولانا کہلانے سے قبل، اور سفر اور آخرت وغیرہ۔''

## سیاحتِ ماجدی اور تاثرات دکن:

مولانا دریابادیؒ نے اپنے ملک ہندوستان کے بھی مختلف شہروں اور ریاستوں کا دورہ کیا تھا، جن کی روداد کتابی شکل میں ''سیاحتِ ماجدی'' اور ''تاثرات دکن'' کے نام سے موجود ہے۔

ان سفرناموں میں متعدد مقامات پر قیام پذیر اشخاص اور ان کا محل وقوع، وہاں تک پہنچنے کے

راستوں کا تذکرہ نہایت ہی عمدہ پیرایہ اور مختصر طور پر کیا ہے۔ مزید ان مقامات کی تاریخی، مذہبی، دینی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔ وہاں کے طرز معاشرت اور رہن سہن پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ مولانا دریابادیؒ کے یہ سفرنامے اردو زبان وادب میں ایک قیمتی سرمایہ اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

## مکتوب نگاری:

خودنوشت سوانح نگاری کی طرح خطوط نگاری کو بھی نثری ادب کی معروف اور دلچسپ صنف میں شمار کیا جاتا ہے۔ مولانا دریابادیؒ نے اس میدان میں بھی اپنے علمی وادبی جوہر دکھائے ہیں۔ اس صنف میں اپنے منفرد اسلوب اور طرزِ نگارش سے ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ہم عصر علمی وادبی اشخاص، عزیزواقارب، مقالہ نگاروں کو بے شمار خطوط لکھے ہیں مولانا کے یہ خطوط خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

مولانا دریابادیؒ کے خطوط کے مجموعے درجِ ذیل ہیں:

(۱) مکتوبات ماجدی

(۲) رقعات ماجدی

(۳) خطوط ماجدی

مکتوبات ماجدی دو ذیلی عنوان پر مشتمل ہے۔

پہلا عنوان ''دل آویز خطوط'' دوسرا عنوان ''دل دوز خطوط'' کے نام سے منسوب ہے۔

اول عنوان کے تحت مولانا دریابادیؒ کے علمی وادبی، مذہبی، لسانی، ذاتی، روزمرہ کی زندگی ومعاملات سے متعلق خطوط ہیں۔ عنوان دوم کے تحت وہ تعزیتی خطوط ہیں جو آپ نے اپنے عزیز واقارب، دوست واحباب، علماء ودانشوں کو لکھے ہیں۔

دوسرا مجموعۂ خطوط رقعات ماجدی ہے۔ اس مجموعۂ خطوط سے مولانا دریابادیؒ کے افکار و عادات، اخلاق وکردار کے مختلف پہلوؤں اوران کے سوانحی نقوش کا پتہ چلتا ہے۔

تیسرا مجموعہ خطوط ماجدی ہے یہ مجموعہ بھی خطوط نگاری کے جملہ محاسن اورخوبیوں سے مالا مال ہے۔

## سیاسی زندگی:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو سیاست سے ہمیشہ تنفّر اور بیزاری رہی۔ وہ مولانا محمد علی جوہر کی طرزِ

سیاست اوران کے اعلیٰ اخلاقی قدروں سے شدید متاثر تھے، لیکن یہ تأثر اور کشش ان کی ذات اور انکے دونوں اخبار ''ہمدرد اور'' کامریڈ'' کے مطالعہ تک محدود رہی۔مولانا دریابادیؒ کو عملی سیاست اور ناطرف دارانہ زندگی میں دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب حکومت نے مسز اینی بسنت کو تحریک ہوم رول کے سلسلہ میں گرفتار و نظر بند کر دیا تھا۔مولانا دریابادیؒ کو گاندھی جی سے عقیدت ہوگئی تھی۔لیکن مولانا دریابادیؒ نے سیاسی رہنما محمد علی جوہر ہی کو منتخب کیا۔اس لئے جب تک مولانا محمد علی جوہرؒ باحیات رہے مولانا بھی سیاست میں شانہ بشانہ ان کا ساتھ دیتے رہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اگر چہ میدان سیاست میں ایک سیاست دان اور قائد کی حیثیت سے معروف نہیں ہیں لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ آپ سیاست سے یکسر لاتعلق رہے، بلکہ اپنی زندگی کا ایک مختصر حصہ عملی سیاست میں گزارا ہے جس کا تفصیلی تذکرہ انہوں نے اپنی ''آپ بیتی'' میں ''سیاسی زندگی کے عنوان'' سے کیا ہے۔اس کے علاوہ مصنفؒ کی مشہور کتاب ''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق'' میں سیاسی سرگرمیوں کی چند جھلکیاں نظر آتی ہیں۔مولانا دریابادیؒ نے اپنے دور کے نظریۂ سیاست کو عمیق نظر سے دیکھا اور پرکھا تھا، اوراس کے سیاسی مسائل اور تقاضوں سے خوب باخبر تھے، چنانچہ فطری طور پر ان کا مزاج سیاسی نہیں تھا، اس لیے اپنے زمانہ کی موجودہ سیاست سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کی، لیکن ملکی اور قومی مفاد کے پیش نظر رفتہ رفتہ سیاست کی طرف مائل ہونے لگے۔

مولانا دریابادیؒ اپنے خیالات کی تبدیلی اور کانگریس کی طرف میلان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''جب اپنے ہوش کی آنکھیں کھلیں تو مسلمانوں کی مسلم پالیسی سرکار انگریزی کی تائید و وفاداری کی پائی۔میٹرک پاس کر کے (جون ۱۹۰۸ء) تک اپنا بھی یہی رنگ ماحول کی تقلید میں رہا۔کالج میں آنے اور لکھنؤ میں قیام کے بعد جب ''آزادی'' کی ہوا لگی تو اپنے خیالات بھی بدلنے اور کانگریس کی طرف مائل ہونے لگے۔دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں خوب دھوم دھام سے ہوا، اس میں شریک ہوا مگر محض تماشائی کی حیثیت سے صرف جلسہ کی سیر اور بہار دیکھنے''۔[۶۳]

مولانا دریابادیؒ مولانا محمد علی جوہرؒ کے طرزِ سیاست سے بہت متاثر تھے۔ان کی ذات سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔زندگی بھر ان کو اپنا پیشوا سمجھتے رہے۔سیاسی لیڈروں میں مولانا محمد علی جوہرؒ کے علاوہ گاندھی

جی کی شخصیت اوران کی تعلیمات سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ مولانا دریابادیؒ گاندھی جی کی خداپرستی، سادگی، قناعت، حق پرستی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا تذکرہ اپنی تحریروں میں بار بار کرتے تھے۔ مولانادریابادیؒ کے کانگریس میں شامل ہونے کی بنیادی وجہ مولانا حسین احمد مدنیؒ اوراکابر جمعیۃ علماء ہنداور چند سیاسی لیڈران تھے۔ ورنہ مولانا نے اپنے آپ کو علمی دینی، وادبی خدمات کے لیے وقف کررکھا تھا۔

۱۹۱۷ء میں جب برطانوی حکومت نے مسز اینی بیسنٹ کو گرفتار و یک بیک نظر بند کردیا تو اس پر برملا اپنے ردِّعمل کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''۱۹۱۷ء میں جب حکومت نے مسز بسنٹ جیسی آفاقی شخصیت رکھنے والی کوتحریک ہوم رول کے سلسلہ میں گرفتار ونظر بند کردیا، تو اس دھاکہ سے سارا ملک دہل گیا، اور مجھ پر بھی ایک جوش کا عالم طاری ہوگیا''۔٦٤

مولانا دریابادیؒ اس جوش اور ولولہ کے عالم میں بھی سیاست سے لاتعلق ہی رہے۔ غالبًا اس کی بنیادی وجہ حیدرآباد میں ملازمت کی مصروفیت رہی ہو۔

الغرض ۱۹۱۹ء میں ''تحریک خلافت'' اور ''تحریک ترک موالات'' کے جلسوں میں صرف شرکت کی غرض سے حاضر ہونے لگے۔ البتہ اس سلسلہ میں کوئی بڑا سیاسی عملی قدم نہیں اٹھایا، مولانا دریابادیؒ نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔

دسمبر ۱۹۲۵ء میں مولانا مولانا محمد علی جوہر کی تجویز واصرار پر صوبۂ اودھ خلافت کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے اور مولانا محمد علی جوہر کی زیرقیادت عملی سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لیا۔ فروری ۱۹۲۷ء میں خلافت کمیٹی کا لکھنؤ میں ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں مجلس استقبالیہ کی صدارت کے فرائض مولانا دریابادیؒ ہی نے انجام دیئے۔ انہوں نے ایک پُرجوش اور بہت ہی مؤثر خطبۂ صدارت پیش کیا جو اپنی معنویت وافادیت کے ساتھ ایک ادبی شہ پارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا دریابادیؒ نے اس موقع پر جو خطبۂ صدارت پڑھا اس میں خلافت کے بنیادی پہلوؤں اور سیاسی وملی مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی، خطبۂ صدارت پڑھتے وقت لوگ عش عش کرنے لگے اوراس کے اختتام پر سامعین نے دل کھول کر داد وتحسین سے نوازا، مولانا محمد علی جوہر اس خطبہ سے بے حد متاثر ہوئے، اور اسٹیج

سے کھڑے ہوکر مولانا دریابادیؒ سے معانقہ کیا، دونوں آنکھوں کے بیچ میں (ان کی پیشانی کو) بوسہ دیا، نہایت ہی شاندار اور فیاضانہ الفاظ میں داد وتحسین سے نوازا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے اس خطبۂ صدارت میں خلافتِ اسلامیہ کے بنیادی پہلوؤں کو ذکر کرتے ہوئے قومِ مسلم کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی کہ انسان کو خلافت سے عار اور شرم نہیں آنا چاہئے بلکہ انسان کی حیثیت سے اس کائنات میں خلیفۃ المسلمین کے سوا کچھ نہیں، مولانا دریابادیؒ کے خطبہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''بزرگو! دوستو اور عزیزو! آج مختلف سمتوں سے یہ صدائیں بلند ہورہی ہیں کہ ''اب خلافت کمیٹی کی ضرورت کیا باقی رہی؟ اور اگر کچھ ضرورت باقی بھی ہو تو یہ کیا ضروری ہے کہ اس کو اسی نام کے ساتھ باقی رکھا جائے؟'' حیران ہوں کہ ان سوالات کا کیا جواب دوں! اس سے بڑھ کر حیرانی یہ ہے کہ یہ سوالات کسی مسلمان کے دماغ میں پیدا کیوں کر ہوئے۔ جس انسان کو خلافت سے عار آتا ہے درحقیقت اسے خود اپنے وجود سے عار آنا چاہئے کہ انسان کی حیثیت اس کائنات ارضی میں بجز خلیفہ کے اور کچھ نہیں ''قرآن میں'' یہ نہیں ارشاد ہوتا ہے کہ انسان کو حاکم پیدا کیا جائے گا، عالم پیدا کیا جائے گا، شاعر پیدا کیا جائے گا، فقیہ پیدا کیا جائے گا''۔[٦٥]

الغرض مولانا دریابادیؒ عملی میدان سیاست میں تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے مشہور ہوئے اور کچھ عرصہ تک سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا، اور اپنی ہمہ گیر شخصیت کے نقوش تاریخ کے صفحات پر چھوڑ گئے۔ مولانا دریابادیؒ کی سیاسی تربیت اور واقفیت میں مولانا محمد علی جوہر کی صحبت وطرز سیاست کا بڑا ہی اہم رول رہا ہے۔ مولانا دریابادیؒ نے اکثر اپنی تحریروں میں اس کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔

<u>١٩١٩ء</u> سے <u>١٩٢٤ء</u> تک پورے ہندوستان میں تحریکِ خلافت کا زور وشور خوب رہا بلکہ ہر ہندوستانی بچے کی زبان پر خلافت تحریک کا نام زبان زد تھا لیکن <u>١٩٢٤ء</u> کے بعد ختم ہوگیا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''تحریکِ خلافت کا زور <u>١٩٢٤ء</u> ہی میں گھٹ گیا تھا۔ اور <u>١٩٢٨ء</u> میں تو تحریک نیم مردہ ہوچکی تھی''۔[٦٦]

مولانا دریابادیؒ نے خلافت کمیٹی کے بعد کسی بڑی سیاسی جماعت اور اس کے جلسوں میں شرکت نہیں کی بلکہ مولانا محمد جوہر کے سانحۂ ارتحال کے بعد سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی، حالانکہ اس وقت انڈین

نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ میدانِ سیاست میں موجود تھیں۔

خود مولانا دریابادیؒ اپنے الفاظ میں رقم طراز ہیں کہ:

''مولانا محمد علیؒ کی زندگی بھر انہیں اپنا سیاسی پیشوا سمجھتا رہا۔ ان کے فہم واخلاص دونوں پر سو فیصدی اعتماد تھا۔ ان کے بعد سے کوئی لیڈر راس پایہ کا نہ ملا، اور اسی لئے بعد کی کسی تحریک مسلم لیگ وغیرہ میں عملاً نہ شریک ہوا۔ گو اعتماد بہادر یار جنگ (متوفی ۱۹۴۲ء) اور چودھری خلیق الزماں (متوفی ۱۹۵۸ء) پر بعد کو برابر رہا''۔ ٦٧

## مولانا دریابادیؒ اور صحافتی اسلوب ومنہج :

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں فکر وتجسس کی عادت وخصلت رکھی ہے۔ اسے اپنے گرد وپیش کے احوال وکوائف کے بارے میں جاننے اور باخبر رہنے کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کب ہوا؟ کس نے انجام دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ عرف عام میں انسان کے ذہن ودماغ میں اس طرح کے آنے والے سوالات اور استفسارات کے بارے میں اطلاعات، خبر رسانی، اور حصول معلومات کا نام ہی صحافت ہے۔

عصرِ حاضر میں صحافت اور میڈیا یا ذرائع ابلاغ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس کے فائدے بھی بے شمار ہیں تو نقصانات بھی کچھ کم نہیں۔ اگر اس کا صحیح طریقے پر استعمال کیا جائے تو یہ بابرکت مقدس مشغلہ ہی نہیں بلکہ جمہوری اقدار اور انسانی تحفظ کی ضامن ہوتی ہے، اور مظلوم ومجبور عوام کے جذبات واحساسات کی مؤثر ترجمانی کرتی ہے۔ مزید برآں ظالم وجابر حکومتوں کو تہہ وبالا کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔

ایک صالح وامین صحافی قوم وملت کا ترجمان ہی نہیں، بلکہ مظلومین کا سہارا ہوتا ہے۔ عوامی مسائل کو اُجاگر کرنے اور معاشرے کی تشکیل میں اپنا مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ وہیں بعض ذرائع ابلاغ بالخصوص کچھ ٹی وی چینلز ذاتی مفاد اور سستی شہرت بڑھانے کی خاطر ایمان وضمیر اور جملہ اقدار پسِ پُشت ڈال دیتے ہیں۔ مبالغہ آمیزی اور شر انگیزی سے کام لیتے ہیں۔

## صحافت کے لغوی معنیٰ :

لفظ صحافت عربی زبان کا لفظ ہے جو صحف سے ماخوذ ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں لکھا ہوا کاغذ، کتاب، یا رسالہ، یعنی ایسا مطبوعہ مواد جو مقررہ وقفوں کے بعد شائع ہوتا ہے اسے صحافت کہتے ہیں۔ اردو اور

فارسی میں یہی اصطلاح رائج ہے، جبکہ انگریز زبان میں صحافت کا مترادف جرنلزم (Journalism) مستعمل ہے۔

عربی کی مشہور لغت المنجد میں اس کے معنی یہ ہیں:

"الصحافة" "خبارنویسی" "عالم الصحافة" "خبارنویس لوگ" "الصحیفه" لکھا ہوا کاغذ کا ورق" ۔ ٦٨

جب صحافت کا آغاز ہوا تو اس اصطلاح کا اخبار یا رسالے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ زمانۂ قدیم میں صحف اور صحائف کی اصطلاح مقدس کتب یا اسمانی تحریروں کے لیے مخصوص تھیں۔ مقدس کتب یا آسمانی صحائف کے قلمی نسخے تیار کرنے والے کو خوشنویس صحافی کہتے تھے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں صحافت کی اصطلاح ان تمام اجزاء کو محیط ہے جن کے توسط سے اطلاعات عوام الناس تک پہنچتی ہیں۔

صاحب المعجم الوسیط نے صحافت کی تعریف بیان کی ہے:

"الصحافة مهنته من يجمع الأخبار والا راء وينشرها فى صحيفة اومجله والنسبة اليها: صحافى"

"صحافت ایک ایسا پیشہ ہے جس میں اخبار و آراء کو جمع کر کے کسی مجلّہ یا رسالہ میں شائع کیا جاتا ہے اور جو لوگ اس سے وابستہ ہوں، انہیں صحافی کہا جاتا ہے" ۔ ٦٩

مولانا امداد صابری "صحافت" کے معنیٰ و مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"صحافت کا لفظ "صحیفہ" سے نکلا ہے۔ "صحیفہ" کے لغوی معنیٰ ہیں۔ کتاب یا رسالہ۔ بہر حال عملاً صحیفہ سے مراد ایسا مواد ہے جو مقررہ وقفوں کے بعد شائع ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام اخبار اور رسالے صحیفے ہیں۔ جو لوگ ان کی ترتیب و تحسین اور تحریر سے وابستہ ہیں انہیں صحافی کہا جاتا ہے اور ان کے پیشے کو صحافت کا نام دیا گیا ہے۔ صحافت کا مترادف انگریزی لفظ جرنلزم (Journalism) ہے جو (جرنل) سے بنایا گیا ہے۔ جرنل کے لغوی معنیٰ ہیں۔ روزانہ حساب کا بہی کھاتا یعنی روزنامچہ، جرنل کو ترتیب دینے والوں کے لیے جرنلسٹ کا لفظ بنا اور اس پیشے کو جرنلزم کا نام دیا گیا" ۔ ٧٠

عبدالسلام زینی اپنی کتاب "اسلامی صحافت" "صحیفہ" اور "صحافی" کے ربط و تعلق کی وضاحت کرتے ہیں کہ:

''صحافت اور صحافی کے الفاظ یوں تو عربی زبان کے لفظ صحیفہ سے نکلے ہیں، لیکن ہمارے ہاں انگریزی کے الفاظ جرنلزم (Journalism) اور جرنلسٹ (Journalist) کے ترجمے کے طور پر ہی رائج ہوئے ہیں۔ صحافت اگرچہ مؤقت الشیوع یعنی وقفوں سے شائع ہونے والے اخبار یا رسالے (Periodicals) کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اب ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی خبریں اور حالات حاضرہ پر تبصرے، انٹرویوز اور فیچر نشر ہوتے ہیں اور ان کی ترتیب و تزئین بھی صحافی ہی کرتے ہیں، اس لیے صحافت کی اصطلاح کا اطلاق اس کام پر بھی ہوتا ہے''۔ اے

حالیہ برسوں میں ٹیکنالوجی میں نت نئی ترقی اور جدت بہت تیزی سے رونما ہوئی ہے۔ نتیجتاً صحافت بھی ارتقاء کے مراحل سے گزر کر جدید روپ اختیار کر چکی ہے اور اس کا دائرہ کار کافی وسیع ہو گیا ہے۔ لہٰذا اب ''صحافت'' کے قائم مقام ایک وسیع اصطلاح ''ابلاغیات'' مستعمل ہونے لگی ہے جو ذرائع ابلاغ و ترسیل یا وسائل الاعلام (Media) کی جملہ اقسام سے بحث کرتی ہے۔

ذرائع ابلاغ و ترسیل کے حوالے سے صحافت کی تین اہم اور بنیادی اقسام ہیں۔

''برقیاتی صحافت'' جسے ہم عام طور پر الیکٹرانک میڈیا (Electronic Media) یا برقیاتی ذرائع ابلاغ سے جانتے ہیں۔ کیونکہ یہ الیکٹرانکس اور الیکٹرو میکینیکل قوت کے استعمال سے چلتے ہیں اس میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی گراف، سینما، سیڈیز، ڈی وی ڈیز، کمپیوٹرز، لیپ ٹاپس، انٹرنیٹ، موبائل فون وغیرہ سبھی شامل ہیں۔

مطبوعہ صحافت'' جسے ہم عام طور پر پرنٹ میڈیا (Print Media) بھی کہتے ہیں۔ یعنی طباعتی یا تحریری ذرائع ابلاغ، مطبوعہ صحافت سے مراد شائع اور طبع ہونے والے اخبار و رسائل ہیں جیسے اخبارات و جرائد کتب و پمفلٹس ماہ نامہ پندرہ روزہ، سال نامہ، اور مجلّات و ڈائجسٹس۔

سوشل میڈیا یا سماجی ذرائع ابلاغ (فیس بک، ٹویٹر، گوگل، پلس، یوٹیوب وغیرہ کا نام بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ الغرض حالیہ اوقات میں صرف مطبوعہ یا قلمی ہی نہیں بلکہ صوتی، سمعی، بصری اور برقی یعنی جملہ ذرائع ابلاغ و ترسیل کے توسط سے حالات حاضرہ، خبروں، تبصروں، پیغامات، واقعات کی نشر و اشاعت ''صحافت'' ہی کے زمرے میں آتی ہے۔ عصر حاضر میں میڈیا نے پروفیشن، مستقل فن اور ایک سائنس کی

صورت اختیار کی ہے بلکہ اس کو اگر با قاعدہ صنعت یعنی میڈیا انڈسٹری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی متنوع علمی وادبی خدمات میں صحافت کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔ اور اس خصوصی وصف نے آپ کو صحافت کا شہنشاہِ اعظم بنا دیا ہے۔ انہوں نے جس وقت میدانِ صحافت میں قدم رکھا اس وقت سرزمین ہند کی بے شمار نابغۂ عظیم علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتیں صحافت کے افق پر اُبھر کر سامنے آئیں ان کی ضوفشانی سے مطلع صحافت جگمگا رہا تھا۔

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں ہندوستانی عوام پر زبردست ہیجانی اور التہابی کیفیت طاری تھی۔ سامراجی استبداد اور فرنگی استعمار نے پورے ملک کو اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا۔ ایسے پرآشوب حالات میں جاں نثار وطن صحافیوں نے کمر ہمت باندھی اور وطن عزیز کو دشمن کے پنجۂ ظلم وستم سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ جن میں سرفہرست مولانا ابوالکلام ازاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، فانی بدایونی، خواجہ حسن نظامی، عبدالماجد دریابادیؒ، یاس چنگیزی، پریم چند، رام بابو سکسینہ، فراق گورکھپوری کا تذکرہ آتا ہے۔

اس عہد زرّیں کے یہ وہ اسمائے گرامی ہیں جو بغیر کسی تلاش وجستجو کے نوک قلم پر آ گئے، ورنہ اس زمانہ کے صحافیوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو اپنے معاصرین میں باعتبار ''وصف صحافت''۔ انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس وصف میں بالکل الگ شناخت اور امتیازی شان کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنی انشاء پردازی سے اس وصف کو نئی جہت اور طرزِ نو بخشی ہے اور صنف صحافت کے نئے نئے زاویوں سے تعارف کرایا ہے۔

مولانا دریابادی نے صحافت اور مضمون کا آغاز ۱۹۰۴ء میں کیا تھا جب کہ ان کی ان عمر بارہ سال کی تھی اور ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ چنانچہ ان کا پہلا مضمون روزنامہ ''اودھ اخبار'' لکھنؤ میں شائع ہوا، جو انہوں نے مذہب اسلام کی مدافعت میں لکھا تھا مولانا نے اس کی اشاعت کے بعد بڑی خوشی کا اظہار کیا، چنانچہ اپنی آپ بیتی میں رقم طراز ہیں کہ :

> ''ساتویں کا طالب عالم تھا، اور عمر کے گیارہویں بارہویں سال، جوں توں کر کے خود ہی جواب لکھا اور کسی فرضی نام سے ''اودھ اخبار'' میں (کہ'' وہی اس وقت صوبہ کا سب سے نامور اردو روزنامہ

تھا) چھپنے کو بھیج دیا اور اب کیا بیان ہو کہ کتنی خوشی اس وقت (۱۹۰۴ء میں) اپنا پہلا مضمون چھپا ہوا دیکھ کر ہوئی''۔۲؎

اس کے بعد انگریزی اور اردو کے مشہور اخباروں اور جریدوں میں مذہبی، علمی اور ادبی مضامین بہ کثرت لکھتے رہے اور ایک عرصہ تک اپنے نام کو صیغۂ راز میں رکھا۔ جن اخبارات و رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان میں اودھ ''اخبار لکھنؤ'' ''ریاض الاخبار'' گورکھپور'' ''ضیاء الاسلام'' ''صبح امید'' ''العصر'' ''معارف'' ''ہمدم'' ''الناظر'' اور ہمدرد کو غیرہ کا نمایاں طور پر ذکر ملتا ہے۔

اس کے علاوہ انگریزی اخبار و رسائل میں مراسلات و مضامین اور تبصرے لکھتے رہے۔ انگریزی اخبار وجرائد میں بھی اپنے قلم سے انگریزی زبان و ادب کے جوہر بکھیرتے رہے۔ مولانا دریابادیؒ نے ۲؍جنوری ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ سے ہفتہ وار ''سچ'' شائع کیا، یہ ہر جمعہ کو الناظر پریس لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا، مولانا دریابادیؒ بھی اس شمارے میں بہ حیثیت شریک ادارت شامل تھے۔ اس کے بعد ہفتہ وار ''سچ'' بہ وجوہ بند ہو گیا اور کچھ مدت کے بعد ''صدق'' اور پھر ''صدق جدید'' کے نام سے ان کی وفات ۶؍جنوری ۱۹۷۷ء تک بڑی پابندی سے طبع ہو کر شائع ہوتا رہا۔ مولانا دریابادیؒ کی صحافتی خدمات تقریباً باون برس کی مدت پر مشتمل ہے۔

مولانا دریابادیؒ اردو صحافت کے متعلق رقم طراز ہیں کہ :

> ''اردو صحافت محض اردو زبان کی صحافت نہیں، اردو کلچر کی مظہر و ترجمان ہے، اردو محض ایک زبان کا نام نہیں، اردو کلچر یا تہذیب خود ایک مستقل چیز ہے۔ اردو تہذیب کا آئینہ ہے اور اس آئینے کی ساری جلا صرف ایک لفظ شرافت کے اندر مضمر ہے۔ حیدرآبادی تہذیب، لکھنؤ تہذیب، اسی جوہر شرافت کی یادگار تھی۔ وہ جب مٹتی ہے تو ہر شریف کو اس کے مٹنے کا رنج ہوتا ہے''۔۳؎

مولانا دریابادیؒ نے معیاری صحافت کے کچھ بنیادی اصول و ضوابط اور مقاصد بیان کیے ہیں۔ ان اصول و ضوابط کی پاسداری سے ذمہ دارانہ صحافت اور مثبت طرزِ فکر کو فروغ دیا جا سکتا ہے اور ملک و قوم کی اصلاح اور تعمیر و ترقی کا فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ مولانا دریابادیؒ کے نظریۂ صحافت جاننے کے لیے خود مولانا ہی کی ایک چشم کشا اور بیش قیمت تحریر ملاحظہ ہو۔ مولانا کا یہ مضمون مورخہ ۲۹؍مارچ ۱۹۶۸ء کو ''صدق جدید'' لکھنؤ میں ''ہفتہ وار صحافت کے آداب'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

(۱) مقصود خدمت دین وملت رکھیے۔ عام خدمت خلق بھی اسی کے تحت میں آ جاتی ہے۔

(۲) وطن کا بھی بڑا حق ہوتا ہے۔ جس طرح حق پڑوس، استاد کے اور اہل خاندان کے ہوتے ہیں۔ البتہ مسلمان ''پرستار'' وطن کا نہیں ہوسکتا۔ عبودیت کا یہ خصوصی تعلق تو صرف ذات حق کے لیے مخصوص ہے۔ اس کی مخلوق میں سے کسی کے حصّے میں نہیں آ سکتا۔

(۳) خبر برائے خبر کا روزناموں میں جو بھی درجہ ہو ہفت روزہ میں تو یہ ایک تقریباً مہمل چیز ہوگی۔ ہفت روزہ میں اپنے تبصرے سے یا کم سے کم خبر کی سرخی ہی سے ہر خبر کو با مقصد بنا کر پیش کیجئے۔

(۴) پبلک کے جذبات کی محض نمائندگی پر ہرگز اکتفا نہ کیجئے۔ پبلک کے مذاق اور جذبات کی اصلاح کی کوشش بھی ہمیشہ جاری رکھیے۔

(۵) اپنی مقبولیت اور مرجعیت کا خیال کسے نہیں ہوتا؟ ایک حد تک یہ خیال بالکل قدرتی ہے لیکن اس جذبے کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھتے اور اپنے اوپر غالب ہرگز نہ آنے دیجئے۔

(۶) صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں ایک قسم کی عبادت ہے۔ بس اسی کو نصب العین بنا کر ہمیشہ اپنے سامنے رکھیے۔

(۷) دوسروں کا احتساب ہر پبلک معاملے میں ضرور کیجئے، لیکن اپنے کو کبھی احتساب سے بالا نہ کیجیے۔ احتساب نفس کو سب پر مقدم رکھیے۔

(۸) بلا وجہ معقول کے، کسی کی دل آزادی کے کیا معنیٰ، دل شکنی بھی گوارا نہ کیجئے اور مروت کے بھی حدود قائم کر لیجئے۔ ان سے آگے قدم نہ رکھیے۔

(۹) ملک کی اکثریت اور حکومت وقت کے قانون کا ضرور لحاظ رکھیے۔ حتی الامکان راہ سلامت روی کی اختیار کیجئے، لیکن مرعوبیت اور احساس کم تری کی حد تک ہرگز نہ پہنچ جایئے۔ صلح وسازگاری دوسری چیز ہے اور بزدلی اور خوشامد بالکل دوسری۔

(۱۰) بلا وجہ نہ کسی سے الجھیے، نہ خواہ مخواہ تکرار پیدا کیجئے، لیکن دوسری طرف جھکیے اور گریے بھی نہیں۔

(۱۱) پبلک تنقید آزادی سے کیجئے، لیکن ذات پات اتر آنے سے اپنے کو اہتمام کے ساتھ بچایئے۔ کسی کے نسب پر، وطن پر یا شکل وصورت پر طنز کرنا سب ذاتیات ہی کی شکلیں ہیں۔

(۱۲) مزاح، شگفتگی خوش طبعی علامتیں شرافتیں نفس کی ہیں اور تفضیح، تضحیک اور پھکڑ بازی علامتیں دنائت اور سفلہ پن کی۔ اس فرق عظیم کو ہمیشہ نظر میں رکھیے۔

(۱۳) آپ بھی بہرحال انسان ہی ہیں اور سارے بشری جذبات رکھنے والے، غصّے سے آپ بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ ایسے موقع پر نفس کو قابو میں رکھنا ہی آپ کی بلند کرداری کی دلیل ہوگی۔

(۱۴) دیانت کے امتحان بھی اس راہ میں سخت سے سخت آتے رہتے ہیں۔ اپنے کو بچانے کا اہتمام خاص رکھیے۔

(۱۵) غلطی کا امکان ہر بشر کی طرح آپ کے لیے بھی ہے۔ غلطی کا علم ہوجانے پر اس کے اعتراف سے اسے واپس لینے سے، اس پر معذرت کرنے سے شرمایے، جھجکیے نہیں۔

(۱۶) جس طرح زبان سے نکلی ہوئی ایک ایک بات محل گرفت ہوسکتی ہے۔ اسی طرح قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بھی جرح کی زد میں آسکتا ہے۔ خیال کیجئے اور ڈرتے رہیے اُس وقت سے، جب آپ کا سارا دفتر آپ کے سامنے ہوگا اور آخری اور حقیقی عدالت میں اس کے ایک ایک لفظ پر سوال ہورہا ہوگا''۔۴۹؎

مولانا دریابادیؒ عمر بھر ان پیش قیمت اصول وآداب پر عمل پیرا رہے اور اپنے اخبارات کو ان ہی اصولوں کی روشنی میں نکالتے رہے ان ''ماجدی صحافت'' کے اصول وضوابط کو حدود وقیود بھی کہا جا سکتا ہے جو صحافیٔ صادق وامین ان سولہ ماجدی صحافتی آداب کی رعایت کرے گا وہ یقیناً ایک کامیاب صحافی ہوگا۔

مولانا دریابادیؒ نے یہ اصول وضوابط اپنی زندگی میں ہفتہ وار صحافت کے تحریر کیے ہیں لیکن ان کی افادیت واہمیت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی پہلے تھی، بلکہ اگر ان اصولوں کو ''صحافتی اخلاقیات'' کے نام سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

مولانا دریابادیؒ کی ''صحافتی خدمات'' کے موضوع پر ڈاکٹر زبیر احمد صدیقی نے تحقیقی وتفصیلی مقالہ پیش کیا ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اس لئے اس موضوع پر مزید لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، فن صحافت کے طلبہ کے لیے یہ مقالہ بے حد معین و مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

# مراجع ومصادر


۱۔ عبدالماجد دریابادی، مولانا، آپ بیتی، مکتبہ الشباب العلمیہ، لکھنؤ، یو پی ۲۰۱۳ء، بار پنجم، ص:۲۲،۲۳

۲۔ منشی برج بھوکن لال محبّ، تاریخ دریاباد نامی پریس لکھنؤ ۱۹۲۵ء، ص:۹۹

۳۔ ایضاً، ص:۱۰۱

۴۔ آپ بیتی، ص:۲۵

۵۔ تاریخ دریاباد، ص:۸۷

۶۔ ایضاً، ص:۸۷

۷۔ ایضاً، ص:۸۷

۸۔ عبدالماجد دریابادی، صدق جدید، ۹/دسمبر ۱۹۵۵ء، ص:۶

۹۔ آپ بیتی، ص:۲۹

۱۰۔ ایضاً، ص:۳۴-۳۵

۱۱۔ ایضاً، ص:۵۱

۱۲۔ فروغ اُردو عبدالماجد دریابادی نمبر، ص:۹

۱۳۔ عبدالماجد دریابادی، غبارِ کارواں، فروغ اردو عبدالماجد دریابادی نمبر، اگست تا اکتوبر، ۱۹۷۱ء، لکھنؤ، ص:۱۱،۱۲

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۲

۱۵۔ آپ بیتی، ص:۱۹۴-۱۹۵

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۹۹

۱۷۔ عبدالماجد دریابادیؒ (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی، (نقوش آپ بیتی نمبر)، جون ۱۹۵۶ء، ص:۱۰۷۲-۱۰۷۴

۱۸۔ آپ بیتی، ص:۲۰۷

۱۹۔ آپ بیتی، ص:۲۰۷

۲۰۔ عبدالماجد دریابادیؒ، خطوط مشاہیر طبع ثانی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، طبع ثانی ۱۹۶۹ء، خط نمبر ۳، ص:۱۹۷

۲۱۔ عبدالماجد دریابادیؒ، مکتوبات سلیمانی، صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ۔ یو، پی، ۱۹۶۳ء، حصّہ اوّل، ص:۴۷

۲۲۔ آپ بیتی،ص:۲۰۸

۲۳۔ ایضاً،ص:۲۰۵

۲۴۔ ایضاً،ص:۲۰۸،مکتوبات سلیمانی جلد اول،ص:۱۸۱

۲۵۔ خطوط مشاہیر،ص:۲۵۔۲۶

۲۶۔ آپ بیتی،ص:۲۵۷

۲۷۔ ایضاً:۱۳۱

۲۸۔ ایضاً،ص:۱۳۴

۲۹۔ فروغ اردو(عبدالماجد دریابادیؒ نمبر)،اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء،لکھنؤ،ص:۲۱،۲۲

۳۰۔ سہ ماہی اکائی(اٹاوہ)،فروری،اپریل،۱۹۸۲ء،شمارہ:۳،ص:۳۰

۳۱۔ آپ بیتی،ص:۲۸۸

۳۲۔ عبدالعلیم قدوائی،مولانا عبدالماجد دریابادیؒ،حیات وخدمات،صدق فاؤنڈیشن،لکھنؤ،۲۰۰۹ء،ص:۱۷۔۲۷

۳۳۔ آپ بیتی،ص:۲۳۰

۳۴۔ عبدالماجد دریابادیؒ،(مترجم) دیباچہ مکالمات برکلے،معارف پریس، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (ہند)،بدون تاریخ،ص:۶،۲۰۱۱ء

۳۵۔ آپ بیتی،ص:۲۳۳

۳۶۔ عبدالماجد دریابادیؒ دیباچہ تاریخ اخلاق یورپ،انجمن ترقی اردو ہند،نئی دہلی ۱۹۱۹ء

۳۷۔ آپ بیتی،ص:۲۳۰۔۲۳۱

۳۸۔ تحسین فراقی،ڈاکٹر،عبدالماجد دریابادیؒ،احوال وآثار،ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲ کلب روڈ، لاہور ۱۹۹۳ء،ص: ۴۸۸۔۵۸۷

۳۹۔ ایضاً،ص:۹۵

۴۰۔ ایضاً،ص:۴۸۵

۴۱۔ ایضاً،ص۴۸۱

۴۲۔ عبدالماجد دریابادی،آپ بیتی،ص:۲۶۱

۴۳۔ ایضاً،ص:۲۶۲

۴۴۔ خطوط مشاہیر،(حصّہ اوّل)ص:۶۳۔۶۴

۴۵ ایضاً،ص:۶۵۔۶۶

۴۶ ایضاً،ص:۹۱

۴۷ آپ بیتی،ص:۲۳۴

۴۸ ایضاً،ص:۲۳۵

۴۹ عبدالماجد دریابادیؒ،مثنوی بحرالمحبت ،(طبع ثانی) معارف پریس اعظم گڑھ ۱۳۴۶ھ،ص:۴۔۵

۵۰ ڈاکٹر،عبدالماجد دریابادیؒ،احوال وآثار،ص:۵۰۱

۵۱ عبدالماجد دریابادیؒ،آپ بیتی،ص:۲۳۷۔۲۳۸

۵۲ ایضاً،ص:۲۳۸

۵۳ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ،حیات وخدمات،ص:۱۱۵

۵۴ آپ بیتی،ص:۲۹۳۔۲۹۴

۵۵ عطاء الرحمٰن قاسمی،(مرتب) کلیاتِ ماجدی،جلداوّل،قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی،۲۰۱۳ء،ص: ۱۲

۵۶ عبدالماجد دریابادی،محمد علی ذاتی ڈائری کے چندورق،صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ،۲۰۰۳ء،باب:۱۹،ص:۱۳۳،۱۳۴

۵۷ ایضاً،باب:۸۶،ص:۵۴۲

۵۸ ایضاً،باب:۳۱،ص:۱۹۴۔۱۹۵

۵۹ آپ بیتی،ص:۱۱

۶۰ ایضاً،ص:۲۳۹

۶۱ نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی،نقوش ماجدی، ناشر صدق فاؤنڈیشن ،خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ،گولہ گنج،لکھنؤ، ۲۰۱۴ء،ص:۱۱۱

۶۲ ڈاکٹر،عبدالماجد دریابادیؒ،احوال وآثار،ص:۴۴۲

۶۳ آپ بیتی،ص:۲۱۵

۶۴ ایضاً،ص:۲۱۶

۶۵ خطبۂ صدارت مجلس استقبالیہ آل انڈیا خلافت کانفرنس اجلاس چہاردہم منعقدہ ۲۶؍فروری ۱۹۲۷ء،لکھنؤ،ص:۳

۶۶ آپ بیتی،ص:۲۱۷

۶۷ ایضاً،ص:۲۱۷

۶۸ المنجد اردو، ناشر فرید بکڈ پو، بدون تاریخ ص: ۵۵۷
۶۹ المعجم الوسیط، مکتبہ زکریا دیوبند، بدون تاریخ ص: ۵۸
۷۰ امداد صابری، تاریخِ صحافت، مکتبہ انجمن اردو نئی دہلی، ۱۹۷۴ء ص: ۱۲۱
۷۱ عبدالسلام زینی، اسلامی صحافت، ادارہ معارف اسلامی، منصورہ ملتان روڈ، لاہور، باراول ۱۹۸۸ء ص: ۲۷
۷۲ عبدالماجد دریابادی، آپ بیتی ص: ۲۰۷
۷۳ عبدالماجد دریابادیؒ، سیاحت ماجدی، ناشر ادارۂ علم فرض، الفلاح ملیر ہالٹ کراچی ۲۰۰۱ء ص: ۱۶۶
۷۴ عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا، ہفتہ وار، صدق جدید: ۲۹/ مارچ ۱۹۶۸ء

# باب دوم

## علم تفسیر اور اس کا تعارف

**فصل اول:** تفسیر و تاویل کے لغوی معنی اور اصطلاحی تعریف

تفسیر و تاویل میں فرق

**فصل دوم:** تاریخ تفسیر کا ارتقاء و آغاز

**فصل سوم:** ہندوستان میں علم تفسیر

**فصل چہارم:** تفسیر ماجدی کی اجمالی خصوصیات،

منہج و اسلوب، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا لغت و متعلقات لغت،

قرآنی تفاسیر و متعلقاتِ تفسیر سے استفادہ

## فصل اول:

# تفسیر وتاویل کے لغوی معنی اور اصطلاحی تعریف، تفسیر وتاویل میں فرق

### تفسیر کے لغوی معنیٰ اور اصطلاحی تعریف:

تفسیر کا مادہ ''ف،س،ر'' ہے، اور یہ باب تفعیل کا مصدر ہے، جس کے معنی واضح کرنے اور کھولنے کے ہیں جیسا کہ احمد ابن فارس لفظِ تفسیر کی لغوی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''فسّرت الذراع ''[1] کے معنی بازو کھولنے کے ہیں۔علم تفسیر سے معانیٔ قرآن کی وضاحت ہوتی ہے۔صاحبِ لسان العرب ابن منظور الدمشقیؒ تفسیر کے لغوی معنی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''الفسر البیان،فسّرا لشئ ،یفسّر بالکسر ،ویفسّره بالضمّ فسراً،وفسره ابانه،والتفسیر مثله ، ثم قال الفسر کشف المغطی،والتفسیر کشف المراد عن اللفظ المشکل''[2]

[فسر کے معنی بیان کرنے کے ہیں۔کسی چیز کو کھولنا،یفسر فعل مضارع کسرہ اور ضمہ دونوں طرح مستعمل ہے اور مصدر فسراً ہے۔فسرہ کے معنی ہے اسکو بیان کرنا،تفسیر بھی اسی کے مانند ہے۔پھر صاحبِ لسان العرب فرماتے ہیں کہ فسّر کے معنی ڈھکے چھپے، پوشیدہ چیز کے کھولنے کے ہیں اور تفسیر کے معنی مشکل الفاظ کی مراد کھولنے کے ہیں۔]

یہ لفظ شروع میں علمی ، (Scientific) اور فلسفیانہ کتابوں کی تشریح وتوضیح کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن اب دنیائے اسلام اور مفسرینِ عظام کے نزدیک اس سے مراد قرآن کی تفسیریں اور خود فنِ علم تفسیر ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيراً[3]

[اور یہ لوگ جیسا بھی عجیب سوال آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں ہم اسکا جواب ٹھیک اور وضاحت میں بڑھا ہوا آپ کو بتا دیتے ہیں۔]

تفسیر کی اصطلاحی تعریف کے سلسلے میں علمائے اکرام نے مختلف باتیں لکھی ہیں،بعض علماء کہتے ہیں کہ تفسیر کے لئے کسی جامع اور مانع تعریف کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس علم کے لئے معین کردہ اصول وقواعد کی

ضرورت ہے،اس لئے کہ علومِ عقلیہ اور تفسیر کے مابین کوئی خاص مماثلت نہیں پائی جاتی ۔اس بنیاد پر اس علم کی تعریف کی ضرورت نہیں، مختصر الفاظ میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے جو قرآن کریم کے مشکل الفاظ و معانی کی وضاحت کرتا ہے جن علماء نے تفسیر کی تعریف بیان کی ہے وہ بھی کسی ایک جامع و مانع تعریف پر متفق نہیں ہے لیکن اگر ان سب اقوال پر غور و فکر کیا جائے تو سب کا ماحصل ایک ہی ہے،اس سلسلہ میں علامہ بدرالدین زرکشی کی تعریف بہت واضح ہے،ان کے الفاظ یہ ہیں:

''علم يفهمُ به كتاب الله المنزل علىٰ نبيه محمدﷺ وبيان معانيه ،واستخراج أحكامه وحكمه''۔[۴]

[تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کی مدد سے محمدﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کو سمجھا جائے،اس کی مرادات کو واضح کیا جائے اور اس سے احکام اور حکمتوں کا استخراج کیا جائے ،علماء نے تفسیر کی کئی تعریفیں کیں ہیں۔]

امام ابو حیان اندلسی رقمطراز ہیں کہ:

''علم يبحثُ فيه عن كيفية النطق بالفاظ القرآن ومدلولاتها وأحكامها الافرادية والتركيبية ومعانيها التى تحتمل عليها حالة التركيب وتتمات لذالك كمعرفة النسخ وسبب النزول وقصة توضح ماأبهم فى القرآن ونحوذلك''۔[۵]

[تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں الفاظ قرآنی کی (صحیح) ادائیگی ،ان کے مطالب و مفاہیم ،ان کے افرادی اور ترکیبی احکامات اور اُن کے معانی سے بحث کی جاتی ہے،جن پر ترکیبی حالت بنی ہوتی ہے اور اُن سے متعلق دیگر تتماتی و تکمیلی علوم پر بھی غور و فکر کیا جاتا ہے۔]

تفسیر قرآن سے متعلق ان مختلف تعریفات کا ماحصل ایک ہی ہے، کہ قرآنی آیات کے معانی واضح کرنے کا نام تفسیر ہے۔

## تاویل کے لغوی معنی اور اصطلاح مفہوم:

تفسیر سے قریبی ایک اور لفظ ''تاویل'' ہے اور یہ باب تفعیل کا مصدر ہے اس کا مادہ ''اوّل'' ہے جس کے معنی رجوع کرنے کے ہیں جب کسی کلام کی توضیح و تشریح کرنی ہوتی ہے، تو الفاظ کے واسطہ سے معانی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔اسی مناسبت سے تشریح قرآنی کے لئے تاویل کا لفظ مستعمل ہونے لگا۔

ابن منظور لکھتے ہیں کہ:

التـاويـل:الاول:الـرجـو ع:أل الشـئـي يـوول اولاً مـألاً رجـع واول اليه الشئی:رجعه اوله تأوله۔[6]

[اوّل کے معنی (فسرہ) رجوع کے ہیں،انجام اور لوٹنا بھی اسکے معنی ہیں اولہ وتأ ولہ کے معنی فسّرہ کے ہیں۔]

**قاضی ابوالبقاءایوب ''تاویل'' کے لغوی معنی بیان کرتے ہیں کہ:**

والتاويل فی اللغة من الاوّل وھوالانصراف [7]

[تاویل کا لفظ اُول سے ماخوذ ہے اور تعدیۂ باب تفعیل کے لحاظ سے اس کے معنی ہیں پھیرنا۔]

**امام راغب اصفہانی ''تاویل'' کی لغوی تشریح بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:**

التـاويـل مـن الاول ،أی الرجوع الی الاصل ومنه الموئل الموضع الذی يرجع اليه وذلك هو ردالشیٔ الی الغاية المرادمنه علماً كان أو فعلاً۔[8]

[التاویل یہ اول سے مشتق ہے جس کے معنی اصل کی طرف رجوع کرنے کے ہیں اسی لئے مرجع کے یعنی جائے بازگشت کو موئل کہا جاتا ہے۔لہٰذا تاویل کے معنی کسی شئی کو اس کی غایت کی طرف لوٹانے کے ہیں جو اس سے مقصود ہو خواہ وہ چیز علم سے متعلق ہو یا فعل سے۔]

## تاویل کی اصطلاحی تعریف:

**علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م۹۱۱ھ) تاویل کی اصطلاحی تعریف یوں بیان کرتے ہیں کہ:**

"التاويل توجيه لفظ يتوجه الیٰ معان مختلفة الیٰ واحدٍ منها بماظَهَرَ من الادلة" [9]

[تاویل کسی لفظ کے مختلف معانی میں سے کسی ایک معنی کو ظاہری دلائل کی بنیاد پر ترجیح دینے کا نام ہے۔]

**علامہ آلوسیؒ تاویل کا اصطلاحی مفہوم لکھتے ہیں کہ:**

والتاويل اصله من الأوّل وھوالرجوع فكانه صرف الآية الی ماتحتمله المعانی۔[10]

[تاویل کا اصل اوّل ہے اس کے معنی رجوع کرنے کے ہیں گویا ہر آیت کو اس طرف پھیر دینا جس چیز کے معانی احتمال رکھتے ہیں۔]

**اس میں اختلاف ہے کہ اصطلاحی اعتبار سے تفسیر اور تاویل ایک ہی ہے یا دونوں میں کچھ فرق ہے۔**

## تفسیر وتاویل میں فرق:

تاریخی لحاظ سے غالباً تیسری یا چوتھی صدی ہجری تک ان دونوں لفظوں کو ایک یا دوسرے کا مترادف سمجھا جاتا تھا؛ لیکن بعد کے ادوار میں ان دونوں اصطلاحات کے درمیان یہ فرق کر دیا گیا کہ تفسیر کا تعلق آیات کے متبادر معنی کو بیان کرنے اور آیات کے واضح مفہوم کو نقل کرنے سے ہیں، جب کہ تاویل میں ایک سے زیادہ معانی کا احتمال ہو، ان میں سے ایک معنی کو متعین کرنے سے ہے۔ یہ صرف تعبیری اختلاف ہے، قرآن کی تشریح وتوضیح پر اس اختلاف کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

فصل دوم:

# تاریخ تفسیر کا ارتقاء وآغاز

## تفسیر عہد نبوی ﷺ میں:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید نازل کیا اوراس کی بڑی حد تک تشریح وتوضیح کردی لیکن پھر بھی جو باتیں قابلِ وضاحت رہ گئیں ان کی وضاحت کے لئے مفسر مقرر کردیا۔

قرآن مجید کے اول مفسّر قرآن حضور ﷺ اور پہلی تفسیر احادیث نبویہ ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں قولاً وعملاً قرآن کی مکمل تفسیر بیان کردی۔ آپ ﷺ کی زندگی آیات قرآنیہ کی جیتی جاگتی تصویر اور مجسم قرآن ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ارشاد حدیث میں ہے کہ:

"فان خلق رسول الله ﷺ كان القرآن"[11]

[پس بیشک رسول اللہ ﷺ کے اخلاق قرآن ہی تو تھے۔]

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ [12]

[اور آپ ﷺ کی طرف قرآن نازل کیا ہے تا کہ آپ ان کی طرف جو کچھ بھیجا گیا ہے اس کی وضاحت کردیں اور شاید وہ غور وفکر سے کام لیا کریں۔]

قرآن مجید ایک کتاب ہدایت ہے جس کا اولین مقصد نسل انسانی کو صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دینا ہے جس میں دنیا وآخرت کی فلاح و بہبود ہے۔

قرآن کریم محمد ﷺ پر ایسے زمانے میں نازل ہوا جب افق عالم پر کفر وشرک اور ضلالت وگمراہی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سابق انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات مسخ ہوچکی تھیں ایسے وقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی آخر الزماں محمد ﷺ کو اپنی آخری کتاب (قرآن مجید) کے ساتھ مبعوث فرما کر اپنے بندوں پر احسان عظیم فرمایا۔

ارشاد ربانی ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُواْ مِن قَبْلُ لَفِي ضَلالٍ مُّبِينٍ ۱۳؎

[اللہ نے یقیناً مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں ان ہی میں سے رسول بھیجا، جو ان کو آیات الٰہی پڑھ کر سنائیں، ان کو پاک صاف کریں اور انہیں کتاب (یعنی قرآن مجید) اور عقل کی باتیں سکھائیں؛ حالاں کہ یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔]

تعلیم کتاب وحکمت سے مراد یہ ہے کہ جو باتیں اس میں قابل تشریح وتفصیل ہیں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے مطالب کھول کر بیان کرتے اور قرآنی آیات کے فہم وادراک میں صحابۂ کرامؓ کو جب مشکلات در پیش ہوتیں تو آپ ﷺ ان کی تشریح وتوضیح فرما دیا کرتے تھے۔

اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ جب یہ آیت کریمہ ''الَّذِينَ آمَنُواْ وَلَمْ يَلْبِسُواْ إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُوْلَئِكَ لَهُمُ الأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ'' ۱۴؎ نازل ہوئی تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا:

اینا لم یظلم فا نزل الله ان الشرك لظلم عظیم ۔۱۵؎

[یعنی آپ ﷺ نے ظلم کی تفسیر شرک سے فرمائی ہے۔]

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ذاك نهراعطانيه الله يعنى فى الجنة اشدبياضا من اللبن واحلى من العسل فيها طير اعناقها كأعناق الجزر ۔۱۶؎

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۱۷؎

[بیشک تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں عمدہ نمونہ ہے۔]

جیسا کہ قرآن کریم میں بار بار اقیموا الصلوٰۃ واتوالزکوۃ کا حکم اہل ایمان کو دیا گیا ہے لیکن اس کی کیفیت کا ذکر قرآن مجید میں صراحت سے نہیں ملتا۔ لیکن آپ ﷺ نے اپنے قول وفعل کے ذریعے اسی کی تشریح وتوضیح فرما دی۔ پس مذکورہ بالا احادیث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ آپ ﷺ قرآن کریم کے مفسر اول تھے۔

## تفسیر عہد صحابہؓ میں:

جب حضور اکرم ﷺ اس دنیائے فانی سے ۱۱ھ میں رحلت فرما گئے، تو آپ ﷺ کے وصال کے بعد صحابۂ کرامؓ کا دور شروع ہو گیا۔ اس وقت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زائد تھی۔
علامہ سیوطیؒ الاتقان فی علوم القرآن میں لکھتے ہیں کہ:

قبض النبی ﷺ و ترك مائة ألف و اربعة عشرالف من الصحابة۔ [۱۸]

[جب آنحضرت ﷺ نے وصال فرمایا تو اس وقت ایک لاکھ چودہ ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔]

آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرات صحابۂ کرامؓ نے قرآنی اسرار و رموز بالخصوص اس کی تفسیر کی طرف توجہ دی۔ پس اس کامل توجہ اور اہتمام سے قرآن کریم کی ایک ایک آیت سیکھتے تھے اور نبی اکرمؐ سے جب تک دس آیات اور ان کے علوم و معارف سے واقفیت حاصل نہ کر لیتے آگے نہ بڑھتے۔ لہٰذا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قرآن کریم کی وہی تفسیر و تشریح بیان کرتے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے، یا پھر نزول آیات کے اسباب انہوں نے خود ملاحظہ کئے ہوتے، یا جو بطریق اجتھاد و استنباط ان پر منکشف ہوتا۔

اس لئے صحابۂ کرامؓ میں ایک بڑی تعداد تھی جو قرآن کریم کی تفسیر و تشریح کرتی تھی؛ لیکن تفسیر قرآن کے سلسلہ میں دس صحابہؓ وہ ہیں جن کو اس فن میں امتیازی حیثیت حاصل تھی، ان کے نام حسبِ ذیل ہیں:

۱) حضرت ابوبکر صدیقؓ ۲) حضرت عمر فاروقؓ
۳) حضرت عثمان غنیؓ ۴) حضرت مرتضیٰؓ
۵) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ۶) حضرت عبداللہ بن عباسؓ
۷) حضرت ابی بن کعبؓ ۸) حضرت زید بن ثابتؓ
۹) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ۱۰) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ

پھر ان حضرات صحابۂ کرامؓ میں سب سے زیادہ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے تفسیری روایات منقول ہیں۔ تاہم رئیس المفسرّین حضرت

عبداللہ بن عباس کی روایات سب سے زیادہ ہیں ان کو نبی اکرمؐ نے ترجمان القرآن کے خطاب سے نوازا ہے، اوران کی تفسیری روایات ''تنویرالمقیاس'' کواولین تفسیر ہونے کا شرف حاصل ہے۔آنحضرتﷺ کے خادم خاص اورالسابقون الاولون میں شامل ہیں۔آپ کوہجرتین کا شرف بھی حاصل ہے۔تمام غزوات میں نبی کریمﷺ کے ساتھ شریک رہے علاوہ ازیں نبی کریمؐ نے اجازت دے رکھی تھی کہ ہمہ وقت پیغمبر خدا کی گفتگو سے فیض حاصل کرتے رہیں یہاں تک کہ میں خود ہی روک دوں۔حضرت علیؓ کوبھی تفسیر قرآن میں بلند مقام حاصل تھا،حضرت علیؓ کا علم تفسیر میں کیا مقام ومرتبہ تھا اس کا اندازہ حضرت طفیلؓ کی روایت سے ہوتا ہے کہ ایک روز آپ خطبہ دے رہے تھے،خطبہ کے دوران ارشاد فرمایا کہ:

سلونی فوالله لاتسئلون عن شیٔ الاأخبرتکم و سلونی عن کتاب الله فوالله مامن اٰیة الاوأنااعلم أبلیل نزلت أم بنهارأم فی جبل أم فی سهل۔[۱۹]

[تم مجھ سے پوچھو! تم جس چیز کے بارے میں پوچھوگے میں تمہیں بتادونگا مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھو، ہرآیت کے متعلق جانتاہوں کہ وہ رات کونازل ہوئی یادن کو، پہاڑ پرنازل ہوئی یامیدان میں۔]

توگویا کہ انہوں نے قرآن کریم کی تفسیر کے سلسلہ میں اپنی رائے سے کچھ کہنا ناپسند کیا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت میں ایسے صاحب علم اور مفسرّین حضرات موجود تھے جو سب سے پہلے رسول اللہﷺ کے اقوال دیکھتے،اوراس کی روشنی میں قرآن کی تفسیر وتشریح کرتے، جسے بعد میں ''تفسیر القرآن بالاحادیث'' کہہ کر تفسیر بالماثور کی دوسری قسم قرار دیا گیا۔اوراگران احادیث رسول میں کسی آیت کی تشریح نہ ملتی تو پھراجتھاد واستنباط کا طریقہ اختیار کرتے،اسی طریقۂ کار کو بعد '' تفسیر القرآن باقوال الصحابة رضی الله عنهم'' کہہ کر تفسیر بالماثور کی تیسری قسم متعین کرلیا گیا۔

## تفسیر عہد تابعین میں:

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد حضرات تابعین کا دور آتا ہے،ان حضرات کے دور میں بھی درس وتدریس اورنقل وروایت کے ذریعہ علم تفسیر کی اشاعت عمل میں آئی ہے،اسی وجہ سے ان حضرات کے دور میں صحیح معنوں میں تفسیر نگاری کی بنیاد پڑی۔عہد تابعین میں اہم تفسیری مراکز مکہ، مدینہ اورعراق تھے۔

مکہ معظّمہ میں عطاء بن رباحؒ، امام مجاہدؒ سعید بن جبیرؒ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے غلام عکرمہ اور طاؤس فن تفسیر میں زیادہ مشہور تھے، ان سب حضرات کو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے خصوصی شرف تلمذ حاصل ہے۔

مدینہ منورہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام زید بن اسلمؒ ابوالعالیہؒ اور محمد بن کعب قرظیؒ، حضرت ابی بن کعبؓ کے مشہور تلامذہ میں ہیں۔ حضرت زید بن اسلمؒ نے اپنے اصحاب کو تفسیر قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اکابر صحابہ کو پایا تھا آپ کے اصحاب و تلامذہ میں عبدالرحمٰن بن زیدؒ اور مالک بن انسؒ خاص شہرت کے حامل ہیں۔

عراق کی درسگاہ تفسیر کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے دست مبارک سے پڑی، جہاں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمرؓ کے تعمیل ارشاد میں تفسیری خدمات بحسن خوبی انجام دیتے رہے، اور یہاں کے ممتاز تلامذہ میں علقمہ بن قیسؒ، اسود بن یزیدؒ، ابراہیم نخعیؒ، علقمہ بن قیسؒ، مسروق بن اجدعؒ، مرہ ہمدانیؒ، عامر شعبی، حسن بصری، اور قتادہ رحمہم اللہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ عہد تابعین کے ان مفسرین کے اقوال کتب تفسیر میں درجۂ استناد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عہد تابعین میں روایتی تفسیر کے ساتھ ساتھ جہاں احادیث اور اقوال صحابہؓ نے جگہ پائی وہاں اسرائیلی روایات تفسیریں بکثرت داخل ہوگئیں؛ کیوں کہ مختلف اہل کتاب علماء مشرف بہ اسلام ہوئے جیسے وہب بن منبہ، عبداللہ بن سلام اور کعب الاحبار وغیرہ۔

مفسرین نے بلاتکلف اپنی سابقہ معلومات کو بھی قرآن مجید کی تشریح وتوضیح کے لئے استعمال کیا۔ اسرائیلی روایات اسلامی عقائد اور شرعی احکام کے خلاف ہوتیں تو ان پر عمل نہیں کیا جاتا۔ بلکہ قرآن وسنت کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کیا جاتا تھا۔ البتہ قصص قرآنی اور ابتدائے آفرینش سے متعلق جڑے واقعات کی تشریح وتوضیح کے لئے اہل کتاب صحابہؓ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ حضرات سابق انبیاء اور ان کی شریعت کے پیرو ہو چکے تھے؛ پھر اگر کوئی روایت قرآن وحدیث کے صریح الفاظ کے خلاف ہوتی تو اسے رد کر دیا جاتا۔

## تفسیر عہد تبع تابعین میں:

تفسیر کا تیسرا عہد تبع تابعین سے شروع ہوتا ہے یہی وہ عہد ہے جس میں اس فن کی تدوینی کوششوں کا آغاز ہوا اور باضابطہ تفسیری کتب مرتب ہوئیں۔

### اول مرحلہ:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی عہد تبع تابعین کے تفسیری مراحل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''محدثین نے کتب احادیث میں احادیث تفسیر کا باب قائم کیا اور تفسیر قرآن کے ذیل میں رسول اکرم ﷺ کے جو ارشادات اور صحابہ و تابعین کے جو اقوال منقول تھے، انہیں جمع کر دیا، ان محدثین عظام میں یزید بن ہارون سلمیؒ (متوفی: ۱۱۷ھ) شعبہ بن حجاجؒ (متوفی: ۱۷۰ھ) وکیع بن جراحؒ (متوفی: ۱۹۷ھ) سفیان بن عیینہؒ (متوفی: ۱۹۸ھ) عبدالرزاق بن ھمامؒ (متوفی: ۲۱۱ھ) وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اسی نہج کو بعد میں امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ وغیرہ نے بھی اختیار کیا''۔[۲۰]

### دوسرا مرحلہ:

اس مرحلہ میں پورے قرآن مجید کی تفسیر قرآنی آیات کی ترتیب کے مطابق مرتب ہونے لگیں۔
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دوسرے مرحلہ کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

> ''اس سلسلہ میں علامہ ابن ماجہؒ متوفی: ۲۷۳ھ)، ابن جریر طبریؒ (متوفی: ۳۱۰ھ)، ابوبکر بن منذر نیشاپوریؒ (متوفی: ۳۵۸ھ) ابن ابی حاتمؒ (متوفی: ۳۲۷ھ)، امام حاکمؒ (متوفی: ۴۰۵ھ) وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ان حضرات نے تفسیری روایات کو کتب احادیث کا جزء نہیں بنایا؛ بلکہ مستقل ایک فن کی حیثیت سے انہیں جمع کیا لیکن ان مجموعوں میں صرف تفسیری روایات کے نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا اور اس پر بحث و مناقشہ کی صورت عام طور پر اختیار نہیں کی گئی''۔[۲۱]

البتہ ابن جریر طبریؒ نے تفسیری اقوال نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دلائل اور وجہ ترجیح اور آیاتِ قرآنیہ سے احکام کا استنباط بھی کیا ہے۔ اور بعد میں آنے والے مفسرین نے بھی اسی نہج کو اختیار کیا جو امام طبری کا تھا۔

## تیسرا مرحلہ:

تیسرے مرحلہ کے متعلق آگے لکھتے ہیں کہ تیسرا مرحلہ:

''وہ ہے جس میں تفسیر بالمأثور منقولی تفاسیر کے ساتھ ساتھ تفسیر عقلی کو بھی شامل کیا گیا، یعنی صرف تفسیری احادیث اور صحابہ وتابعین کے تفسیری اقوال نقل کرنے کے بجائے اجتھاد واستنباط کے ذریعہ قرآن مجید سے اخذ کئے جانے والے احکام واشارات کو بھی تفسیر کا جزء بنادیا گیا۔ اس طرح فن تفسیر حدیث، لغت، قرأت، نحوی وصرفی ابحاث، معانی وبلاغت کے نکات، عقلی توجیہات، فقہی احکام، قصص وواقعات کے سلسلہ میں تاریخی شواہد وغیرہ کا ایک ایسا مجموعہ بن گیا جس میں ہر جہت سے قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے''۔ ۲۲

## فصل سوم:

# ہندوستان میں علم تفسیر

ہندوستان ایک تاریخی ملک ہے، تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کا گہوارہ رہا ہے، اس کی قدیم جغرافیائی تقسیم دو اجزا سندھ اور ہند پر مشتمل ہے، علاقۂ سندھ تہذیب وتمدن اور ثقافت وتہذیب میں ہند سے بالکل علاحدہ ہے۔

ہندوستان سے عربوں کے تعلقات بعض تجارتی قافلوں کی بنیاد پر قائم ہوئے تھے، اور اسلام اصلاً عرب تاجروں کے توسط سے کچھ ساحلی علاقوں میں پھیلا۔ خلافت راشدہ میں ہی مذہب اسلام کی نشر واشاعت عربوں اور مختلف قوموں میں ہوئی۔ مگر اس کا اکثر وبیشتر حصہ بعد کی کئی صدیوں تک اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہا۔

ولید بن عبد الملک کے زمانے میں سندھ اسلامی حکومت کا صوبہ بن گیا تھا۔ عرب تاجروں کے ذریعے جنوبی ہند میں بھی مسلمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی بعد کو درہ خیبر (پشاور) کی راہ سے مسلمانوں کا داخلہ ہندوستان میں شروع ہوا، اور اسلامی تعلیمات کی اشاعت وتعلیم کی ضرورت محسوس ہوئی، اس غرض سے فقہ وحدیث اور تاریخ وسیر کے ساتھ قرآن مجید کی تفسیریں بھی لکھی گئیں۔ لیکن ہندوستان میں تفسیر کا فن کب آیا؟ اور سب سے پہلے کس نے تفسیر لکھی؟ اس کی بالکل صحیح تعیین کرنا خاصا مشکل ہے اس لئے کہ ہندوستان کی کوئی ایسی تاریخ نہیں ہے جس میں شروع سے لے کر اب تک کے تمام حالات مع تصانیف وغیرہ کے تذکرے موجود ہوں مسلمان جہاں پہنچے ہیں قرآن کریم اور مسجد ساتھ لے کر گئے ہیں اسی بنیاد پر سندھ کے علاقے میں تفسیر قرآن کے مفسر گذرے ہیں مگر پہلا مفسر کون تھا؟ تاریخ اس سے بھی خاموش ہے۔

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ کشمیر کے ایک راجہ کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے قرآن مجید کی تفسیر مقامی زبان میں تصنیف کرائی تھی۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ (اردو انسائیکلو پیڈیا) کے مطابق عربی کی سب سے پہلی تفسیر "غرائب القرآن ورغائب الفرقان" از "مولانا نظام الدین حسن بن محمد بن حسین شافعی" ہے اس تفسیر کو دولت آباد (دکن) میں مکمل کیا گیا۔ اس کی جلد اول وسوم، ۷۳۰ھ/ ۱۳۳۰ء اور جلد دوم ۱۱ محرم الحرام ۷۲۸ھ/ ۱۳۲۷ء میں لکھی گئی۔ ۲۳؎

عبدالصمد صارم تاریخ التفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

> "ہندوستانی زبان میں سب سے پہلا ترجمہ ۲۷۰ھ میں راجہ مہروگ بن راگ نے امیر ابوالمنذر عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز فرمانروائے منصورہ کو لکھا کہ ہمارے پاس ایک ایسے مسلمان کو بھیج دو۔ جو ہم کو اسلامی اصول اور قرآن مجید کا ترجمہ ہماری زبان میں سمجھائے امیر نے ایک عراقی مسلمان کو بھیج دیا۔ جو بچپن سے ہندوستان میں رہا تھا اور یہاں کی زبان سے بخوبی واقف تھا۔ اس عراقی نے راجہ کے حکم سے سندھی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا جو سورۂ یٰسین تک ہی ہوسکا"۔ ۲۴؎

قرین قیاس ہے کہ مختلف مقامات پر جزوی طور پر مقامی زبانوں میں کام ہوئے ہونگے۔ لیکن اردو زبان میں ترجمہ قرآن کی روایت بہت بعد میں شروع ہوئی کیونکہ اردو زبان خود ایک نوزائیدہ زبان ہے، برصغیر پاک وہند کی مجموعی زبان اردو میں جس تفسیر کو سب سے پہلی تفسیر ہونے کا شرف حاصل ہے وہ تفسیر مراد یہ ہے۔

اردو زبان میں سب سے پہلے قرآن کریم کے ترجمہ کی داغ بیل کس نے ڈالی؟ اس سلسلہ میں اردو کے وقائع نگار اور تاریخ نگار الگ الگ باتیں کہتے ہیں۔

بیشتر لوگ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ترجمہ کو خشت اول قرار دیتے ہیں، مگر صحیح بات یہ ہے کہ اردو زبان میں سب سے پہلے شمالی ہند میں مولانا معظم نابھوی نے قرآن کا ترجمہ کیا، یہ ترجمہ ۱۷۱۹ء/ ۱۱۳۱ھ میں لکھا گیا، اگرچہ مکمل نہیں تھا، اور وہ بھی دہلی پر نادر شاہ کے حملے کے دوران آتش زنی میں ضائع ہوگیا، اس سے پہلے کسی اردو ترجمہ قرآن کا پتہ نہیں چلتا، اس کے بعد شیخ مراد اللہ سنبھلی نے قرآن کا ترجمہ وتفسیر "خدائی نعمت" کے نام سے ۱۱۸۵ھ میں رقم کیا، مگر یہ بھی مکمل نہیں ہوسکا، اس کا پارہ عم کا حصہ سب سے پہلے کلکتہ سے ۱۸۲۰ء کے قریب شائع ہوا تھا، پھر مطبع نول کشور اور دوسرے مطابع سے بھی شائع ہوا۔ شیخ مراد اللہ سنبھلی

پورے قرآن کا ترجمہ وتفسیر کرنا چاہتے تھے، سورۂ بقرہ اور آخر کے دو پارے مکمل بھی کر لیے تھے کہ ان کے شیخ حضرت مرزا جان جاناں نے ان کو روک دیا، اس طرح یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔

اس کے بعد شاہ غلام مرتضٰی جنون الہٰ آبادی نے ۱۱۹۴ھ میں پارہ عم کا منظوم ترجمہ کیا، جس کا نام تفسیر مرتضوی رکھا جو مطبع طبعی سے ۱۲۹۵ھ میں چھپا تھا۔

ان تینوں تراجم قرآن کے بعد پہلا مکمل ترجمۂ قرآن شاہ عبدالقادرؒ بن شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ''موضحِ قرآن'' منظرعام پر آیا اور اردو زبان کی تصحیح وترقی کیلئے آپ نے اردو کے معمار خواجہ میر درد سے استفادہ کیا۔ اس لئے ''موضح قرآن'' اُسلوب زبان وبیان اور مرادِ خداوندی کی ادائیگی کے اعتبار سے ایک معیاری اور الہامی تفسیر قرار پائی۔ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کے بعد انہی کے بڑے بھائی شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ کا ترجمہ سامنے آیا جس کو آپ ہی کے ایک شاگرد نجف علیؒ المعروف فوجدار نے آپ کے دروس کو مرتب کیا۔

شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فارسی ترجمہ قرآن ''فتح الرحمان'' سے تحریک پائی اور فہم قرآن کا سلسلہ شروع ہوا انہوں نے یہ تراجم کر کے اردو دنیا اور اسلامی ادب پر بڑا احسان کیا کہ ان کا یہ احسان آج تک طالبان قرآن مانتے ہیں۔

## فصل چہارم:

# تفسیر ماجدی کی اجمالی خصوصیات

### منہج واسلوب، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا لغت ومتعلقات لغت، قرآنی تفاسیر و متعلقات تفسیر سے استفادہ

### تفسیر ماجدی کی اجمالی خصوصیات منہج واسلوب:

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ ''تفسیر ماجدی'' کی خصوصیات اوراس کی انفرادیت کے زیر عنوان نہایت بصیرت افراز نکات تحریر فرماتے ہیں :

''اس کوتاہ بیں کو تفسیر ماجدی میں انفرادیت کے جو پہلو نظر آئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) مفسر کا سب سے بڑا سرمایہ اس کا اخلاص ہے جو ہر کام کے لئے ضروری ہے اور دین کے کام کے لیے اشد ضروری اور دین کے کاموں میں بھی کتاب اللہ کی تشریح وتفہیم وحی رسالت کو دوسروں تک منتقل کرنے کی امانت عظمیٰ کی خدمت کے لیے اشد سے اشد ترین اور اہم سے اہم ترین ضرورت ہے۔

(۲) اخلاص کے بعد علم کا درجہ ہے۔ اگر اخلاص شرط ہے تو علم فرض کا درجہ رکھتا ہے،۔ جس طرح نماز میں وضو شرط ہے تو اس کے ارکان فرض ہیں۔

(۳) اور اخلاص وعلم کے ساتھ ایک اور بات ہے جو ان کو جلا دیتی اور چمکاتی ہے وہ ہے کسی رہبر مخلص اور اس کے راستے کے تجربہ کار پیر دانا کی سرپرستی اور اس کی ہدایات کا حصول۔''[۲۵]

مزید عبداللہ عباس ندوی رحمۃ اللہ علیہ ''تفسیر ماجدی'' کے انفرادی پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''دوسرا انفرادی پہلو یہ ہے کہ مفسر نے براہ راست متن قرآن سے خود اپنا ترجمہ کیا ہے۔ کسی ترجمے کو اپنی تعبیر کا جامہ نہیں پہنایا ہے۔''[۲۶]

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مولانا دریابادیؒ نے اس

بات کی بہت ہی واضح الفاظ میں صراحت کردی ہے کہ:

اس تفسیر کے اردو ترجمے کے جہاں تک تعلق ہے یہ ۷۵ فیصد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نقل ہیں۔

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ ''تفسیر ماجدی'' کی اصل انفرادیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اصل انفرادیت جو لوگوں کو سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتی ہے، وہ صحف سماویہ توراۃ وانجیل سے تقابل اور بغیر کسی اعلان وادعاء کے مثبت انداز میں توراۃ وانجیل کے محرف ہونے کو ثابت کرنا ہے۔انصاف کی بات یہ ہے کہ اس بات میں مفسر دریابادیؒ کا کام متقدمین میں اور متأخرین سب سے بڑھا ہوا ہے۔''[۲۷]

اگرچہ متقدمین اور متاخرین نے بھی تورات وانجیل کے عربی ترجموں کو سامنے رکھ کر قرآنی قصص و واقعات کے معاملے میں قرآن کریم کی آیات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے پہلے ابن حیان الاندلسی ہیں اور متأخرین مفسرین میں مفتی محمد عبدہ، اوران کے شاگرد رشید سید رشید رضا مصری یہ دونوں حضرات اس کام میں سبقت کر گئے ہیں اور سر سید احمد خاں نے بھی اس کام کی داغ بیل ڈالی ہے جس کا ذکر ہم ہندوستان میں تقابلی مطالعہ کے آغاز وارتقاء میں کریں گے، اور مولانا دریابادیؒ کے معاصرین میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہیں لیکن پھر بھی اس سلسلہ میں مولانا دریابادیؒ کا منہج واسلوب مذکورہ شخصیات سے جداگانہ ہے کیونکہ ''تفسیر ماجدی'' میں مذاہب منحرفہ اور فرقۂ ضالّہ کا ابطال لیا گیا ہے اور تحریف شدہ صحائف کا کھوکھلا پن دکھایا گیا ہے لیکن مناظرانہ یا مدافعانہ اسلوب اختیار نہیں کیا گیا بلکہ ایجابی انداز میں ردّ کیا گیا اس کے بعد کسی باطل پرست کو موشگافی کی گنجائش نہیں ملتی۔

''تفسیر ماجدی'' کی اجمالی خصوصیات درج ذیل ہیں ملاحظہ فرمائیے:

☆ مولانا دریابادیؒ نے صرف ونحو کی بڑی بڑی کتابوں سے مراجعت کی ہے اور قرآنی آیات کی لغوی و صرفی تحقیق اور نحوی ترکیب کو سمجھنے میں بڑی دیدہ ریزی اور سخت جانفشانی سے کام لیا ہے اور جابجا قرآن مجید کی بعض آیات کی ترکیب نحوی کی الجھنوں کو سلجھایا ہے۔

☆ زبان وادب کی چاشنی پر معانی کو قربان نہیں کیا گیا ہے۔

☆ ارض قرآن (جغرافیہ قرآن) اور حیوانات قرآن کی تفصیل بڑے ہی شرح وبسط کے ساتھ کی گئی ہے۔

☆ تفسیر ماجدی اپنے طرزِ نو اور اسلوب کے اعتبار سے یہ خصوصیت وانفرادیت رکھتی ہے کہ اس سے عصری تعلیم کا حامل، عام تہذیب وثقافت کا مالک، اور عربی یا علوم دینیہ میں اشتغال رکھنے والے سب ہی مستفیض ہو رہے ہیں۔ اور اسلام اور دیگر مذاہب عالم سے واقفیت حاصل کرنے والوں کے لیے بھی کار آمد ہے۔

☆ اس تفسیر میں قرآن کریم کی عظمت وجلالت کا تصور از اول تا آخر قائم رہتا ہے، اس تفسیر جلیل میں ایک طرف آیات رحمت میں رحمت کی جھلک نظر آتی ہے تو دوسری آیات غضب میں رونگٹے کھڑے کردینے والے اسلوب کی منظر کشی ہے۔ بہر حال مولانا دریابادیؒ نے جا بجا کلامِ الٰہی کا جمال، اس کی معنویت اور اثر انگیزی کو نہایت ہی مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔

☆ مولانا دریابادیؒ کا اپنے پیش رو مفسرین سے استناد کرنے کا منہج واسلوب یہ ہے کہ جب کسی آیتِ کریمہ پر تفصیلی بحث کرتے ہیں تو قدیم وجدید مفسرین سے سند لاتے ہیں اور اس سلسلہ میں تفسیر قرآن سے متعلق ضروری متعلقہ جملے اور فقرے ان کے نام سے اور ان ہی کی زبان میں نقل کرتے ہیں اور یہ منہج وطریقۂ کار صرف تفسیرِ آیات ہی میں نظر نہیں آتا بلکہ لغت وزبان اور متعدد شروحات کی کتابوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے اس کے ذریعہ سے وہ اپنی بحث کو جامع بناتے ہیں اور اس سلسلہ میں اختصار و جامعیت کا پہلو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ مولانا دریابادیؒ اسی منہج واسلوب کو اختیار کرتے ہوئے قرآن کریم کی تشریح وتفسیر دل نشیں انداز میں بیان کرتے ہیں۔ یہ وہ چند اجمالی خصوصیات ہیں جو غور وفکر اور تلاش وجستجو کے بعد ہم نے نقل کر دی ہیں۔

## مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا لغت ومتعلقاتِ لغت، قرآنی تفاسیر ومتعلقاتِ تفسیر سے استفادہ:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ''تفسیر ماجدی'' کی تصنیف وتالیف میں جس محنت شاقہ اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے، اس میں انہوں نے اپنے پیش رو مفسرین، شارحین اور دوسرے اہل علم کی طرح مستند مراجع ومصادر سے براہِ راست استفادہ کیا ہے اور ان مراجع ومصادر سے بار بار عبارتیں نقل کی ہیں۔ مولانا دریابادیؒ نے تفسیر ماجدی کے اولین افتتاحیہ میں لغت، لغات القرآن، اعراب القرآن، قرآنیات کی جامع کتابیں، عربی تفسیر، فقہی تفسیریں، اردو تفسیریں، کی جو سرخیاں قائم کی ہیں ان کا اندازہ اس

طویل فہرست سے لگایا جاسکتا ہے۔ تفسیر ماجدی کے اولین افتتاحیہ کی اس طویل فہرست کو اس لئے نقل کیا جاتا ہے تا کہ قرآنی تحقیقات میں ان کتب سے استفادہ اور خوشہ چینی بہ آسانی ممکن ہو سکے۔
مولانا دریابادیؒ ہی کے الفاظ میں یہ فہرست ملاحظہ ہو :

**ا۔ لغت:**

(۱) الجمہرۃ فی اللغۃ (چار ضخیم جلدوں میں) از ابوبکر محمد بن حسین ابن درید الازدی (ف ۳۲۶ھ)

(۲) الصحاح (چھ جلدوں میں) از ابونصر اسمٰعیل بن حماد الجوہری (ف ۱۹ یا ۳۱۸ھ)

(۳) القاموس (دو ضخیم جلدوں میں) از مجد الدین محمد بن یعقوب الفیر وزآبادی (ف ۸۱۰ھ)

(۴) لسان العرب (بیس حصوں یا پانچ ضخیم جلدوں میں) از جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور الافریقی الخروجی (ف ۷۱۱ء)

(۵) تاج العروس شرح القاموس (دس ضخیم جلدوں میں) از سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی (ف ۱۲۰۵ھ)

(۶) اقرب الموارد (تین جلدوں میں) از سید الخوری الشرطونی (ف ۱۳۱۳ھ)

(۷) کلیات ابی البقاء۔ از الشریف ابوالبقاء الحسن الکندی (ف ۱۰۹۵ھ)

(۸) کتاب الأضداد۔ از محمد قاسم الانباری البغدادی (ف ۳۲۷ھ)

(۹) کتاب الأجناس۔ از ابوعبید القاسم بن سلام البغدادی (ف ۳۴۴ھ)

## (الف) لغات القرآن

عام لغت کے علاوہ جو مخصوص لغات قرآنی ہیں، حسب ذیل پیش نظر رہی ہیں:

(۱) المفردات فی غریب القرآن۔ از ابوالقاسم الراغب الاصفہانی (ف ۵۰۲ھ)

(۲) غریب القرآن۔ از ابوبکر محمد بن عزیز السجستانی (ف ۳۳۰ھ)

(۳) مشکلات القرآن وغربیہ۔ از ابن قتیبہ الدینوری (ف ۲۷۶ھ)

(۴) مفردات القرآن۔ از حمید الدین فراہی (ف ۱۳۴۹ھ)

(۵) النہایۃ فی غریب الحدیث والتنزیل (چار جلدوں میں) از مجد الدین مبارک ابن الأثیر (ف ۶۰۶ھ)

الجزری اور ان کے علاوہ کہیں کہیں مشکلات القرآن (از انور شاہ کشمیری) بھی ؎ خصوصی استفادہ ''مفردات راغب سے رہا تھا، اور اس کے بعد ''نہایہ ابن اثیر'' سے ہے۔

## (ب) اعراب القرآن

(۱) اعراب القرآن۔از ابوالبقاء العکبری (ف ۶۱۶ھ)

(۲) مغنی اللبیب۔(دو جلدوں میں) از جمال الدین ابو محمد عبداللہ یوسف بن ہشام الانصاری (ف ۱۶۷ھ)

(۳) مجاز القرآن۔(جزو اول۔سورۃ الکہف تک) از ابو عبید معمر۔ (ف ۱۳۱۰)

(۴) معانی القرآن۔(جزو اول۔سورۂ یونس تک) از ابوزکریا یحیٰ بن زیاد الفراء (ف ۲۰۷ھ)

(۵) اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم۔از ابوعبداللہ حسن معروف بہ ابن خالویہ (ف ۳۷۰ھ)

## (ج) قرآنیات کی جامع کتابیں

(۱) الاتقان فی علوم القرآن۔از ابوالفضل عبدالرحمٰن جلال الدین سیوطی (ف ۹۱۱ھ)

(۲) البرھان فی علوم القرآن۔(چار جلدوں میں) از بدرالدین زرکشی (ف ۷۹۳ھ)

## ۲۔ عربی تفسیریں :

(۱) تنویر المقیاس۔روایات منقول از حضرت عبداللہ بن عباسؓ صحابیٔ رسولؐ (ف ۶۸ھ)

(۲) تفسیر القرآن الکریم۔(۴۸ سورتوں کی تفسیر) از سفیان ثوری الکوفی (ف ۱۶۱ھ)

(۳) تفسیر جامع البیان (۳۰ جلدوں میں) از ابوجعفر ابن جریر الطبری۔ (ف ۵۳۸ھ)

(۴) الکشاف (۲ جلدوں میں) از جاراللہ محمود بن عمر زمخشری

(۵) مفاتیح الغیب معروف بہ التفسیر الکبیر (۷ جلدوں میں) بیشتر حصہ از محمد فخرالدین رازی (ف ۶۰۶ھ)

(۶) الجامع الاحکام القرآن معروف بہ تفسیر قرطبی (۲۰ جلدوں میں) از ابو محمد عبداللہ بن احمد القرطبی (ف ۶۷۱ھ)

(۷) معالم التنزیل (۸ جلدوں میں) محی السنۃ حسین بن مسعود البغوی) (ف ۵۱۰ھ)

(۸) تفسیر ابن کثیر (۸ جلدوں میں) عماد الدین ابوالفداء اسمٰعیل بن الدمشقی (ف ۷۷۴)

(۹) انوار التنزیل معروف بہ تفسیر بیضاوی (۵ جلدوں میں) از قاضی عمر ناصر الدین البیضاوی (ف ۶۸۵ھ)

(۱۰) مدارک التنزیل (۵ جلدوں میں) از حافظ الدین ابوالبرکات عبداللہ بن احمد محمود النسفی (ف ۷۰۱ھ)

(۱۱) البحر المحیط (۸ جلدوں میں) از اثیر الدین ابوحیان الغرناطی (ف ۷۴۰ھ)

(۱۲) روح المعانی (۹ جلدوں میں) از شہاب الدین آلوسی بغدادی (ف ۱۲۷۰ھ)

(۱۳) التفسیر القیم: تفسیری اقوال ابن قیم۔(مرتبۂ مولانا محمد اویس ندوی نگرامی) (ف ۷۵۱ھ)

(۱۴) جلالین (از جلال الدین محلی وجلال الدین سیوطی) (ف ۸۹۱ھ)

یہ سب تفسیریں اہل سنت کی مستند ومعتمد ہیں، زمخشری صاحب، کشاف اگرچہ معتزلی ہیں لیکن سند قبول انہیں بھی اہل سنت میں حاصل رہی ہے خصوصاً ان کے نکاتِ ادبی نحوی ولغوی کو اور بیضاوی ومدارک کی تو کہنا چاہیے اصل واساس ہی کشاف ہے مفسرین کی بڑی تعداد فقہیات میں شافعی، اہل حدیث یا مالکی ہے، البتہ صاحب مدارک پختہ حنفی ہیں۔

ترتیب واستفادہ کے لحاظ سے سرفہرست ابن جریر، قرطبی، کبیر اور روح المعانی رہی ہیں۔ سرسری ورق گردانی کی حدتک ذیل کی تفسیروں پر بھی رہی ہے اور کہیں کہیں کام کی باتیں ان میں بھی نکل آتی ہیں۔

(۱) الباب التاویل معروف بہ تفسیر خازن، از علاء الدین ابوالحسن علی بن محمد الخازن (ف ۷۴۱ھ)

(۲) غرائب القرآن معروف بہ تفسیر نیشاپوری، از نظام الدین الحسن الخراسانی النیشاپوری (ف ۷۱۸ھ)

(۳) ارشاد العقل السلیم معروف بہ تفسیر ابی سعود، از ابوالسعو محمد بن محمد الحسن الرومی (ف ۹۴۰ھ)

(۴) نظام القرآن (مختلف سورتوں کی تفسیر) از حمید الدین فراہی (ف ۱۳۴۹ھ)

(۵) النہر اللقیط برحاشیہ البحر المحیط، از اثیر الدین ابوحیان الغرناطی (ف ۷۴۵ھ)

(۶) تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن۔ از ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری (ف ۱۳۶۹ھ)

## (الف) فقہی تفسیریں

(۱) احکام القرآن (۳ جلدوں میں) از ابوبکر حصاص رازی حنفی (ف ۳۷۰ھ)

(۲) احکام القرآن (۲ جلدوں میں) از قاضی ابوبکر محمد بن العربی مالکی (ف ۵۴۳ھ)

(۳) تفسیر احمدی، از شیخ احمد عرف ملّا جیون امیٹھوی حنفی (ف ۱۱۴۰ھ)

عربی تفسیر میں یکسانیت وتکرار بڑی کثرت سے پائی جاتی ہے یعنی ایک مفسر جو پہلے لکھ گیا ہے اکثر بعد کے آنے والے گویا آنکھ بند کر کے یعنی بلا جو جرح ونقد نقل کرتے چلے گئے ہیں اور جگہ لفظ تک نہیں بدلے ہیں اسی کے ساتھ دوسری طرف تنوع ورنگارنگی بھی اچھی خاصی ہے، ہر بڑے مفسر کا جیسے ایک مستقل مذہب ومسلک ہے، اور اس کے مسافر اسی کے نقش قدم پر چلتے رہے ہیں۔ مفسرین کی اکثریت مشرقی ہے یعنی عراق، شام، عرب و ایران وغیرہ کی لیکن دو بڑے مفسر مغرب کے بھی ہیں، ایک امام قرطبی، دوسرے محدث ابوحیان غرناطی کہ یہ دونوں سپین کے تھے، اگر مطالعہ ذرا غور سے کیا جائے تو مشرق ومغرب دونوں کی ذہنیت اور طریق فکر کا فرق ان تفسیروں

میں جھلکتا ہوا نظر آئے گا، اسپین جغرافی حیثیت سے تو بہر حال یورپ ہی کا ایک حصہ ہے۔

مذاق طبع کے لحاظ سے بھی مفسروں کی تقسیم یا درجہ بندی کی جا سکتی ہے کسی کے ہاں سارا زور روایات حدیث و آثارِ صحابہ پر ہے، اور کوئی نحوی ترکیبوں کے حل اور صرفی اشتقاق کے سلجھانے میں لگا ہوا ہے، اور کوئی کوئی ایسے بھی ہوئے ہیں جن میں شانِ جامعیت موجود ہے، مثلاً متقدمین میں امام رازی اور متاخرین میں امام آلوسی بغدادی کہ ان دونوں کے ہاں کہنا چاہیئے کہ سب ہی کچھ موجود ہے۔ فارسی تفسیروں میں کوئی قابل ذکر کتاب نظر نہ آئی، ہاں ترجمہ کی حد تک شاہ ولی اللہ دہلوی کی فتح الرحمٰن کا نام لیا جا سکتا ہے۔

### ۳۔ اُردو تفسیریں :

(۱) بیان القرآن (۱۲ جلدوں میں) از اشرف علی تھانوی (اسے اگر اردو کی ساری تفسیروں کا سرتاج سمجھا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو۔ (ف ۱۳۶۲ھ)

(۲) خلاصۃ التفاسیر (۵ جلدوں میں) از فتح محمد تائب لکھنوی (ف ۱۳۴۲ھ)

(۳) مواہب الرحمٰن (۳۰ طویل، عریض، ضخیم جلدوں میں) از امیر علی ملیح آبادی (ف ۱۳۳۶ھ) عربی کی ساری ہی متداول تفسیروں کا جوہر کھینچ کر اس کے اندر آ گیا ہے۔)

ذیل کی بھی تفسیریں جستہ جستہ پیش نظر رہیں :

(۱) فتح المنان معروف بہ تفسیر حقانی (جلدوں میں) از ابو محمد عبدالحق حقانی دہلوی (ف ۱۳۴۷ھ)

(۲) تفسیر ثنائی (۷ جلدوں میں) از ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری (ف ۱۳۶۱ھ)

(۳) ترجمۂ مظہری۔ از قاضی ثناء اللہ پانی پتی (صرف چند پارے نظر سے گزرے) (ف ۱۲۵۴ھ)

(۴) ترجمہ تفسیر فتح العزیز۔ از شاہ عبدالعزیز دہلیو (صرف پارہ ۲ نظر سے گزرا) (ف ۱۲۳۹ھ)

(۵) غایۃ البیان فی تفسیر القرآن (۲ جلدوں میں از احمد حسن امروہوی (صرف دوسری جلد دستیاب ہوئی غالباً (ف ۱۳۲۴ھ) (ف ۱۲۳۹ھ)

(۶) بیان القرآن (۳ جلدوں میں) از محمد علی لاہوری ایم اے (محض ترجمہ کی حد تک قابل قدر رہے) (ف ۱۲۸۹ھ)

(۷) تفہیم القرآن (۵ جلدوں میں) از ابوالاعلیٰ مودودی (صرف پہلی چار جلد دستیاب ہوئیں)

(۸) حواشی شبیری (برحاشیۂ ترجمۂ شیخ الہند) از مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی (ف ۱۳۷۰ھ)

(۹) ترجمان القرآن۔ از مولانا ابوالکلام آزاد (صرف پہلی دو جلدیں نظر سے گزریں)

یہ ساری تفسیریں بجز دو یا تین کے عقائد اہل سنت کی ترجمان ہیں۔ ان کے علاوہ سلوک قرآنی پر ایک بڑے کام کی کتاب:

مسائل السلوک من کلام الملوک۔ از اشرف علی تھانوی ہے۔ ''مرشد تھانوی'' کے حوالہ سے جو عبارتیں اپنی تفسیر میں درج کی ہیں، وہ سب اس سے لی گئی ہیں۔ [۲۸]

علاوہ ازیں ان مراجع ومصادر کا ذکر ناگزیر ہوگا جو مولانا دریابادیؒ نے انگریزی زبان میں قرآنیات سے متعلق یہودی ومسیحی لٹریچر سے استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا دریابادیؒ نے اپنی بساط بھر جن انگریزی میں شائع ہونے والی تقابلی کتابوں، موسوعات، انسائیکلوپیڈیاز کو بطور مراجع ومصادر کے استعمال کیا ہے ان کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) (دائرۂ معارف یہودیہ، جیوش انسائیکلوپیڈیا (Jewish Encyclppedia)

(۲) (دائرۂ معارف مذاہب واخلاق، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس، Encyclopedia of Religion and Ethics)

(۳) انسائیکلوپیڈیا ببلیکا (Encyclopedia Biblica) یہ مسیحی علماء وفضلاء کی تحقیق وتدقیق کا ثمرہ ہے۔

(۴) ڈکشنری آف دی بائبل (ہیسٹنگز)

(۵) ہسٹری آف دی جیوز (ملمین)

(۶) ریلیجن بابلونیا اینڈ اسیریا (راجرس)

(۷) کالڈیا (ریگوزین)

(۸) آن محمد اینڈ محمڈن ازم (بارسورتھ اسمتھ)

(۹) لائف آف محمد (سر ولیم میور)

(۱۰) (Ginz Beag)

(۱۱) سوشل لاز آف دی قرآن (ڈاکٹر رابرٹ رابرٹس)

(۱۲) Moral History of Fusoplan(Lecky)

مولانا دریابادیؒ نے ان انگریزی مراجع ومصادر سے استفادہ نہیں کیا جو ثانوی درجہ کی حیثیت رکھتے ہیں، بلکہ اس انگریزی مواد سے استفادہ کیا جو علم وتحقیق کی رو سے محققین کی نظر میں اعلیٰ درجہ کی اہمیت وحیثیت رکھتے ہے۔

# مراجع ومصادر


۱ احمد بن فارس، ابوالحسینؒ، معجم مقاییس اللغۃ، مطبع بیروت: دارالفکر، ۱۳۹۹ھ، ج۴، ص:۵۰۴

۲ ابن منظور، ابوالفضل، جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب، مطبع امیریہ، ۱۳۲۷ھ، ج۲، ص:۳۶۱

۳ الفرقان:۳۳

۴ بدرالدین محمد بن عبداللہ الزرکشی، علامہ، البرہان فی علوم القرآن، دارالمعرفۃ بیروت، بدون تاریخ، ج۲، ص:۱۴۷

۵ ابوحیان الاندلسی، البحرالمحیط، (مادہ فسر) دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۲ھ، ج۱، ص:۲۶

۶ ابن منظور الدمشقی الافریقی، جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب، داراحیاء التراث، بیروت ۱۴۰۸ھ، ج۵، فصل التاء، ۳۲/۲ مادہ اول

۷ قاضی ابوالبقاء ایوب، کلیات ابی البقاء، موسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء، ص:۱۰۵

۸ راغب اصفہانی، امام، معجم مفردات الفاظ القرآن الکریم (المکتبہ المرتضویہ لاحیاء الآثار الجعفریہ تہران) بدون تاریخ، ص:۲۴

۹ جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطیؒ، علامہ، الاتقان فی علوم القرآن، دارالندوۃ الجدیدۃ، بیروت، بدون تاریخ ج۲، ص:۱۷۳

۱۰ محمود آلوسی، علامہ، روح المعانی فی تفسیر سبع المثانی، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۵ھ، ج۱، ص:۶

۱۱ ابوداؤد، سلیمان بن الاشعث السجستانی، الامام، سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی صلوٰۃ اللیل، مطبع اشرفی بکڈپو دیوبند، بدون تاریخ، جلد اول، ص:۱۹۰

۱۲ النحل:۴۴

۱۳ اٰل عمران:۱۶۴

۱۴ الانعام:۸۲

۱۵ ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن بردزبۃ البخاری (م ۲۲۶ھ) الامام، الصحیح البخاری، کتاب الایمان، باب ظلم دون ظلم، مکتبہ اشرفی بک ڈپو دیوبند، مرادآباد، بدون تاریخ، جلد اول، ص:۱۰، رقم الحدیث:۳۲

١٦ ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ الترمذیؒ، الامام، الجامع الترمذی، ابواب صفۃ الجنۃ، باب ماجآء فی صفۃ طیر الجنۃ، کتب خانہ رشیدیہ دہلی، بدون تاریخ، جلد ثانی، ص: ۷۷

١٧ الاحزاب: ۲۱

١٨ الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص: ۹۳

١٩ ایضاً، جلد ۲، ص: ۱۷۶

٢٠ خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا، آسان اصولِ تفسیر، ناشر کتب خانہ نعیمیہ دیوبند یوپی، طبع اول ۱۴۳۶ھ، ۲۰۱۴ء، ص: ۸۴

٢١ ایضاً، ص: ۸۵

٢٢ ایضاً، ص ۸۵

٢٣ اُردو دائرۃ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۶۲ء، جلد ۶، ص: ۵۳۱

٢٤ عبدالصمد صارم الازہری، تاریخ التفسیر، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۶۸

٢٥ عبداللہ عباس، مولانا، تفسیر ماجدی کی خصوصیات اور اس کی انفرادیت، مقدمہ تفسیر ماجدی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۲۰۱۴ء، جلد اول، ص: ۱۶

٢٦ ایضاً، ص: ۱۸

٢٧ ایضاً، ص: ۲۱

٢٨ تفسیر ماجدی، افتتاحیہ (۱)، ص: ۳۳-۳۶

# باب سوم

## تفسیر ماجدی کی امتیازی خصوصیات اور تنقیدی مطالعہ

**فصل اول:** کتب مقدسہ اور ثانوی جدید تحقیقات سے استفادہ اور بعض اقوال تصوف،
سائنسی، فقہی مباحث،
کلام عرب سے استشہاد اور علم جغرافیہ سے استفادہ

**فصل دوم:** مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے بعض علمی و تفسیری تفردات

**فصل سوم:** تفسیر ماجدی کا تنقیدی مطالعہ

## فصل اول:

### کتب مقدسہ اور ثانوی جدید تحقیقات سے استفادہ اور بعض اقوال تصوف، سائنسی، فقہی مباحث، کلام عرب سے استشہاد اور علم جغرافیہ سے استفادہ:

خدائے رب العالمین نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے مختلف ادوار اور مختلف اوقات میں انبیاء و رسل بھیجے ہیں جنہوں نے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے بیش بہا خدمات انجام دیں ان انبیاء و رسل کے ساتھ رب کائنات نے آسمانی کتابیں ایک خاص دور اور مخصوص قوم یا اقوام کی رہنمائی کے لئے نازل فرمائیں تاکہ آسمانی ہدایت انسانوں کی فلاح و نجات کا سامان ہو سکے۔

اسلام ایک جامع اور عالمگیر مذہب ہے، اس کو جو نمایاں خصوصیت حاصل ہے وہ مذاہب عالم میں سے کسی مذہب کو حاصل نہیں ہے وہ یہ کہ اسلام تمام انبیاء کرام اور تمام الہامی کتب کی تقدیس اور احترام کا قائل ہے۔ الہامی کتب چار ہیں:

۱-تورات، ۲-زبور، ۳-انجیل، ۴-قرآن مجید

ان کتب کے علاوہ مختلف ادوار میں صحائف کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں سب سے پہلا آسمانی صحیفہ حضرت ابراہیمؑ پر نازل ہوا جسے قرآن اولین صحیفوں میں شمار کرتا ہے:

إِنَّ هَذَا لَفِيْ الصُّحُفِ الْأُولَى 0 صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى [1]

[یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں کہی گئی تھی، ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں۔]

الہامی مذاہب میں سے اکثر یہودی ایک طرف تورات، زبور کو کتاب مقدس تسلیم کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ انجیل اور قرآن کریم اور دیگر صحف سماویہ کے الہامی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ مسیحیوں نے توریت، زبور، اور انجیل کے الہامی ہونے کا اعتراف کیا ہے تو وہ قرآن کریم کے الہامی ہونے کے منکر ہیں۔

اسلام میں نہ صرف سابقہ آسمانی صحائف کی تقدیس و تکریم ہے بلکہ ان تمام کتابوں پر ایمان لانا، ان کی حرمت کو تسلیم کرنا، اور الہامی ماننا اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان کے لئے صرف یہ کافی

نہیں ہے کہ وہ قرآن کریم پر ایمان لائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سابقہ کتب سماویہ کے الہامی اور مقدس ہونے پر ایمان لائے، دل سے تصدیق کرے، اور زبان سے اقرار کرے، یہ عمل اسلام میں داخل ہونے کے لئے ضروری قرار دیا گیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا شمار برصغیر کے ان مفسرین میں ہوتا ہے جنہوں نے کتب سابقہ صحف سماویہ سے استفادہ کیا ہے۔ مولانا دریابادیؒ نے صحف سماویہ توراۃ وانجیل سے تقابل اور بغیر کسی ادّعا کے مثبت انداز میں توارۃ وانجیل کے محرف ہونے کو ثابت کیا ہے۔ انہوں نے قرآن کریم کی وہ آیات جن کا پس منظر سمجھنے کے لئے کتب سماویہ سے واقفیت کی ضرورت پڑتی ہے ان کا حل اسرائیلی روایات سے کیا ہے، اسرائیلی روایات کو اس شرط کے ساتھ قبول کرنے کی اجازت ہے، کہ اگر وہ قرآن کریم کی تصدیق وتائید کرتی ہوں، یا معارض نہ ہوں تو ان کو قبول کیا جا سکتا ہے، اور ہر حالت میں ان کی صداقت یقینی نہیں ہے، اس لئے گذشتہ صحیفوں کے احکام شریعت تو اخذ نہیں کئے جا سکتے لیکن قصص کی تاریخ کے لئے ان سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا:

عن ابی ہریرۃؓ قال کان اهل الکتاب یقرئون التوراۃ بالعبرانية و یفسرونها بالعربية لاهل الاسلام فقال رسول الله ﷺ لا تصدقوا اهل اللکتاب ولا تکذبوهم ۔[۲]

[حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ اہل کتاب (یہودی) تورۃ کو عبرانی میں زبان میں پڑھتے اور اس کی تفسیر مسلمانوں کے لیے عربی میں کرتے ہیں رسول ﷺ نے فرمایا: تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تم ان کی تکذیب کرو۔]

ان مقامات کو حل کرنے کیلئے ہمارے مفسرین نے دو طرح کے اصول اپنائے ہیں۔ کچھ نے تو اسرائیلی روایات کو بجنبسہٖ قبول کرلیا اور بغیر کسی تحقیق کے سارا مواد لے لیا جن سے تفسیریں مکدر ہو گئیں، اور کچھ نے یکسر ان صحائف کو چھوڑ دیا اور محض اٹکل سے ایک مفہوم تجویز کر دیا۔

جدید ذہن اور جدید تعلیم یافتہ افراد وطبقات بالخصوص سائنسی مزاج کے حاملین کے ذہن ودماغ میں ایسے سوالات آتے ہیں جن کے جوابات ان روایتی تفسیروں میں تشفی بخش نہیں مل پاتے۔ ان کے دلی خواہش ہوتی ہے کہ کتب سابقہ کے بیانات وآیات سے استشہاد واستدلال یا ان کی تنقیح وتردید کی جائے اور مستشرقین

کے ناقص اعتراضات کا دندان شکن جواب دیا جائے ،بعض مفسرین حضرات نے قرآنی تشریح وتعبیر میں اس زاویہ کے تردیدی مدافعانہ انداز میں خیال رکھا ہے لیکن مولانا دریا آبادی کی ''تفسیر ماجدی'' میں اس کا اہتمام تصدیقی،تحقیقی وتقابلی نظر آتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے تحقیق وتفتیش کے بعد ہی اس مواد سے استفادہ کیا ہے مولانا نے اسلاف کے مختار قول کونقل کرنے کے بعد اس کی اصل تورات وانجیل کے تحریف شدہ نسخوں میں تلاش کی پھر جیوش انسائیکلو پیڈیا،انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں علمائے یہود ونصاریٰ کی قدیم وجدید تحقیقات کا مطالعہ کر کے یہ دکھایا کہ قرآن ہی وہ تنہا آسمانی صحیفہ ہے جو ان مسخ شدہ روایات کی تصحیح کرسکتا ہے۔مولانا دریابادیؒ سابقہ کتب سماویہ، جدید تحقیقات ،اثری اکتشافات،تقابلی مطالعات کا جس قدر اہتمام کرتے ہیں وہ دوسروں کے ہاں مفقود ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

لَن نَّصۡبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۢبِتُ الۡأَرۡضُ مِنۢ بَقۡلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ أَتَسۡتَبۡدِلُونَ الَّذِىۡ هُوَ أَدۡنَىٰ بِالَّذِىۡ هُوَ خَيۡرٌ اهۡبِطُواۡ مِصۡراً فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلۡتُمۡ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَبَآؤُوۡاۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ كَانُواۡ يَكۡفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقۡتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَواۡ وَّكَانُواۡ يَعۡتَدُونَ۔[۳]

کی تفسیر میں اکثر مفسرین نے بنی اسرائیل پر نکیر کی ہے کہ وہ ''خیر طعام'' کے مقابلے میں گھٹیا اور ''ادنی طعام'' کا مطالبہ کر کے نعمت الٰہی کو ٹھکرا رہے تھے۔

مولانا دریابادیؒ نے انسائیکلو پیڈیا ببلیکا اور جیوش انسائیکلو پیڈیا کے حوالے سے اضافہ کیا تھا کہ وہ اپنے پسندیدہ اور لذیذ کھانوں کا مطالبہ کر رہے تھے جن کے خوگر وہ مصر میں رہ چکے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''مصریوں کی مرغوب غذا اکثر زراعت پیشہ قوموں کی طرح یہی زمینی پیداوار تھی۔مصر میں آج کی طرح اُس وقت بھی بڑی مانگ سبزی، پیاز ہلدی وغیرہ کی تھی''۔(انسائیکلو پیڈیا ببلیکا کالم ۱۲۰۹) اور یہی چیزیں اسرائیلیوں کی بھی اصل غذا بن چکی تھی''۔[۴]

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے ابراہیمی شخصیات وذریات کے متعلق تمام اسلامی

مراجع ومصادر کے علاوہ اسرائیلی اور جدید تحقیقات کا ایک انبار عظیم ہے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ مولانا دریابادیؒ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کریم اور بائبل میں کیا فرق ہے۔ اس کے علاوہ اہل کتاب کی مقدس کتابوں اور تورات وانجیل وغیرہ کا حوالہ صرف اس لئے دیتے ہیں کہ ان کا کھوکھلا پن ثابت کیا جاسکے، یا پھر ان سے مستشرقین کے اعتراضات کو رد کرنے کے لئے اشتہاد کیا جاسکے، اور بعض وقت یہ اوقات یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس طرح ان لوگوں نے اپنے انبیاء قدیم کے ساتھ استہزا اور ان پر جھوٹے الزامات لگا کر ان کی توہین کی ہے۔

مثال کے طور پر:

وَلُوطاً إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُم بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّن الْعَالَمِينَ ۵

[اور ہم نے لوطؑ (کو بھی بھیجا) جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ارے! تم تو ایسا بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے اسے دنیا جہان والوں میں سے کسی نے نہیں کیا تھا۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''حضرت لوط بن حاران بن تارخ (آزر) حضرت ابراہیم خلیلؑ کے حقیقی بھتیجے تھے، توریت میں ان کا ذکر بڑی تفصیل سے ہے، ملاحظہ ہو کتاب پیدائش باب ۱۱ تا باب ۱۹۔ البتہ محرفین توریت نے اپنے حسب معمول بعض بہت ہی گندی حرکتیں بھی حضرت کی جانب منسوب کردی ہیں۔ باب ۱۹'' ۔[۶]

مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق ہے کہ آپ نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور کافی دن تک اپنے بیٹے کے غم میں مبتلا رہے۔

قرآن میں ارشاد باری ہے:

وَجَآؤُوا عَلَى قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْراً فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَى مَا تَصِفُونَ ۷

[اور اُن کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون (بھی) لگا لائے (اس پر یعقوبؑ) بولے ہاں (یہ کہو کہ) تم اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے سو صبر ہی اچھا ہے، اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس پر اللہ ہی مدد کرے۔]

مولانا دریابادیؒ توریت کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

''تب یعقوبؑ نے اپنے کپڑے پھاڑے، اور ٹاٹ اپنے کُولے پر ڈالا، اور بہت دن تک اپنے بیٹے کے لئے غم کیا''۔(پیدائش ۳۷:۳۴) ۸

مولانا دریابادیؒ نے تقابل مذاہب اور تقابل صحف سماوی کا نہایت گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا ہے اور قرآن کریم کے اعجاز اور اس کی حفاظت اور صحف سماوی کی تحریفات سے پردہ اٹھایا ہے، جس کی جھلک ان کے قائم کردہ اقتباسات میں ملتی ہے۔

## بعض اقوال تصوف:

## تصوف کی لغوی تحقیق:

لفظ ''تصوف'' کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کس سے مشتق ہے۔ایک قول کے مطابق لفظ ''تصوف''، ''صوف'' سے بنا ہے صوف اون کو کہا جاتا ہے دوسرے اقوال کے مقابلے میں بہتر یہی معلوم ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں کہ:

''قول راجح جس پر اکثر صوفیہ کا اتفاق ہے یہ ہے کہ لفظ ''صوف'' سے مشتق ہے، چونکہ اکثر صوفیہ، صوف (اُون) کا لباس پہنتے تھے۔اس لئے لوگ انہیں صوفی کہنے لگے''۔۹

جوامع الکلم میں میں محمد حسینی اکبر لفظ ''صوف'' کی اصل بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''حضرت گیسودراز کے قول کے مطابق یہ لفظ صوفی دراصل صفوی تھا جو کثرت استعمال کی وجہ سے صوفی ہو گیا''۔۱۰

صوف اہل تصوف کا پسندیدہ لباس رہا ہے، شیخ ابونصر سراج طوسی لکھتے ہیں کہ:

''انبیاء و صدیقین اسی لباس میں رہتے تھے چنانچہ زاہدوں عابدوں نے بھی اسے اختیار کرلیا''۔۱۱

شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ نے صوف پوشی کو صوفیوں کا شعار بتایا ہے اور اسے سنت رسولؐ سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کے کسی قول سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ابتداء اسلام میں ''تصوف'' یا لفظ ''صوفی'' کا کوئی سراغ ملتا ہو، البتہ آنحضرت ﷺ کے عمل سے ''صوف'' پہننا ثابت ہے، جس کا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

عن ابی موسیٰ قال: کان رسول الله ﷺ یَرکَبُ الحِمَارَ ویَلبَسُ الصُّوف۔ [۱۲]

[حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ گدھے پر سواری فرمالیا کرتے تھے اوراونی لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے۔]

اسی طرح ابن ماجہ نے حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے:

لَبِسَ رسول الله الصُّوفَ۔ [۱۳]

[اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے اونی لباس زیب تن فرمایا۔]

درج بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ کا اونی لباس پہننا اورصوفی کے لقب سے ملقب ہونا، اس لباس کی اصل آنحضرت ﷺ کا عملی نمونہ اور طریقہ ہے۔

## تصوف کی اصطلاحی تعریف:

ڈاکٹر عبیداللہ فراہی لکھتے ہیں کہ:

''ان اقوال میں جس بات کی تکرار بار بار ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسباب دنیوی خواہشات نفس اوراپنے ارادہ واختیار سے کلیتہً عاری وخالی ہوجانے ہی کا نام تصوف ہے اور یہی نام تصوف میں حصول حقائق کی کلید ہے''۔ [۱۴]

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تصوف کے لئے ''تزکیۂ نفس'' کا لفظ استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''تزکیۂ نفس وتہذیب اخلاق کا وسیع ومستحکم نظام جس نے بعد کی صدیوں میں ایک مستقل علم اورفن کی شکل اختیار کرلی اور جس کا عرفی واصطلاحی نام بعد کی صدیوں میں ''تصوف'' پڑ گیا''۔ [۱۵]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اخلاق حسنہ اورصفات حمیدہ سے اوراخلاق رذیلہ سے پاک وصاف ہوتو وہ صوفی ہے۔

برصغیر پاک وہند میں اسلامی تصوف کی تطہیر اور پابند شریعت صوفیاءعظام کے دفاع کے لئے جن عظیم شخصیات نے اہم خدمات انجام دیں ہیں ان میں حضرت مجدّد الف ثانیؒ ،شیخ عبدالحق دہلویؒ،شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ،مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، سید مناظر احسن گیلانیؒ،سید ابوالحسن علی ندویؒ، پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ وغیرہ کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا تعلق ایک علمی اور روحانی خانوادہ سے تھا،اس لئے آپ کی طبیعت میں تصوف وسلوک کی جانب فطری رجحان تھا۔آپ نے اپنے پیرومرشد کے ماحول کے اثرات کو قبول کیا اور تعلیم وتعلق کے مراسلاتی روابط نے ''تفسیر ماجدی'' کو ایک صوفیانہ رنگ دے دیا۔

تفسیر ماجدی میں تصوف کے بڑے قیمتی نکات جگہ جگہ موجود ہیں،مولانا دریابادیؒ ''مرشد تھانویؒ'' کے حوالے سے تقریباً ہر دوسرے تیسرے صفحے پر تشریحات تصوف نقل کرتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ عالم دین ومفسر قرآن وفقیہ اور محدث ہونے کے ساتھ ایک عظیم ترین شیخ طریقت اور ہم عصر صوفیاء کے امام بھی تھے اور آپ نے اپنی تفسیر ''بیان القرآن'' میں مسائل سلوک کو حواشی کے طور پر رکھا۔آئندہ سطور میں ''تفسیر ماجدی'' میں بیان شدہ تصوف وسلوک کے حوالے سے چند اقتباسات پیش کئے جائیں گے۔

وَمَا يَخۡدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُم وَمَا يَشۡعُرُونَ ۔۱۶ کی شرح میں آپ لکھتے ہیں کہ:

> ''مرشد تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ اہل اللہ کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا مثلاً عداوت کا یا فریب کا ایسا ہی ہے جیسے حق تعالیٰ کے ساتھ کرنا''۔۱۷

قرآنی آیت ''فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضَاهَا '' ۱۸ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مولانا دریابادیؒ مولانا تھانویؒ کی صوفیانہ تفسیر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

> ''اہل طریقت کے یہاں جو اصطلاح مقام مرادیت ومحبوبیت کی آئی ہے،اس کی اصل یہی آیت ہے۔کیا ٹھکانا ہے اس بلندیٔ مرتبہ کا کہ مولا خود طالب رضائے عبد ہو جائے!اس کے آگے کوئی مرتبہ تصور میں بھی نہیں آسکتا۔اقبال نے اسی مقام کی تشریح کی ہے ۔
>
> خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
> خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے ۱۹

قرآنی آیت ''وَإِذَآ أَظۡلَمَ عَلَيۡهِمۡ قَامُواْ وَلَوۡ شَآءَ ٱللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمۡعِهِمۡ وَأَبۡصَٰرِهِمۡ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٞ'' ۲۰ کی شرح میں مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ ایسا ہی حال اس سالک کا ہے جو حالت بسط میں طاعات میں لگا رہتا ہے،اور حالت قبض میں چھوڑ بیٹھتا ہے''۔۲۱

قرآنی آیت:'' فَتَمَنَّوُاْ ٱلۡمَوۡتَ إِن كُنتُمۡ صَٰدِقِينَ ''۲۲ اس آیت کے تحت مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ:ولایت ومقبولیت کی علامتوں میں سے مومن کے لئے

آرزوئے موت بھی ہے، اگرچہ صرف عقلی ہی حدتک رہے''۔۲۳

قرآنی آیت: ''کُلُوا مِن طَیِّبٰتِ مَا رَزَقنٰکُم وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰکِن کَانُوا أَنفُسَهُم یَظلِمُونَ'' ۲۴

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ باوجود معاصی کے نعمتوں کا جاری رہنا استدراج اور سخت خطرناک ہے اور اس میں جاہل صوفیوں کو سخت دھوکہ ہوا ہے چنانچہ وہ کثرت جاہ و مال کو علامت مقبولیت کی سمجھتے ہیں''۔۲۵

تفسیر ماجدی میں اس طرح کے اقتباسات بکثرت موجود ہیں، اور کہیں کہیں مافوق الفطرت خیالات بھی پائے جاتے ہیں۔

## تفسیر ماجدی کے بعض سائنسی مباحث:

سائنس دراصل حقیقت کی تلاش کے علم کا نام ہے، بالفاظ دیگر طبیعی حقائق کا وہ علم ہے جو مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو یعنی سائنس میں تجربات ومشاہدات کو بڑی اہمیت حاصل ہے درحقیقت لفظ سائنس (Science) لاطینی زبان سے ماخوذ ہے، جس کے معنی علم (Knowledge) کے ہیں، جدید سائنسی علوم میں ریاضی، طبیعیات، ارضیات، فلکیات، حیوانات ونباتات وغیرہ علوم شامل ہیں۔قرآن کریم نے ان سائنسی علوم کے وقار میں اضافہ اور نئی نئی حقائق کا انکشاف کیا ہے، عوام الناس میں کافی شوق وذوق پیدا کیا ہے کہ وہ ان جدید علوم کی مدد سے مظاہر کائنات میں غور وفکر کریں، اور مخلوق کے ذریعہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کریں۔

جب سائنسداں تحقیق وجستجو کے بعد کسی حقیقت تک پہنچتا ہے تو وہ قرآن کریم کی تصدیق وتوثیق کرتا ہے، قرآن اور سائنس کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، بلکہ دونوں کا سنگم (Meeting Point) سچائی (Truth) ہے۔ پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی زید مجدہٗ قرآنی آیات اور سائنس میں تطابق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''سائنس میں کوئی چیز حتمی نہیں ہوتی۔ یہ تجرباتی علم ہے جس میں آگے کی تلاش جاری رہتی ہے اور ہر دم تغیر کا امکان رہتا ہے۔قرآنی آیات کا تطابق اگر سائنسی تجربات سے ہوتا ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر نہیں ہوتا تو یہ کلام اللہ کی کمی نہیں بلکہ انسانی فہم وادراک کی کمی ہے خواہ وہ مطالعہ قرآن کے سلسلہ میں ہو یا مشاہدہ کائنات کے سلسلہ میں۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ انسان کا علم، تجربہ اور ذہن محدود ہے اور اللہ کے کلام کی حکمت لامحدود ہے۔ظاہری بات ہے کہ ایک محدود شئے لامحدود شئے کا احاطہ نہیں

کر سکتی''۔ ۲۶؎

قرآن کریم ریاضی، فلسفہ، تاریخ، ارضیات، فلکیات، عمرانیات، نباتات وحیوانات ومعاشیات کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ ایک کتاب ہدایت ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کے ذریعہ کائنات کے اسرار و رموز اور حسنِ انتظام کا مطالعہ کرے اور اپنے خالق کی معرفت حاصل کرے۔

تفسیر ماجدی کی جہاں اور بہت سی خصوصیات ہیں وہاں ایک خصوصیت وانفرادیت یہ بھی ہے کہ اس کے تفسیری حواشی میں سائنس کی جدید تحقیقات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ مولانا دریابادیؒ کے نزدیک یہ کبھی بنیادی موضوع نہیں رہا لیکن جا بجا سائنسی تحقیقات کی جانب اشارہ کیا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''اب نیا دور تھا، عقلی علوم اور فلسفہ یونان کے بجائے تجربی سائنس بالخصوص طبیعیات کا دور تھا، ہر شعبے میں نئے نئے اکتشافات وتحقیقات ہو رہی تھیں۔ تاریخ جغرافیہ کے علم نے وہ اہمیت اختیار کر لی تھی جو انہیں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ تمدن، علم المعیشت، اقتصادیات اور قانون نے غیر معمولی وسعت ومقبولیت حاصل کر لی تھی، بہت سے قدیم مسلّمات اور جغرافیائی روایات محل نظر، بلکہ خلاف واقعہ سمجھی جانے لگی تھیں۔ نئی کھدائیوں اور آثار قدیمہ کی دریافت نے نئی نئی حقیقتوں کی نقاب کشائی کی تھی، اس سب سے عالم اسلام بالخصوص اس کے علمی حلقے پر نئی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، اب ان جدید معلومات وتحقیقات کی روشنی میں اعجاز قرآن اور صداقت قرآنی کو اسی طرح عیاں اور عالم آشکار کرنا تھا جیسا کہ قدیم علماء ومتکلمین ومفسرین قرآن کو اپنے زمانے میں یونانی فلسفہ وحکمت اور الحاد و باطنیت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا''۔ ۲۷؎

یہ کار عظیم تھا اور مولانا دریابادیؒ نے اس کے لئے ہمت باندھی یہ انگریزی اور اردو تفسیر ان کی سالہا سال کی کوشش ومطالعہ کا نتیجہ ہے۔ کسی بھی مفسر قرآن کا صالح ومتقی ہونا ہرگز اس بات کی ضمانت نہیں دیتا کہ اس کو تاریخی وجغرافیائی اور عام سائنسی معلومات پر دسترس حاصل ہو۔ اسی لئے مفسر قرآن کی نظر علوم طبیعیات وفلکیات میں جتنی گہری ہوگی اس کو حکمت وصنعت تکوینی کے استنباطات وشواہد اتنے ہی ملتے جائیں گے۔ ان میں بہت سے استنباط ایسے ہیں جو قرآنی آیات کے مصداق کی تعیین کرتے ہیں، اور بہت سے استنباط ایسے ہیں جن کو کھینچ تان کر قرآنی آیات کے مفاہیم پر منطبق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا دریابادیؒ نے نہایت اختصار کے ساتھ تفسیر ماجدی میں سائنسی تحقیقات کا انکشاف کیا ہے، البتہ جدید تحقیقات کی تفصیل دینے سے گریز کیا ہے، مولانا کی کوئی بھی تحریر جامعیت سے خالی نہیں ہے۔

## پانی کی اہمیت:

انسانی زندگی میں پانی کا اہم مقام ہے، بلکہ ہر قسم کی حیوانی ونباتاتی زندگی کا انحصار پانی پر ہے اور بنی نوع انسانی کی بقا کے لئے پانی ناگزیر ہے نہ انسان پانی پیئے بغیر رہ سکتا ہے بلکہ اسے اپنی فصلوں کی آب پاشی اور پیڑ پودوں کے لئے بھی پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے:

وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ ۲۸ کے تحت مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''قرآن مجید کا کام مسائل طبیعیات، فلکیات، جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم دینا نہیں بلکہ ان عالم گیر مشرکانہ عقائد اور جاہلی تخیلات کے تردید ہے، کائنات میں جو کچھ ہے یا کچھ ہو رہا ہے تمام تر قادر مطلق ہی کی کارفرمائی کا ثمرہ ہے''۔ ۲۹

مزید لکھتے ہیں کہ:

''پانی خصوصاً بارشی پانی کو جو دخل عظیم ہر قسم کی زمینی پیداوار اور نباتات میں ہے اور پھر بالواسطہ اور براہِ راست بھی حیوانی اور انسانی زندگی کے قیام وبقا میں، ان سب کی اگر تفصیل لکھی جائے تو بجائے تفسیر قرآن کے ایک ضخیم سائنسی مقالہ تیار ہو جائے''۔ ۳۰

قدرت نے یہ تاروں بھرا آسمان سجا کر ہر طرف حسن وخوبصورتی کو بکھیر دیا ہے۔ آسمان میں تیرتے ہوئے لاتعداد ستارے کو ان کی کل تعداد کا اندازہ کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے کسی ساحل سمندر پر ریت کے ذرات کی گنتی کرنا ناممکن ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاء فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيم ۳۱

[پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ کی اور انہیں سات آسمان درست کر کے بنا دیے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔]

عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قدیم اہل ہیئت نے سات آسمانوں سے مراد سات مشہور سیّاروں کے مدار لئے ہیں یعنی کرۂ قمر، کرۂ

عطارد، کرۂ زہرہ، کرۂ شمس، کرۂ مریخ، کرۂ مشتری، کرۂ زحل کبیر) صاحب تفسیر مظہری نے ایک حدیث سے استنباط کر کے لکھا ہے کہ عرش اور اس کے اندر جتنے سماوات ہیں سب کروی ہیں اور عرش زمین کے اطراف کو محیط ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہر کوکب اپنے فلک میں ایک خاص چال سے چلتا ہے اور آسمان کو حرکت نہیں، یہ ساری تشریح پرانی فلکیاتی تحقیق کے مطابق بھی، جدید ترین فلکیاتی تحقیق کے مطابق جو بھی تشریح کی جائے قرآن سے باہر نہیں، قرآن کے اندر ہی ہوگی''۔۳۲

## تفسیر ماجدی کے بعض فقہی مباحث:

قرآن کریم تمام عالم انسانیت کے لئے مشعلِ راہ اور سرچشمۂ ہدایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی شکل میں ایک ایسا دستورِ حیات عطا فرمایا ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے تمام انفرادی و اجتماعی مسائل کا حل رکھا ہے۔ قرآنی احکام و مسائل زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے پر حاوی ہیں۔ خواہ ان مسائل کا تعلق معاشرت و تجارت سے ہو، یا تعلیم و سیاست سے ہو۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی یہ ''تفسیر قرآن'' نہ تو فقہی تفسیر ہے اور نہ ہی احکام القرآن کے طرز پر لکھی گئی ہے، لیکن پھر بھی فقہی مسائل پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ عمدہ بحث کی گئی ہے۔ فقہی مسائل سے متعلق کثیر مواد ملتا ہے، مولانا مسلک حنفیہ کے بڑے زبردست پیروکار تھے اور فقہی مسائل میں مولانا دریابادیؒ نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی رائے کو ترجیح دی ہے لیکن مسائل فقہیہ میں مختلف ائمہ و جمہور کے اقوال پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے اعزاز و اکرام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔

اس وقت ہمارے پیش نظر صرف اس کا فقہی پہلو ہے جن میں سے چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جائیں گی تاکہ قارئین کے سامنے اس کا فقہی مقام بھی اجاگر ہو سکے۔ اسلام نے جسم کی طہارت و نظافت پر بڑا زور دیا ہے جو شخص اس کا اہتمام نہیں کرتا وہ فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ پاکی اور صفائی کو عبادت کی شرط قرار دیا گیا ہے، بغیر طہارت کے نماز ہی نہیں ہوتی۔

قرآن و حدیث پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ طہارت و نظافت کے سلسلہ میں بکثرت فضائل بیان ہوئے ہیں حتی کہ آنحضرت ﷺ نے طہارت و نظافت کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔

حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الطُّھُورُ شطرُالایمان۔ ۳۳

[(طہارت (پاکیزگی) ایمان کا جز یا نصف ایمان ہے۔]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُواْ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلاةِ فاغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُواْ بِرُؤُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ ۳۴

[اے ایمان والو! جب تم نماز کو اٹھو تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دُھولیا کرو اور اپنے سروں پر مسح کرلیا کرو اور اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت (دھولیا کرو)۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کے فقہی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اسلام بخلاف دوسرے مذہبوں کے، باطنی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ ظاہری وجسمانی صفائی کا بھی بہت قائل ہے، اور اس نے اپنی مرکزی عبادت نماز سے قبل وضو کو لازمی ٹھہرایا ہے کہ بغیر اس کے نماز درست ہی نہیں آیت احکامِ قرآنی کی اہم ترین آیتوں میں سے ہے''۔ ۳۵

مزید لکھتے ہیں کہ:

''وضو میں فرض چار چیزیں ہیں، اور انہی کا آیت میں بیان ہے:

''(۱) فاغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ چہرہ کا دھونا۔ (۲) وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ ۔ ہاتھوں کا کہنیوں سمیت دھونا۔ (۳) وَامْسَحُواْ بِرُؤُوسِكُمْ سر کا مسح کرنا یا پانی میں تر کیا ہوا ہاتھ اس پر پھیرنا۔ (۴) (اغسِلُوا) أَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ پیروں کا ٹخنوں سمیت دھوتا۔ فاغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ ۔ مالکیہ کے ہاں چہرہ دھونے کے معنی یہ ہیں کہ پانی اس پر بہایا جائے اور ہاتھ اس پر پھیرا جائے، لیکن حنفیہ کے ہاں محض پانی کا اس پر بہہ جانا کافی ہے، ہاتھ سے ملنا اور رگڑنا لازمی نہیں''۔ ۳۶

مولانا دریابادیؒ نے بازوؤں کو کہنیوں سمیت دھونے کے سلسلہ میں قدیم مآخذ کے حوالے سے نحوی بحث لکھی ہے۔

''رسول اللہ صلعم کا تعامل بھی کہنیاں دھونے کا تھا تو سنّتِ رسول نے اُسے رفع کر دیا ہے۔ حنفیہ کے ہاں تو کہنی کا اعضاء وضو میں داخل ہونا ایک متفقہ مسئلہ ہے (اختلاف صرف امام زفر سے منقول ہے) باقی دوسرے مذاہبِ فقہ نے بھی کہنی کا دھونا لازم قرار دیا ہے۔ وَامْسَحُواْ بِرُؤُوسِكُمْ ۔ مسح سے مراد

بھیگے ہوئے ہاتھ کے پھیر لینے سے ہے، جملہ کی ترکیب (بِرُؤُوسِکُمْ) اس کی مقتضی ہے کہ مراد پورے سر کا مسح نہیں بلکہ اس کے کسی حصہ کا ہے، چنانچہ حنفیہ کے ہاں سر کے چوتھائی حصہ کا مسح کافی ہے، اور ب تبعیض کے لئے ہے تاہم رُبع سر کے لئے حنفیہ کے ہاں دلیل سنتِ رسولؐ سے ہے، آپ کا تعامل پیشانی پر مسح کا تھا اور پیشانی کی مقدار رُبع سر کے برابر ہو جاتی ہے''۔ ۳۷

مولانا دریابادیؒ نے آخری فرض اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھونا بیان کیا ہے، اور اس پر بڑی شرح وبسط کے ساتھ تفصیلی بحث کی ہے۔

کتابیہ عورت سے نکاح کے سلسلہ میں کیا احکامات ہیں؟ یہ اس تفسیر میں مل جائیں گے''۔ مولانا دریابادیؒ تفسیری حاشیہ ۳۲ کے تحت رقم طراز ہیں کہ:

''مسلمات اور کتابیات دونوں کے درمیان اصلاً قدر مشترک سلسلۂ وحی ونبوت پر ایمان ہے، یہود اور نصرانیوں کے اعمال فاسقانہ ہوں اور بعض عقائد کیسے ہی غالیانہ ہوں، بہرحال اصلاً وہ لوگ توحید ہی کے قائل ہیں، اور سلسلۂ وحی ونبوت کے ماننے والے، اور عقائد کے باب میں یہی دو عنوانات اہم ترین ہیں، البتہ یہ خیال رہے کہ ''نصرانیت'' موجودہ یوروپی قوموں کی مسیحیت کے مرادف نہیں۔

نکاح کتابیوں کے ساتھ بالکل جائز ہے، نفس جواز میں کوئی گفتگو اس نص کے بعد چل ہی نہیں سکتی البتہ فقہاء نے مفسدوں پر نظر کر کے اور مصلحتِ شرعی کا لحاظ کر کے فتویٰ یہ دیا ہے کہ بلا ضرورت ایسے نکاحوں سے بچنا چاہیئے۔ کتابیہ حربیہ کے ساتھ نکاح کی کراہت میں تو شبہ نہیں۔ حنفیہ کے اس قول کا مآخذ حضرت علیؓ کا ایک اثر ہے جس میں آپ نے کتابیہ مقیم دارالحرب سے نکاح پر کراہت ظاہر کی ہے۔

علامہ شامی نے فیصلہ کیا ہے کہ نکاح غیر حربیہ کے ساتھ تو محض مکروہ تنزیہی ہے، لیکن حربیہ کے ساتھ مکروہ تحریمی''۔ ۳۸

اسی طرح اسلام کے رشتۂ ازدواج کے مختلف پہلوؤں پر مولانا دریابادیؒ نے بڑی عالمانہ اور محققانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔

**طلاق:**

شریعت کی نگاہ میں نکاح ایک پاکیزہ اور پائیدار رشتہ ہے، لیکن جب نکاح بوجھ بن جائے، میاں

بیوی میں ناموافقت لاعلاج حدتک پہونچ جائے،اورطلاق ایک انسانی ضرورت اورمجبوری بن جائے،تو اسلام نے فریقین کے لئے ہنسی خوشی اور باضابطہ معاہدۂ نکاح کوفسخ کرنے کا اختیار دیا ہے۔اسی کواصطلاحی اعتبار سےطلاق کہاجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے:

الطَّلاَقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ۳۹

[طلاق تو دوہی بار کی ہےاس کے بعد(یا تو)رکھ لیناہےقاعدے کےمطابق یاپھرخوش عنوانی کےساتھ چھوڑ دینا ہے۔]

مولانادریابادیؒ اس آیت کےتحت لکھتے ہیں کہ:

''طلاق سے یہاں مرادطلاق رجعی ہے،دو بارتک الفاظِ طلاق اداکرنے پر رجوع کرلینے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔یعنی دوماہ کے بعد،تیسرے مہینہ،تیسری پاکی کے زمانہ میں،زبان سے الفاظِ طلاق ادا کرے،یاخاموش رہے،دونوں صورتوں میں طلاق واقع ہوجائے گی،اب بغیرکسی دوسرے شوہرسے نکاح کئے اورطلاق پائے،اُس پہلے شوہرسےنکاح دُرست نہ رہے گا۔تو ایک صورت تو یہ ہوئی کہ اب پختہ ارادہ کرکےاس طلاق کومکمل اورقطعی کردیاجائے،اوردوسری صورت یہ ہے کہ آخری گنجائش سے فائدہ اٹھاکرطلاق واپس لے لی جائے۔اورتعلق زناشوئی ازسرنوقائم ہوجائے''۔۴۰

## کلامِ عرب سے استشہاد:

قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہواہے،اس لئے اس میں تفکر وتدبر کے بعد،اس سے احکام ومسائل کااستنباط کرنے،کلام کے مدلول ومنطوق کوکماحقہٗ سمجھنےاوراس کاحقیقی مفہوم متعین کرنے کے لئے جن علوم کی معرفت لازمی ہےاس میں عربی لغت کےعلم کوبنیادی حیثیت حاصل ہے۔

تفسیر ماجدی میں کس حدتک کلام عرب سے اشتہاد کیا گیاہےاس سلسلہ میں پروفیسر ابوسفیان اصلاحی لکھتے ہیں کہ:

''مفردات قرآن کی توضیح کے سلسلے میں یہ بات تفسیر ماجدی میں باربارمختلف مفسرین کےحوالے سے کہی گئی ہے کہ یہی مفہوم کلام عرب میں بھی ہے۔مثلاً لفظ''رزق''پرگفتگو کرتے ہوئےتفسیر کبیر کے حوالے سے بتایا کہ رزق میں تمام نعمتیں شامل ہیں،یہ ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے''۔۴۱

اسی طرح لفظ ''قرأ'' کے معنی ایک زمانۂ معلوم یا مدت متعین کے ہیں، لیکن اس میعاد کا آغاز اور اختتام دونوں ہو سکتے ہیں۔ مزید ابن قتیبہ اور ابن عربی کے حوالے سے بتایا کہ:

''اصل القرء فی کلام العرب الوقت'' لیکن اس دعوے کی دلیل پیش نہیں کی گئی، جب کہ کلام عرب کا متن استدلال کے لئے پیش کیا جانا ضروری تھا۔ یہاں پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کلام عرب کا ذکر کرنے کے بعد اشعار کا نقل نہ کرنا بڑا تعجب سا لگتا ہے۔ اسی طرح دوسرا سوال یہ ہے کہ کلام عرب کی بات کسی تفسیر کے حوالے سے بہتر یہ ہے کہ براہِ راست کلام عرب کا مطالعہ کیا جائے۔ ایک مفسر کے لئے کلام عرب اور خطبات عرب سے واقفیت کو مولانا نے لازم قرار دیا ہے لیکن آپ کی تفسیر میں کلام عرب سے استدلال کا کلی طور پر فقدان ہے''۔[۴۲]

الغرض یہ تھا مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا اپنی تفسیر میں کلام عرب سے استشہاد جس کا مع امثلہ تذکرہ کر دیا گیا۔

## علم جغرافیہ سے استفادہ:

علم جغرافیہ قدیم زمانے میں بھی موجود رہا ہے، لیکن دورِ جدید میں اس نے وہ اہمیت اختیار کر لی جو اسے کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اور اس کی طرف ہر زمانے میں اہل علم اور دانشوروں کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ قدیم وجدید علوم کے سنگم مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ''جغرافیۂ قرآن'' کے ماہر تھے، مولانا دریابادیؒ نے اپنی تفسیر اور سیاحت ناموں میں اس مضمون سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور آپ نے تاریخی کتب کے حوالے سے آثارِ قدیمہ کے کھنڈرات کی دریافت اور مقامات وامکنہ، نیز اشخاص واقوام سے متعلق اتنا مواد جمع کر دیا ہے جو یکجا نہیں مل سکتا۔ اس کے علاوہ قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ اگر تاریخ وجغرافیائی احوال پیشِ نظر ہوں تو آیات کریمہ کی بہت سی تفسیری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ مولانا دریابادیؒ کا ایک خادم دین ومفسر قرآن ہونے کی حیثیت سے یہ وہ عظیم کارنامہ ہے جو دنیا میں قدر ومنزلت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

مولانا دریابادیؒ نے ''تفسیر ماجدی جلد اول'' کے افتتاحیہ نمبر۲ میں ایک مفسر کے لئے علوم عصری سے بہرہ مند ہونے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''قرآن اگرچہ صراحتاً کہیں بھی دعوت دینا کے چلے ہوئے علوم وفنون کی طرف توجہ نہیں دیتا، لیکن ساتھ ہی مطالبات ایسے کرتا ہے کہ کہیں بہ قاعدہ اشارۃ النص اور کہیں بہ قاعدہ اقتضاء النص کہ دوسرے

علوم وفنون کی تحصیل کچھ ناگزیرسی ہوجاتی ہے،قل سیروافی الارض۔ اولم یسیروافی الارض۔
اُن پر عمل درآمد بغیر جغرافیہ کے میدان میں قدم رکھے کیونکر ممکن ہے''۔[۴۳]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ قوم ثمود کے مقام کی تعیین اور وہاں کے باشندوں کی طرزِ زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''قوم کے مورثِ اعلیٰ کا نام ثمود تھا،اورمشہور نسب نامہ یہ ہے،ثمود بن حشر بن زرم بن سام بن نوح، عاد جس طرح عربی جنوبی ومشرق کے مالک تھے،ثمود اس کے مقابل عرب مغربی وشمالی پر قابض تھے، ان کے دارالحکومت کا نام حجر تھا، یہ شہر حجاز سے شام کو جانے والے قدیم راستہ پر واقع تھا،اب عموماً اس شہر کو مدائن صالح کہتے ہیں، یہ شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی،فن تعمیر میں عاد کی طرح اس کو بھی کمال حاصل تھا، پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا پتھروں کی عمارتیں اور مقبرے تیار کرنا،اس قوم کا خاص پیشہ تھا۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ریاضیات، ہندسہ اور انجینئری کے فنون میں اس قوم کو کمال حاصل تھا، یہ یادگاریں کھنڈروں کی صورت میں اب تک باقی ہیں،ان پر ارامی اور ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں''۔[۴۴]

مولانا دریابادیؒ لفظ''ام القریٰ'' کی جغرافیائی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس سے شہر مکہ مراد ہے،ام القریٰ کہنے کے اسباب یہ ہیں کہ تمام اقلیموں ملکوں کی روحانی پرورش کا سامان یہیں سے ہوتا ہے۔بعض نے کہا کہ اس لیے کہ قدیم جغرافیہ کے لحاظ یہ زمین کے عین وسط میں واقع ہے، دنیا کی تہذیبوں کا سنگم ہے تھا،اس کے علاوہ دنیا کے تین بڑے برّ اعظموں ایشیاء،افریقہ، یورپ کا سرراہ عین ساحل حجاز سے پھوٹتا ہے،کیا عجب ہے کہ آگے چل کر کبھی یہ ثابت ہوجائے کہ حجاز کی آب وہوا ہمیشہ سے اتنی گرم وخشک نہ تھی بلکہ کسی بہت ہی قدیم زمانے میں معتدل یا سرد رہ چکی ہے اور اس وقت یہ بستی تہذیبوں تمدن کا مرکز بھی اور ساری دنیا کی تہذیبیں یہی سے نکلی اور پھوٹیں ہیں''۔[۴۵]

مولانا دریابادیؒ نے اپنی تفسیر قرآن میں ام القریٰ کی جغرافیائی افادیت اور اس کی عظمت ورفعت پر بھرپور اظہار خیال کیا ہے۔

بابل پر نہایت علمی اور تحقیقی انداز میں مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''بابل۔جس قدیم ملک کا نام ہے وہ موجودہ نقشہ میں عراق عرب کہلاتا ہے، ملک کے پایہ تخت کا بھی

یہی نام تھا، شہر بابل دریائے فرات کے کنارے واقع تھا، موجودہ بغداد سے کوئی ساٹھ میل سمت جنوب میں، تقریباً وہیں جہاں آج ہلّہ کی آبادی ہے، شہر بہت بڑا تھا، رقبہ میلوں کا تھا، ملک اپنے عروج کے زمانہ میں بڑا سرسبز، شاداب خوشحال، مہذب و متمدن رہ چکا ہے''۔[۴۶]

مقامات قرآنی اور جغرافیۂ قرآنی سے متعلق کتب کا ایک سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جغرافیۂ قرآنی سے متعلق کتابوں میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ''ارض القرآن''، انتظام اللہ شہابی کی جغرافیۂ قرآن''۔ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ''جغرافیۂ قرآن یا ارض القرآن'' کا ایک اجمالی تقابلی مطالعہ پاکستانی ادیب ڈاکٹر تحسین فراقی کی کتاب ''عبدالماجد دریابادیؒ احوال و آثار'' کے پانچویں باب ''افکار ماجد کی فصل چہارم میں عبدالماجد دریابادیؒ بطورِ عالم دین'' کے تحت لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کے مطابق مذکورہ تینوں کتابوں میں قرآنی مقامات کی ترتیب اور سورتوں کی نشاندہی کے اعتبار سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے منفرد ہے۔ جہاں تک سید سلیمان ندویؒ کی ارض القرآن کی بات ہے تو اس میں قرآنی مقامات کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ان خطوں میں بسنے والی قوموں کے سلسلے میں تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی لکھتے ہیں کہ:

> ''ماجد کی ''ارض القرآن'' کے مقابلے میں سید سلیمان ندویؒ کی ارض القرآن'' کا دامن بے حد وسیع ہے اس میں جغرافیۂ قرآنی میں بسنے والی قوموں کے سلسلہ میں تمام ممکنہ تفصیل بھی دے دی گئی ہے اور ان جگہوں کے تاریخی و تہذیبی پسِ منظر اور وہاں کے باشندوں کے عادات و اطوار اور عقائد و رسوم کی تفصیل بھی مہیا کی گئی ہے''۔[۴۷]

مثلاً مقام مدین کی تعیین کے ساتھ ساتھ مدین والوں کی طرزِ زندگی کے بارے میں مولانا عبدالماجدؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''مدین اس شہر کا محل وقوع بحر احمر کا ساحل عرب تھا، کوہ طور کے جنوب و مشرق میں، شمالاً و جنوباً عرض البلد ۲۹ درجہ۔ ۲۹ دقیقہ اور ۲۷ درجہ ۳۹ دقیقہ کے درمیان حضرت ابرہیم خلیلؑ کی ایک زوجۂ محترمہ بیوی قطورہ تھیں، ان کے بطن سے ایک صاحبزادہ مدین نامہ تھے، شہر جب آباد ہوا قدیم دستور کے مطابق انھیں کے نام سے موسوم ہوا۔ پہلے مدین ایک تجارت پیشہ قوم تھی اور ان کے کاروباری اخلاق بھی سخت گندے اور

پست تھے،قرآن مجید اعتقادی گمراہیوں کے ازالہ کے ساتھ ساتھ اخلاقی، معاشرتی معاملات کی بھی برابر اصلاح کرتا جاتا ہے ناپ تول میں کمی کی جزئی صورتیں بہت سے ہوسکتی ہیں،قرآنی لفظ اس سب پر حاوی ہیں۔'' ۴۸

ظاہر ہے کہ جس قوم اور معاشرہ میں معاملات اور تجارت میں بد یانتی ہوگی اس کا معاشی نظام دھرم بھرم ہو جائے گا۔اور اس کا نتیجہ پورے ملک اور قوم کو خسارے اور عدم توازن کی شکل میں اٹھانا پڑے گا۔

فصل دوم:

# مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے بعض علمی وتفسیری تفردات

تفرد کسی بھی شخصیت میں وہ وصف یا خوبی ہے جو اسے دوسری شخصیات سے ممتاز بنائے یا منفرد کرے۔مولانا عبدالماجد دریابادیؒ صاحب طرز انشاء پرداز، ممتاز صحافی، فطری ادیب، قرآن اور تمدن فلسفہ کی معرفت میں جامع شخصیت تھے، ان تمام موضوعات پر ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور گہرا تھا، اور انکا شمار دنیا کے عظیم ادیبوں اور ماہرین فکروفن میں ہوتا تھا۔مولانا دریابادیؒ کے بعض تفردات اہم ہیں جو ان کی ''تفسیر ماجدی'' کو دوسری تفاسیر سے ممتاز کرتے ہیں بلکہ آپ نے ان تفردات کو اتنے شاندار اسلوب میں بیان کیا ہے کہ تمام مفسرین سے الگ ایک امتیازی اور انفرادی مقام حاصل کرلیا ہے، کیونکہ وہ اپنے تفسیری نکات میں جو بھی نقلی مسئلہ بیان کرتے ہیں، وہ عقلی بن جاتا ہے اور قرآن کریم کے حقائق ومعارف کو منظر عام پر لانے کا ایک ذریعہ بھی بنتا ہے اور نہایت ہی مشکل مسائل قرآنیہ جن پر عام اہل علم کی عموماً رسائی نہیں ہو پاتی وہ آپ کے تفسیری تفردات سے واضح ہو جاتے ہیں۔

ذیل میں تفسیر ماجدی کے حوالے سے بعض تفسیری تفردات مُشت نمونہ از خروارے کے طور پر ملاحظہ فرمایئے:

### (۱) مکی اور مدنی سورتوں پر منفرد تحقیق:

اکثر وبیشتر مفسرین مکی اور مدنی سورتوں کے مابین عام طور سے یہ فرق بیان کرتے ہیں کہ ''مکّی آیت یا سورۃ'' کا مطلب یہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغرض ہجرت مدینہ منورہ پہنچنے سے قبل نازل ہوئی ہو وہ مکّی ہے، اور مدنی آیت یا سورہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی ہو وہ مدنی ہے۔بعض مفسرین عظامؒ نے مکّی اور مدنی سورتوں وآیات کی کچھ خصوصیات ذکر کی ہیں۔مثلاً ہر وہ سورۃ شریفہ جس میں لفظ ''کلاّ'' آیا ہے وہ مکی ہے ہر وہ آیت کریمہ جس میں منافقوں کا ذکر آیا ہے، وہ مدنی ہے۔مکّی

سورتوں میں عام طور سے ''یٰٓاَیھا النّاسُ''(اے لوگو) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔ جبکہ مدنی سورتوں میں ایمان والوں سے ''یٰآیھا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا''(اے ایمان والوں) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔

مولانا دریابادیؒ اس فرق کو کلی وقطعی اور حتمی نہیں کہتے بلکہ اس سلسلہ میں علمی تفرد تحریر کرتے ہیں کہ :

''لیکن یہ تقسیم صرف عمومی حیثیت سے ہے، ورنہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مدنی سورت کے اندر مکی آیتیں رکھادی ہیں، یا اس کے برعکس، ربطِ مضمون ومناسبتِ مقام کا صحیح تر ولطیف تر احساس رسول اللہ صلعم سے بڑھ کر اور کس کو ہوسکتا تھا؟ اس لئے کسی متعین آیت کے باب میں اس کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ جزم کے ساتھ کرنا دُشوار ہے روایتیں جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں، کوئی درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی نہیں ہیں، محض مفیدِ ظن ہیں، مفید یقین نہیں، اور اس قسم کے عقلی وقیاسی معیار کہ مثلاً یٰٓاَیھا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا سے شروع ہونے والی آیتیں لازمی طور مدنی ہوں گی اور یا یھا الناس سے شروع ہونے والی لازمی طور پر مکّی محض اکثری وتخمینی ہیں، کلّی وقطعی نہیں، اور محض ان روایات ونظریات کے ماتحت کسی آیت پر جزم ووثوق کے ساتھ کوئی حکم لگادینا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ قرآن مجید کی کسی جدید ترتیب پر اُسے ترتیب نزولی کا نام دے کر آمادہ ہوجانا بڑی جسارت کا کام ہے''۔۴۹؎

## (۲) مترادف الفاظ کی تشریح وتوضیح:

مولانا دریابادیؒ نے ''تفسیر ماجدی''میں عربی کے مترادف الفاظ کی فنی وضاحت نہایت عمیق فرق کے ساتھ تحریر کی ہے، جو ان کے عربی ذوق اور قرآنی مہارت کی دلیل ہے۔ سورۂ یوسف کی آت:۴۹ قصۂ یوسف کے حوالے سے مصر میں قحط سالی پڑی تھی، تو اس کے لئے قرآن کریم نے عام کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آیت کریمہ ملاحظہ ہو :

ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ۵۰؎

[پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریاد رسی ہوگی اور اس میں وہ شیرہ بھی نچوڑیں گے۔]

مولانا دریابادیؒ اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے آخر میں لفظ عام کا فرق بیان کرتے ہیں کہ:

''عام کے معنیٰ بھی ''سنۃ'' کی طرح سال ہی کے ہیں۔ لیکن استعمال میں فرق یہ ہے کہ خشکی اور تنگی کے موقع پر ''سنۃ'' لایا جاتا ہے، اور شادابی وخوشحالی کے موقع پر ''عام'' بولا جاتا ہے''۔۵۱؎

## (۳) آیت مفاتیح الخمسہ کی منفرد اور جامع تفسیر:

سورۂ لقمان کے آخر میں مفاتیح الخمسہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ :

''آیت میں آیندہ کے علم قطعی و تفصیلی کی نفی مراد ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کوئی نہ کوئی پروگرام ظنی اور اجمالی صورت میں تو دوسرے دن کے لیے ہر انسان رکھتا ہی ہے............اور جب انسان کو اپنے ہی کل سے متعلق تفصیلی اور تحقیقی خبر نہیں ہوسکتی، تو ظاہر ہے کہ دوسروں کے مستقبل سے متعلق تو اتنی بھی نہیں ممکن''۔۵۲

مولانا دریابادیؒ نے اس آیت میں کلی و قطعی اور جمیع ما کان و ما یکون کا علم بلا واسطہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اقدس کے لیے ثابت کیا ہے۔ ورنہ ظنی جزوی اور بالواسطہ علم انسان بھی خدا تعالیٰ کے عطا کردہ حواس خمسہ اور عقل سے معلوم کرسکتا ہے۔

اس تفسیر کی رو سے نہ علمی ترقی ایمان کے منافی ہے اور نہ ہی عصر حاضر میں جو جدید دریافتیں ہو رہی ہیں ان سے اس آیت پر کوئی اشکال وارد ہوتا ہے۔

## (۴) حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ کے قیامِ جنّت کی منفرد تفسیر :

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلاَ مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا وَلاَ تَقْرَبَا هَـذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْظَّالِمِينَ۔۵۳

[اور ہم نے کہا اے آدمؑ! تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو سہو، اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم گنہگاروں میں سے ہو جاؤ گے''۔]

مولانا دریابادیؒ اس آیت کی منفرد تفسیر نقل کرتے ہیں کہ:

''جنت اس وقت تک دار الجزاء یا دار الخلد نہ تھی جیسی کہ اب ہے بلکہ اُس وقت وہاں کے قیام کے کچھ مخصوص قوانین تھے، شرائط تھے، اور جب جنت کی ماہیت اس وقت یہ تھی تو کوئی اشکال نہیں رہتا، وہاں وسوسۂ شیطانی کے پہنچ جانے پر، یا کسی متنفس کے وہاں سے نکالے جانے پر''۔۵۴

مولانا دریابادیؒ کا یہ ایک ایسا علمی تفرد ہے جو قصّہ آدم وابلیس کے متعلق بہت سے اہل علم اور عوام الناس میں پھیلے ہوئے اعتراضات کو رفع کر دیتا ہے۔

## (۵) رحمت وغضب الٰہی کا منفرد علمی نکتہ :

ارشاد خداوندی ہے :

قُلْنَا اهْبِطُواْ مِنْهَا جَمِيعاً فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّى هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَاىَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ ۔۵۵؎

[ تو جو کوئی پیروی میری ہدایت کی کرے گا۔ سو اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہی ہوں گے۔ ]

مولانا دریابادیؒ اس آیت کی تفسیر حاشیہ میں تحریر کرتے ہیں کہ :

''اہل جنت کے ذکر میں ذات حق کے لیے ضمیر متکلم صیغۂ واحد کی اوپر ابھی گزر چکی ہے۔ اہلِ جہنم کے سلسلہ میں وہی ضمیر متکلم صیغۂ جمع میں ہوگئی ہے۔ بـــاٰیتـنــاَ ۔ اہل لطائف نے لکھا ہے کہ وہ موقع اظہار خصوصیت وشفقت کا تھا، اس لیے ''میری'' ہی مناسب تھا، اب محل حاکمانہ جلالت واقتدار کا ہے اس لیے یہاں ''ہماری'' ہی موزوں ہے''۔۵۶؎

## (۶) ضبط تولید پر جدید محققانہ تفسیر :

آج کے اس جدید دور میں خاندانی منصوبہ بندی (ضبط تولید Birth control) کا بول بالا ہے۔ موجودہ دور میں خاندانی منصوبہ بندی با قاعدہ مہم اور تحریک کی شکل اختیار کر چکی ہے اور سرکاری سطح پر متعارف کرائی جاتی ہے اس لیے اس کے ناجائز ہونے میں کسی کو کوئی شک وشبہ نہیں، البتہ بعض علماء کرام انفرادی طور پر اس کی اجازت دیتے ہیں۔ شرعی حدود وقیود میں رہتے ہوئے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَالآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُواْ مَا كَتَبَ اللّهُ لَكُمْ ۔۵۷؎

[ سو اب تم اُن سے ملو ملاؤ اور اُسے تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے۔ ]

خاندانی منصوبہ بندی کے حوالے سے مولانا دریابادیؒ کا اسلوب تفسیر ان کے عمومی انداز سے بالکل برعکس ہے۔ مولانا دریابادیؒ اس آیت کی تفسیر کے تحت خاندانی منصوبہ بندی کے جسمانی اور سماجی مضر اثرات طبّ جدید کا فتویٰ اور سماجی تحقیقات انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں اور عصرِ حاضر کے مسائل کی روشنی میں اُمّت مسلمہ کی رہنمائی کرتے ہیں اور مباشرت کے قدرتی وطبعی پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''عملِ مباشرت اگر صحیح سن میں اور مناسب وقت پر ہو، بڑی گہری طبعی لذّت بھی رکھتا ہے، لیکن اسلام نے اس عمل سے اصلی اور بڑا مقصد افزائش نسل اور حصولِ اولاد رکھا ہے کہ امت کی قوّت اور کثرت میں برابر اضافہ ہوتا رہے، اور ذاتی لذت اجتماعی منفعت کا زینہ بنتی رہے، باقی اجتماع تزوجی کے قدرتی نتیجوں کو بلاوجہ خاص وضرورت شدید مصنوعی ذریعوں اور تدبیروں سے روکنا اور ربڑ وغیرہ کے آلات کو کام میں لانا، مصیبتوں کو دور کرنا نہیں، جسمانی آلام اور اخلاقی امراض کو بڑھانا اور فرد وقوم دونوں کو نئے نئے فتنوں کی دعوت دینا ہے''۔

''اگر مان بھی لیا جائے کہ جلد جلد استقرار حمل اور وضع حمل سے عورت کی صحت خراب ہوجاتی ہے تو بھی خود طب جدید کا فتویٰ یہ ہے کہ عورت کو زمانۂ حمل میں صنفی اعمال سے جو مہلت مل جاتی ہے، نیز وضع حمل کی رضاعت وغیرہ کی مشغولی وتوجہ، یہ سب عورت کی صحت کے لئے ضروری ہے''۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ اولاد کی پیدائش ہمیشہ والدین کے ارادہ کے تابع نہیں رہتی، باقی متعدد دوسرے ڈاکٹروں اور انہیں میں لیڈی ڈاکٹر بھی ہیں، اور سائنس کے ماہرین نے اس جدید فیشن کی لغویت اور بیہودگی پر اس سے بھی زیادہ کھلے لفظوں میں کہا ہے اور اس کی طبعی مضرتیں کھول کر دکھائی ہیں خصوصاً عورت کے حق میں''۔ ۵۸؎

خاندانی منصوبہ بندی کا جواز یا عدم جواز انسان کی نیت اور ارادہ پر موقوف ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں شریعت اسلامی کا حکم یہ ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کی حکومتی سطح پر تحریک نہ چلائی جائے بلکہ انفرادی طور پر اگر کوئی شخص خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنا چاہیے تو شرعی حدود وقیود میں رہتے ہوئے اس پر عمل کرسکتا ہے، شریعت مطہرہ مسلمانوں کو اس کی مشروط اجازت مرحمت فرماتی ہے۔

## (۷) روزہ کی اہمیت ومعنویت دشمن اسلام کے نزدیک:

مولانا دریابادیؒ کا ایک علمی تفرد ہے کہ قرآن کریم کی صداقت وتائید کے لئے بعض منکرین ومعاندین اسلام کی کتابوں سے حوالہ جات نقل کرتے ہیں۔ مثلاً روزہ کی سخت ریاضت ومشقت مختلف مقامات اور مختلف موسموں میں برداشت کرنے پر ولیم میور نے لائف آف محمد میں امت محمدیہ کی نہایت خوش دلی اور بے تکلفانہ الفاظ میں تعریف وتائید کی ہے۔ اگرچہ یہ امت مسلمہ اس کے تائیدی الفاظ کی محتاج نہیں ہے لیکن اسلام کی

حقانیت وصداقت کا ایک باب ضرور سامنے آتا ہے کہ اسلام کی فضیلت کا اصل معیار یہ ہے کہ دشمن بھی جس کا اقرار کرے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیَ أُنزِلَ فِیهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِیضاً أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَیَّامٍ أُخَرَ یُرِیدُ اللّهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلاَ یُرِیدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُواْ الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُواْ اللّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔۵۹

[(روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ (ہے) جس میں قرآن نال ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور (جس میں) ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (جو حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو، چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں (رکھ کر) ان کا شمار پورا کرلے۔ خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا اور (یہ آسانی کا حکم) اس لیے (دیا گیا ہے) کہ تم روزوں کا شمار پورا کرلو اور اس احسان کے بدلے کہ خدا نے تم کو ہدایت بخشی ہے تم اس کو بزرگی سے یاد کرو اور اس کا شکر کرو'۔

مولانا دریابادیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں نادر نکات لکھے ہیں اور تفرد یہ ہے کہ ولیم میور جیسے اسلام مخالف اور منکر حق کے قول کو روزہ کی اہمیت پر نقل کیا۔ ولیم میور لکھتے ہیں کہ:

''روزہ کی سختیاں بدستور قائم ہیں، خواہ وہ کسی موسم میں پڑیں، اور آج تک مشرق کے میدانوں میں جلجلاتی ہوئی دھوپ اور جُھلساتی ہوئی سموم میں، گرمیوں کے لمبے لمبے دنوں میں محمدؐ کے پیرو صبح سے شام تک پانی کا ایک قطرہ حلق کے نیچے نہیں اُتارتے......اتنی سخت ریاضت، اور دعوتِ ایمانی اور ضبطِ نفس کا پورا امتحان ہے''۔ (لائف آف محمد، ص:۱۹۳)۶۰

## خلاصۂ کلام :

اس کے علاوہ مولانا دریابادیؒ کے تفسیری تفردات ''سورۃ الرحمٰن'' کی تفسیر میں بھی نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الرحمٰن میں بار بار فرمایا: ''پھر تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔'' مولانا دریابادیؒ نے اس تکرار سے رہبانیت کی تردید پر استدلال کیا ہے کیونکہ رہبانیت میں ترک نعمت کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے، جبکہ سماجی زندگی میں نعمتوں سے استفادہ کا طرزِ عمل اختیار کر کیا جاتا ہے۔ مفسر دریابادیؒ نے اپنی خداداد

ذہانت وصلاحیت اور تفسیری مہارت کے ذریعہ قرآن کریم کی تفسیر کے ایسے منفرد اچھوتے (Unique and untouched) نکات قلم بند کیے ہیں جو ایک طرف جمہور مفسرین اور سلف صالحین کے اسلوب کے تابع ہیں، تو دوسری طرف جدید عصری رجحانات کے عین مطابق ہیں۔

مولانا دریابادیؒ ایک سچّے کامل مومن اور ماہر قرآن و عاشق رسولؐ اور داعی الی الحق تھے، چنانچہ ان تمام اوصاف وخصائص کا عکس جمیل آپ کی تفسیر جلیل میں نمایاں نظر آتا ہے، مخلوق کے مابین تفسیر ماجدی کی یہ شہرت وافادیت عنداللہ اس کی مقبولیت کا بیّن ثبوت ہے۔ امید ہے کہ یہ تفسیر مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے لیے بڑا ذخیرۂ آخرت بنے گی۔

فصل سوم:

# تفسیر ماجدی کا تنقیدی مطالعہ

کوئی بشر غلطی سے محفوظ نہیں اس لئے جہاں انسان میں خوبیاں ہوتی ہیں وہاں خامیوں کا پایا جانا لازمی ہے جب انسان ہی غلطیوں سے پاک ومبرّا نہیں تو اس کی تخلیقی سرگرمیاں غلطیوں سے کیسے محفوظ ہوسکتی ہیں۔ بایں ہمہ جس طرح مولانا دریابادیؒ نے معصومیت اکابر سے انکار اور اپنی غلطیوں کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ بالکل اسی طرح مولانا دریابادیؒ کی ''تفسیر ماجدی'' بھی نقد ونظر کا ہدف بن سکتی ہے، کیوں کہ ظاہر سی بات ہے کہ یہ ایک بشری تعبیر وتشریح کی کوشش ہے خواہ اسلوب وبیان کتنا ہی بلیغ ہے، خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ نہیں ہوسکتا۔

ہماری زیرنظر ''تفسیر ماجدی'' کے ترجمہ وتفسیر میں بعض غلطیاں ایسی ہیں جن کا ذکر کیا جانا اس مقالے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ یہ لغزشیں یا خطائیں جن کو زیرِ بحث لایا گیا ہے لازمی وضروری نہیں کہ ہر انسان اس سے اتفاق رائے رکھتا ہو، ہوسکتا ہے کہ کسی کی نظر میں وہ خوبی ہو جو ہماری نظر میں خامی ہے ویسے کوشش یہ کی گئی ہے کہ ان ہی لغزشوں اور خطاؤں کو صفحۂ قرطاس پر لایا جائے جن کے بارے میں علماء ودانشور اور مفسرین عظام متفق ہوں۔ ایک قاری کی حیثیت سے تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے اسے اپنے اس تنقیدی جائزہ میں پیش کررہے ہیں۔ قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر اور تشریح وتعبیر کی دو سطحیں ہیں پہلی سطح یہ ہے کہ جب ایک عام قاری اور طالب حق اسے پڑھے گا تو اس کا مطلب فوراً سمجھ جائے گا۔

دوسری سطح ماہرین فن، مفسرین، محققین اور اہلِ دانش وبینش کے لیے جن کی تعداد ہر زمانہ میں بہت کم رہی ہے اور جو وسعت بیان، تشریح وتفصیل کے خوگر ہیں۔

اسی بناء پر عربی تفاسیر میں طبری، رازی، اور قرطبی اور اردو تفاسیر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''تفسیر بیان القرآن'' اور خود مولانا دریابادیؒ کی ''تفسیر ماجدی'' سے استفادہ اہلِ علم اور دانشوروں کا بلند تر

طبقہ کرسکتا ہے، عوام الناس نہیں کر سکتے، بلکہ بیان القرآن میں بعض آیات کی تفسیر ایسے پیچیدہ علمی دقائق اور فنی نکات پر مشتمل ہے کہ وہ طلباء وعلماء کے فہم سے بھی بالاتر ہے۔

مولانا دریابادیؒ بھی اس بات کے معترف ہیں کہ قرآن مجید تمام عالم انسانیت کے ہر طبقہ کے لیے سراپا ہدایت نامہ ہے اس لیے عوام کے طبقات صرف قرآن کریم کی مختصر تشریح وترجمہ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اس لیے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے کتاب ہدایت کے معانی کا نہایت سادہ وسہل اور ان ہی کی مروّجہ زبان میں ترجمہ وتشریح ہو اور غیر ضروری تفصیلات، طویل تفسیری مباحث سے گریز کیا جائے کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ موجودہ دور میں تفسیر دریابادیؒ کا شمار اُردو کی بلند ترین تفاسیر میں ہوتا ہے اس مقام ومرتبہ میں اس کا کوئی دوسرا مدِّ مقابل نہیں۔

مولانا دریابادیؒ نے تفسیر ماجدی'' کی تشریح وتعبیر میں ان دونوں کے مابین کوئی فرق وامتیاز نہیں رکھا کہ اس تفسیر سے جدید اہلِ علم کا طبقہ ہی استفادہ کرسکتا ہے۔

**قصہ حضرت آدم علیہ السلام وحوّا علیہ السلام :**

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بنا کر انہیں بہترین مقام یعنی جنت میں رکھا اور وہاں انہیں بے شمار نعمتوں سے مالا مال کیا۔لیکن انسانی صفت ہے کہ وہ معاشرتی حیوان ہے اور تنہا زندگی نہیں گزار سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ان کی بیوی کا انتظام کیا۔اس سے نہ صرف ان کی تنہائی دور کی بلکہ رشتۂ ازدواج کا باقاعدہ آغاز کیا۔اسی لیے یہ سب سے پہلا رشتۂ ازدواج ہے جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا علیہ السلام کے درمیان وجود میں آیا۔

محقق عبدالماجد دریابادیؒ حضرت حوّا علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

''یہ روایت کہ حضرت حوّا علیہ السلام کی پیدائش حضرت آدمؑ کی پسلی سے ہوئی ہے، توریت کی ہے :

''اور خداوند خدا نے کہا کہ اچھا نہیں آدمؑ اکیلا رہے، میں اس کے لیے ایک ساتھی اس کی مانند بناؤں گا

............اور خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک

پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس کی پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی، ایک عورت بنا کے آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں ایک ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے، اس سبب سے وہ ناری کہلائے گی کہ وہ نر سے نکالی گئی ہے۔''

(پیدائش۲:۱۸۔۲۴)

بعض حدیثی روایتیں جو اس مضمون کی پروئی ہوئی ہیں اُن میں سے کوئی ایسی نہیں جسے قطعی صحت کا درجہ حاصل ہو اور قرآن مجید نے اس سلسلہ میں سورۃ النساء اور سورۃ الاعراف میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی تعبیر اور طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے۔ ۶۱

یہ لکھنے کے بعد مولانا دریابادیؒ ''وجعل منہازوجھا'' کے تحت حاشیہ نمبر ۹۲۷ پر لکھتے ہیں کہ :

''یعنی حضرت حوّا کو پیدا کیا۔ منہا ضمیر نفس واحدۃ کی طرف بالکل ظاہر ہے، لیکن خود نفس سے مراد جنس بھی لی جا سکتی ہے اور لی گئی ہے۔'' ۶۲

اب اس کو مولانا دریابادیؒ کا تفنن یا تفرد ہی کہا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ ''ھا'' کا مرجع نفس واحدۃ ہے اور نفس واحدۃ سے مراد حضرت آدمؑ ہیں۔ پھر لگاتار دو مرتبہ ''ھا'' ضمیر آئی ہے، اور دونوں کا مرجع مولانا دریابادیؒ کے نزدیک بھی نفس واحدۃ ہی ہے۔ اب تمام انسان تو نفس واحدۃ حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئے، لیکن حضرت حوّاؑ کے لیے آدم والے نفس واحدۃ سے آدم کی تجرید کر لی جائے اور اس سے جنس مراد لیا جائے۔ اس کو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا تفنن کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں! یہاں دلچسپ اور حیرت کی بات ہے کہ قرآن کریم کے لفظ جعل سے صرف ایک لفظ پہلے مولانا دریابادیؒ نفس واحدۃ سے مراد حضرت آدم لے چکے ہیں۔

قرآن کریم کی مکمل آیت اس طرح ہے :

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۶۳

[وہ وہی (پروردگار) ہے جس نے تمھیں ایک جان واحد سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اس (جوڑے) سے تسکین حاصل کرے۔]

اس صورت میں یہ کہنا کہ ''نفس واحدہ'' سے مراد جنس بھی لی جا سکتی ہے اور لی گئی ہے۔'' اس شکل و صورت میں مسئلہ حل نہیں ہو گا بلکہ اس پر چند مزید سوالات کھڑے ہو سکتے ہیں :

(۱) آیت کریمہ میں دوسری والی ''ھا'' کو یعنی حضرت حوّاؑ کی ولادت کو نفس واحدہ سے یعنی آدمؑ کی ذات سے تسلیم کرنے میں تامل کی کیا گنجائش ہے؟ اور اس سے کوئی قوی دلیل بھی یہاں موجود نہیں اور حدیث مبارکہ سے بھی اس معنی کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔

(۲) اس صورت میں بغیر دلیل ظاہر قرآن سے عدول کرنا لازم آتا ہے اور جمہور مفسرین کی منقولہ تفاسیر کو مسترد کرنا لازم آتا ہے جو کہ کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے۔

حضرت حوّاؑ کی پیدائش حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے ہوئی ہے، یہ حدیث شریف صراحت و وضاحت کے ساتھ بخاری شریف اور مسلم شریف میں موجود ہے، لیکن چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہونا قائلین فطرت کے نزدیک خلاف فطرت ہے، ہوسکتا ہے کہ مولانا دریابادیؒ نے بھی محض اہل فطرت کے اثر پذیری سے متاثر ہوکر یہ بات نقل کردی ہو کہ ''کوئی روایت ایسی نہیں جسے قطعی صحت کا درجہ حاصل ہو'' کیوں کہ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ تمام احادیث مبارکہ کی حیثیت و مقام و مرتبہ اور خود بخاری و مسلم کی اہمیت و افادیت مفسر دریابادیؒ کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔

چنانچہ مولانا دریابادیؒ ایک مفکر کے کسی مضمون پر تنقید کرتے ہوئے مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ :

> ''اگر صحیحین کے رجال بھی مطرود و مردود قرار پاجائیں تو پھر حدیث میں ہمارے پاس رہ ہی کیا جائے گا یہ تو منکرین حدیث کے ہاتھ ایک بڑا حربہ دے دینا ہوا۔ یحیٰ بن معین ہوں یا حافظ ذہبی کس کے ذوق کو امام بخاری کے ذوق کے مقابل لایا جائے؟ میں تو جس طرح فقہ میں سب سے بڑی حجت یہی سمجھتا ہوں کہ فلاں قول امام ابوحنیفہ کا ہے، اسی طرح حدیث کی بھی سب سے بڑی سند یہی خیال کرتا ہوں کہ امام بخاری کے ذوق نے اسے قبول کرلیا۔ اسماء الرجال کے ائمہ کیا کوئی صاحب وحی تھے؟ لے دے کے بس وہی مہارت فن۔ تو مہارت فن میں امام بخاری کو کس سے کمتر سمجھا جائے۔'' [۶۴]

نہایت حیرت ہوتی ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے محض ''اہل فطرت'' اور ''اہلِ درایت'' کے اسلوب اور لب و لہجہ میں یہ قول کیوں کر نقل کردیا کہ نفس واحدۃ کا مصداق محض جنس ہے کیوں کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جمہور مفسرین کے مقابلہ میں اہل فطرت کے اس قول کو تسلیم نہیں کیا جائے گا بلکہ اہل فطرت کے

اس معارضہ کی بنیاد محض توہّم پرستی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سورۂ نساء وخلق منہا زوجہا کے تحت جو تفسیر لکھی ہے اس میں بے ضرورت تاویل سے اجتناب اور تفسیر کے اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے اور ''اہل نیچر'' و''اہل فطرت'' کے توہّم کو بھی دور کیا گیا ہے۔ آیت کریمہ کی تفسیر بیان القرآن کے حوالہ سے ملاحظہ ہو :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُواْ رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيراً وَنِسَاء وَاتَّقُواْ اللّهَ الَّذِي تَسَاءلُونَ بِهِ وَالأَرْحَامَ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيباً۔ ۶۵

[اے لوگو! اپنے پروردگار کی مخالفت سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار (یعنی آدم علیہ السلام سے پیدا کیا (کیوں کہ سب آدمیوں کی اصل وہی ہیں) اور اس ہی جاندار سے اس کا جوڑ (یعنی اس کی زوجہ حوا کو) پیدا کیا اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلائیں۔]

اس آیت میں پیدائش کی تین صورتوں کا بیان ہے :

(۱) ایک تو جاندار کا بے جان سے پیدا کرنا کیوں کہ آدم علیہ السلام مٹّی سے پیدا ہوئے ہیں۔

(۲) دوسرے جاندار کا جاندار سے بلا طریقہ توالدِ متعارف پیدا ہونا کیوں کہ حضرت حوّا حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں جیسا کہ حدیث شیخین وغیرہما میں ہے۔ **اِنَّھُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضَلْعٍ وَاَنَّ اَعْوَجَ شَیْءٍ مِنْ ضَلْعٍ اَعْلَاہُ۔**

(۳) اور تیسرے جاندار کا جاندار سے بطریق توالد متعارف پیدا ہونا جیسا اور آدمی آدم وحوّا سے اِس وقت تک پیدا ہوتے آرہے ہیں اور فی نفسہ عجیب ہونے میں اور قدرت کے سامنے عجیب نہ ہونے میں تینوں صورتیں برابر ہیں۔ پس بعد ثبوت بالدلیل کے کسی صورت کا محض بنا بر توہم پرستی کے انکار کرنا جیسا کہ بعضے صورت ثانیہ کے (یعنی حضرت حوّا کے حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہونے کے۔ف) منکر ہیں، نہایت ہی ظلم ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس صورت کے اختیار کرنے سے کیا فائدہ ہوا؟ بدیں وجہ مدفوع ہے کہ اول تو ہم تعیین فوائدہ اسرار کا دعویٰ نہیں کرتے، نہ اس کی کوئی ضرورت۔ دوسرے ممکن ہے کہ ایک حکمت یہ بھی ہو کہ اللہ تعالیٰ کا سب طرح کی پیدائش پر قادر ہونا محقق ہو جاوے۔ تیسرے ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جو صورت اس وقت متعارف ہے اس میں کیا اسرار

وفوائد ہیں جب یہ معلوم نہیں، وہ بھی نہ سہی۔ اور یہ شبہ کہ پھر آدم علیہ السلام کی وہ پسلی بدن سے غائب ہوگئی ہوگی تو اول تو یہ ضرور نہیں۔ کیا اس کہنے سے کہ کوئی چیز مٹی سے بنی، کسی عاقل کے نزدیک لازم آتا ہے کہ پھر مٹی عالم سے غائب ہوگئی ہوگی بلکہ ہر شخص کے نزدیک مطلب یہ ہوتا ہے کہ مٹی کے بعض اجزاء سے وہ چیز بنائی گئی۔ پس اگر اسی طرح یہاں بھی کہا جاوے کہ جزو خاص نہایت قلیل مقدار کو (خدا تعالیٰ نے۔ف) لیکر اس کو اصل قرار دیا اور اپنی قدرت سے اس کو بڑھا کر ایک خاص صورت بنادی تو اس میں کیا اشکال ہے؟ دوسرے اگر بلا دلیل اس لازم کو کوئی مان لے تو اس میں کون سا محال لازم آتا ہے کہ آدم علیہ السلام کے بدن میں ایک ہڈی کم ہوگئی ہو۔'' ۶۶؎

ایک مفسر قرآن کیلئے ضروری ہے کہ جب تک معنیٰ حقیقی کا مراد لینا متعذر نہ ہو، اس وقت تک معنیٰ حقیقی کو معنی مجازی پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے، اسی طرح نصوصِ قرآنیہ میں تاویل کرنا، اور جمہور مفسرین کے موقف تردید کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ سب اہل باطل کا مشغلہ اور شعار ہے۔ جمہور مفسرین اور اہل حق کے نزدیک یہ بات ناپسندیدہ ہے کیونکہ شرعی طور پر وہ اس کو جائز نہیں سمجھتے ہیں اسی اصول کو مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مولانا دریابادیؒ سے ایک مکتوب کے جواب میں بہت ہی واضح طور پر ایک تحقیقی مراسلہ ارسال فرمایا۔ ''م'' سے ماجد اور ''الف'' سے اشرف کی علامت کے ساتھ اس تحقیقی مراسلت کو ذیل میں ملاحظہ فرمایئے :

م۔ ''سورۃ البقرہ کی آیت کریمہ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا کی تفسیر میں جمہور مفسرین نے یہی لکھا ہے کہ چاروں پرندوں کا جسم بعد ذبح مخلوط کر کے اس کا ایک ایک جزا الگ الگ چار پہاڑوں پر رکھ دیا جائے۔ اس پر جناب نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا تھا کہ یہ تفسیر تو بلا مدد روایات خود الفاظ قرآنی ہی سے نکلتی ہے نہ کہ وہ جو بعض جدید فرقے اس وقت کر رہے ہیں کہ مراد اس مجموعہ کے اجزاء یعنی چار الگ الگ افراد ہیں، اس ارشاد کی تفصیل میرے ذہن سے نکل گئی۔ از راہ شفقت وکرم مکرر ارشاد فرما دیا جائے۔

میرے ذہن ناقص میں یہ آتا ہے کہ اسم جزء کے معنی لغت میں قطعۃ من الشی کے ہیں اور فعل جزء کے

معنی پارہ پارہ کردن کے، منھن میں اشارہ اگر اسی طرف نکل آئے کہ مراد "ان میں سے ہر ایک کے" ہے نہ کہ "ان کے مجموعہ کے" تو قولِ جمہور کی بڑی تقویت ہو جاوے۔" ۶۷

حضرت تھانویؒ نے مولانا دریابادیؒ کو اس کی کافی مدلل و مفصل بحث لکھ بھیجی تھی اس تحقیقی مراسلہ کے اہم ترین نکات درج ذیل ہیں :

اُس وقت کی بات یاد نہیں، باقی اِس وقت جو ذہن میں ہے معروض ہے:

اصل مقصود اہل حق کا ان طیور کی حیات بعد الممات ہے اور اہلِ زیغ اِسی کے منکر ہیں۔ اور یہ حیات بعد الممات خواہ اجزاء بمعنی قطعات کے متعلق ہو جیسا کہ جزو کے لغوی اور حقیقی معنی بھی ہیں۔ چنانچہ کتب لغت میں تصریح ہے، اور خواہ مطلق ابعاض کے متعلق ہو جیسا کہ مجازاً جزو اس معنی میں مستعمل آیا ہے۔ کما قال الله تعالیٰ لکل باب منهم جزء مقسوم و کمافی الحدیث الرویاالصالحة جزء من ستة و اربعین جزء من النبوة او کما قال ۔اگر آیت میں حقیقی معنی قرار ہوں، جیسا اصل بھی ہے، اور اپنے محل میں دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ بدون تعذر معنی حقیقی کے مجاز پر محمول کرنا جائز نہیں، تب تو مقصود پر دلالت ظاہر ہے کہ تقطیع کے بعد عروضِ موت یقینی ہے۔ اور اگر آیت میں حقیقی معنی مراد نہ ہوں، تب بھی مقصود عقل سے ثابت ہے کیوں کہ اہل زیغ کی تفسیر پر یہ اہتمام ہی عبث ٹھہرتا ہے۔ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مانوس جانوروں کا بلانے سے چلا آنا کبھی نہ دیکھا تھا یا اب نہ دیکھ سکتے تھے؟ اس صورت میں اس کی تذکیر اور اس پر تنبیہ کافی تھی۔ اور ان دونوں دلیلوں کے ساتھ اگر اجماع کو جو کہ آثار و اخبار منقولہ عن السلف اور عدم نقل خلاف سے ثابت ہے، ملا لیا جائے تو مقصود میں اور قوت بڑھ جاتی ہے۔ ان ہی وجہ مذکورہ میں سے بعض کی طرف روح المعانی میں بھی بہ اختلاف عنوان اشارہ ہے۔" ۶۸

## طوفانِ نوح اور اہلِ جغرافیہ :

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے طوفان نوحؑ کے عموم اور بعثت "الیٰ قومہ" کے حوالے سے ایک معروضہ پیش کیا تھا اور مولانا تھانویؒ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی جس کے اہم نکات درج ذیل میں

ملاحظہ فرمائیے :

م۔ ''ص ۴۸/ تفسیر۔ س۔۲۔ ''کثرت بارش کا طوفان'' طوفان کی تفسیر میں تو متعدد اقوال آئے ہیں، اگر یہاں بھی کسی قدر مبہم و غیر معین ہی رکھا جائے تو تاریخ سے قریب تر رہے۔

ا۔ آیت فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ کے معانی متعددہ میں سے طوفان آب کی ترجیح کی بناء، میں نے اس معنی کی زیادتِ شہرت کو لکھا تھا۔ اس کے بعد ایک وجہ مُرجّح اور ذہن میں آئی، وہ یہ کہ خود قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہ لفظ اسی معنی میں وارد ہوا ہے۔ فَأَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ ۔(عنکبوت شروع رکوع ۲) ۲۹ھ

م۔ ''جب بعثت صرف الی قومہ تھی اور غرق ہونے والے حسب تصریح سورہ یونس صرف مُكَذِّبِيْن اور مُنذِرِيْنَ تھے تو طوفان کو قوم نوح تک کیوں نہ محدود رکھا جائے۔'' ۷۰ھ

حضرت مرشدؒ نے اس سوال کے جواب میں ایک نہایت قیمتی اور جامع بحث کی ہے اور اس کے بعد اصل سوال کا جواب دیا ہے جس کے نکات یہ ہیں :

ا۔ اول ایک مقدمہ سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ بعثتِ خاصہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی بہ اعتبار مجموعۂ اصول و فروع کے ہے باقی محض اصول کے اعتبار سے سب کی بعثت عام ہے، کیونکہ وہ سب شرائع میں متحد ہیں۔ اسی لیے بعض آیات میں وارد ہے۔ كَذَّبَ قَوْمُ نُوحٍ نِ الْمُرْسَلِيْنَ، حالاں کہ انہوں نے صرف حضرت نوحؑ کی تکذیب کی تھی۔ اس کی وجہ وہی ہے کہ اتحادِ اصول کے سبب ایک کی تکذیب نے سب کی تکذیب کی ہے۔

بہرحال جب اصول میں بعثت عام ہے تو قومہ میں قوم کی تخصیص اس اعتبار سے ہے کہ مخاطب اول وہی تھے اور دوسرے ان کے واسطے سے۔ اور جب بعثت عام ہے تو مُكَذِّبِيْن اور مُنذِرِيْن بھی سب کو عام ہوگا، اس لیے سب اہل ارض پر عذاب آنا مستبعد نہ ہوگا، ہاں یہ ممکن ہے کہ خود ارض پوری اس وقت آباد نہ ہو، غرض جتنی آباد تھی اس کو طوفان عام تھا، چنانچہ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّاراً۔ ظاہراً اس پر دال ہے۔ نیز اگر بعض کفار اس وقت بچ جائیں تو ان کی نسل منقطع ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اور آیت وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْن سے یہ امر یقینی ہے (کہ ان کی نسل منقطع ہوگئی۔ ف) تو کیا عدم عموم کے شق میں یہ بعد نہیں۔ نیز اگر طوفان عام نہ ہوتا تو جانوروں کا ایک ایک جوڑا رکھنے کی کیا وجہ۔ اگر ایک بھی نہ رکھا جاتا تب

بھی نسل منقطع نہ ہوتی۔ کیا یہ سبب نہیں بعد کا عدمِ عموم کے قول میں۔

م۔ اہل جغرافیہ وطبقات الارض نے عموم طوفان کا انکار شد ومد کے ساتھ کیا ہے، لیکن وطن نوحؑ میں اس کا وقوع بھی اسی شد ومد سے تسلیم کیا ہے۔

ا۔ اہل جغرافیہ کے اس دعوے پر جو دلیل قائم کی گئی ہو اس کے مقدمات دیکھنے چاہیے، تا کہ ان میں نظر کی جائے۔ ورنہ تخمینِ محض تو قابل التفات نہیں، نیز اگر طوفان عام نہ ہوتا تو حضرت نوح علیہ السلام کو بجائے کشتی بنانے کے ہجرتِ ارضِ بعیدہ کا حکم کیا جانا کافی تھا۔'' اے

اس جامع اور مکمل بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا دریابادیؒ کو جدید تعلیم یافتہ اذھان اور تاریخی تناظر سے خاص دلچسپی تھی اور ان سے قرب واتصال کی وجہ سے بعض مرتبہ ضروری اصول تفسیر اور مرشد تھانویؒ کی صحیح رہنمائی بھی نظر انداز کر جاتے ہیں۔

## توریت تنزیل لفظی ہے یا صرف معنوی :

توریت کے من جانب اللہ الفاظ نازل ہوئے ہیں یا صرف معنوی اعتبار سے اس کو منزل من اللہ کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی صحیح اصول کی طرف رہنمائی فرمائی ہے، ملاحظہ ہو درج ذیل طویل مراسلت :

م ۔ ''عام طور سے مسلمانوں میں یہ جو عقیدہ شائع ہے کہ توریت وانجیل وغیرہ قرآن مجید کی طرح کلام الٰہی ہیں، آخر اس کی شرعی بنیاد کیا ہے؟ اُن کے نفس منزل من اللہ ہونے میں گفتگو نہیں گفتگو صرف یہ ہے کہ مثل قرآن کے اُن کے بھی لفظ بہ لفظ منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ قرآن یا حدیث میں کہاں کیا گیا ہے؟ میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ ان کا نزول صرف اجمالی حیثیت سے ہوا یعنی بہ لحاظ معانی ومطالب بجز توریت کے ان احکام کے جن کے بہ صورت لوح محفوظ نازل ہونے کی صراحت قرآن مجید میں آ چکی ہے تفصیل یعنی لفظی وحرفی تنزیل صرف قرآن مجید کی ہوئی ہے۔ میں نے یہ رائے مستقلاً قائم نہیں کر لی ہے، لیکن ان کتب سابقہ کی شدید ترین کمزوریاں دیکھ دیکھ خیال یہی پیدا ہو رہا ہے اور استفادۃً یہ سوال خدمت والا میں پیش کر رہا ہوں۔

توریت وغیرہ تو پھر غنیمت ہیں، سب سے زیادہ کمزور اور بے سند تو مجھے انجیل نظر آتی ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد یہ بہ آسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یورپ میں دہریت و مادّیت کا زور اتنا کیوں بڑھتا جارہا ہے۔ ایسے بودے اور کمزور مذہب سے بغاوت تو لازمی تھی۔ اور افسوس ان بیچاروں پر ہوتا ہے کہ یہ مسیحت کو نفس مذہب کا نمائندہ سمجھ کر اور قرآن کو انجیل پر قیاس کر کے تحقیق اسلام کی طرف سے بے فکر ہو گئے ہیں۔'' ۲ے

حکیم الامت مولانا تھانویؒ کا جواب بھی بڑا ہی تفصیلی ہے جو من وعن نقل کرنے کے لائق ہے :

**ا۔** اسی سوچ میں جواب میں بھی کئی روز کی تاخیر ہوگئی، آیات کو بہت سوچا کوئی آیت ذہن میں نہیں آئی جو اس بات میں اثباتاً یا نفیاً نص ہو، تو جس طرح اس بات کا دعویٰ نہیں ہوسکتا، اسی طرح نفی کا دعویٰ بھی نہیں ہوسکتا، دونوں احتمال برابر ہیں۔ ممکن ہے کہ الفاظ نازل ہوئے ہوں اور ممکن ہے کہ معنی نازل ہوئے ہوں اور الفاظ موسیٰ علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام کے ہوں، گو وہ محفوظ نہ رہے ہوں، تو اس باب میں اُن کا درجہ حدیث کا سا ہوگا، اور اس کی بھی کہیں تصریح نہیں کہ الواح غیر ہیں تورات کے۔ بل کہ ظاہراً الواح میں تورات ہی تھی، اگر اس ظاہرے کو کافی سمجھا جائے تو توراۃ کی تو لفظی تنزیل ایک درجہ میں ثابت ہو جائے گی۔ اگر کسی وقت اس سے زیادہ کوئی بات ذہن میں آئے گی، عرض کروں گا۔'' ۳ے

تورات وانجیل کی تنزیل لفظی سے متعلق قرآن مجید کی متعدد آیات واحادیث شریفہ شاہد ہیں یہ دونوں کتابیں ہی نہیں بلکہ دوسرے صحف سماویہ بھی لفظی اور معنوی تنزیل میں مثل قرآن کریم کے رکھتے تھے اور سب کلام اللہ تھے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ موجودہ توراۃ وانجیل کا تعلق تنزیل الٰہیٰ سے ہے نہ کہ کلامِ الٰہی سے۔

''تتمۂ جواب سابق متعلق اتحاد توریت والواح: اس کی تائید ایک آیت سے بھی ہوئی۔ **قال تعالیٰ وکتبنا علیھم فیھا** (ای فی التوراۃ) **ان النفس بالنفس الخ** یہاں سے توریت کا مکتوب ہونا ثابت ہوتا ہے اور پہلی آیت سے الواح کا مکتوب ہونا بس ظاہر یہی ہے کہ دونوں متحد ہیں۔ واللہ اعلم۔'' ۴ے

قرآن کریم اور آسمانی کتب کی تنزیل ونزول سے متعلق مولانا دریابادیؒ اور مولانا تھانویؒ نے بہت ہی اہم بحث کی ہے۔ مولانا تھانویؒ نے اس سلسلہ میں اپنا معروضہ پیش کیا اور اس کا جواب باصواب لکھا کہ :

**م۔** ''آیاتِ قرآن کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ قرآنی کے لیے قرآن مجید میں مصدر تنزیل آیا

ہےاور دوسری کتابوں کے لیے عموماً انزال یا اِتیان۔ اگر کہیں لغت سے اس کی سند مل جائے کہ انزال عام ہے ہر القاء کے لیے اور تنزیل مخصوص ہے وحی لفظی کے لیے، تو مسئلہ اور زیادہ صاف ہو جائے۔''

ا۔ شاید تلاش سے مل جائے۔ باقی مشہور فرق تو یہ ہے کہ تفعیل تدریج کے لیے ہے اور افعال عام ہے۔ قرآن مجید چوں کہ تدریجاً نازل ہوا، اس لیے اس کے لیے بابِ تنزیل وارد کیا گیا، بخلاف دیگر کتب کے۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس پر مبنی ہے وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۔ دوسرے انزال جب دونوں کو عام ہے، تو اس سے وحی لفظی کا جیسے اثبات نہیں ہوتا، اس کی نفی بھی نہیں ہوتی۔''۵ے

اس تفصیلی مراسلت سے اندازہ ہوتا ہے کہ توریت تنزیل لفظی ہے نہ کہ صرف معنوی۔ اس آخری جملہ سے مزید حقیقت تو صرف قدر واضح ہوتی ہے کہ ''وحی لفظی کا جیسے اثبات نہیں ہوتا، اس کی نفی بھی نہیں ہوتی۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :

وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُون ۶ے

[دراں حالیکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اللہ کا کلام سنتے ہیں پھر اسے کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں، بعد اس کے کہ اسے سمجھ چکے ہیں اور وہ اسے (خوب) جانتے بھی ہیں۔]

لیکن مولانا دریابادیؒ نے امکان نفی کو تیقن کا درجہ دے دیا اور محض ظنی اور خیالی تحقیق (Hypothesis) کو مدلولِ قرآن ظاہر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ :

''قرآن مجید کی اعجازی کامیابیوں میں سے ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اب خود یہود بھی اپنے آسمانی صحیفوں کی تنزیل لفظی کے قائل نہیں رہے ہیں اور ان کے علماء وا کابر اب صاف صاف اقرار کرتے ہیں کہ صرف مضامین ومطالب کا القاء ہمارے انبیاء واصفیاء کے قلبِ صافی پر ہوتا تھا اور وہ حضرات انہیں الہاماتِ معنوی کی روشنی میں اپنے لفظ وعبارات میں نوشتے تیار کر دیتے تھے۔'' ۷ے

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے اس پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہود کے متعلق قرآن کریم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ''اللہ کا کلام سن لینے اور سمجھ لینے کے بعد اسے کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں۔'' اس سے یہود کے آسمانی صحیفے کی تنزیل لفظی کی نفی کیوں کر ہوگئی! بلکہ اگر غور وفکر سے دیکھا جائے تو آیت

کے ظاہری الفاظ سے تنزیل لفظی کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے تمام ہم عصر مفسرین میں تفسیرِ قرآن کے حوالے سے مولانا تھانویؒ سے سب سے زیادہ اکتساب فیض کیا ہے لیکن پھر بھی آپ سے تفسیر وتشریح میں کچھ نہ کچھ تسامح ہوا ہے۔

اسی قبیل کی مولانا دریابادیؒ کی ایک اور تحقیق وتشریح ہے جو آیت قرآنی ومکروا ومکر اللہ میں ''مکر'' کی تشریح سے تعلق رکھتی ہے :

(وَمَكَرُواْ وَمَكَرَ اللّهُ وَاللّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ)۸ے

اس آیت سے متعلق حکیم الامت حضرت مولانا اشرف تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ''اس میں اس پر دلالت ہے کہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک ہی امر حق تعالیٰ کے اعتبار سے حسن ہو اور بندوں کے اعتبار سے قبیح ہو۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ بعض اشیاء میں بالذات قبح نہیں ہوتا بلکہ کسی مفسدہ کے سبب اور مصلحت کے خالی ہونے کے سبب ہوتا ہے، تو وہ امر بندہ سے جو صادر ہوتا ہے ایسا ہی ہوتا ہے یعنی مقرون بالمفسدہ وخالی از مصلحت۔ اس لیے قبیح ہوتا ہے اور حق تعالیٰ سے جو واقع ہوتا ہے، اس میں حکمت ہوتی ہے اس لیے حسن ہوتا ہے۔''

جب یہ قاعدہ معلوم ہو گیا تو سمجھ لینا چاہیے کہ جب مکر کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ ضروری نہیں کہ مجازات (بدلہ) اور سزا ہی کے طور پر اور بلحاظِ مشاکلت ہی ہو۔

مکر کی حقیقت : کسی پر رنج اور تکلیف وہ امر کا مخفی طریقہ سے وارد کرنا، یہ حقیقت ہے مکر کی، یعنی ''**ایصال المکروه إلی الغیر علی وجه یخفی فیه**'' پھر مکر کی اس حقیقت کا صدور خدا تعالیٰ کی ذات سے قبیح نہیں ہے، یہ بھی اپنی جگہ متعین ہے، **انه یجوز صدوره تعالیٰ حقیقة وهو لیس بممتنع علیه تعالیٰ**'' ۹ے

اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اب یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں کہ تفسیر ماجدی میں مولانا دریابادیؒ نے اس موقع پر جو تحقیق بیان کی ہے وہ درج ذیل ہے کہ :

''عربی زبان میں ایک قاعدہ مشاکلت کا ہے یعنی کسی فعل کی سزا یا جواب کو بجنسہ اسی فعل کے لفظ سے ادا

کیا جاتا ہے، اوراس طرزِ ادا میں مطلق کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، مثلاً کسی نے زید پر حملہ کیا، اور زید نے اس کا جواب دیا، تو عربی محاورہ میں یوں کہیں گے کہ اس نے زید پر حملہ کیا اور زید نے اس پر حملہ کیا، حالاں کہ زید کا حملہ مطلق صورت میں نہ ہوگا بلکہ صرف سزائے حملہ ہوگی یا زیادہ سے زیادہ اُسے ''جوابی حملہ'' کہہ لیا جائے۔'' ۸۰؎

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی مذکورہ بالا تشریح ایک طرح سے نامکمل، اور مبہم سی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ مولانا دریابادیؒ نے مشاکلت کا جو قاعدہ بیان کیا ہے وہ اپنی جگہ مسلم اور صحیح ہے لیکن مولانا دریابادیؒ کی تشریح وتوضیح سے ایک طرح کا یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ''مکر'' خدا تعالیٰ کی طرف مطلق صورت میں ابتداء غیر مناسب اور قبیح ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے مولانا تھانویؒ کو ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ اصحاب سبت کا مسخ صرف معنوی ہوا تھا، صوری نہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَلَمَّا عَتَوۡاْ عَن مَّا نُهُواْ عَنۡهُ قُلۡنَا لَهُمۡ كُونُواْ قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۸۱؎

[پھر جب وہ اس چیز سے حد سے نکل گئے جس سے روکے گئے تھے، ہم نے ان سے کہہ دیا کہ ذلیل بندر بن جاؤ۔]

چنانچہ مولانا دریابادیؒ حکیم الامت نقوش وتاثرات میں لکھتے ہیں کہ :

م ۔ ''اصل حاشیہ۔ كُونُواْ قِرَدَةً خَاسِئِينَ بعض کا قول ہے مسخ صرف معنوی ہوا تھا صوری نہ تھا۔

ا۔ اس قول کو تمام اہل حق نے غلط کہا ہے، کیوں کہ بناء اس کی انکار خوارق ہے، پس یا تو اس قول کو حذف کیا جائے اور یا اس کا غیر مقبول ہونا ظاہر کیا جائے۔

م۔ یہ قول تو حضرت مجاہدؒ کا ہے، اوران کا شمار آپ ہی حضرات سے سنا ہے کہ ممتاز مفسرین تابعین میں ہے، اوراس قول کو ابن جریر طبری سے کر حافظ ابن کثیر بلکہ قاضی شوکانی تک اکثر ثقات سے نقل کیا ہے، اب انشاء اللہ یہ بڑھا دوں گا کہ یہ قول غیر مقبول وغیر معتمد وخلاف جمہور ہے۔

۱۔ کافی ہے۔''۸۲؎

اس کے بعد مولانا دریابادیؒ حکیم الامت نقوش وتاثرات کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ :

''حضرت کے اس جواب کو اب پڑھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے یہ قول ایسا ہی غیر مقبول وغیر معتمد تھا، تو ان سب حضرات کو آخر اس کے نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی، اور پھر نقل بھی بلا تردید وتغلیط۔'' ۸۳؎

مذکورہ حاشیہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا دریابادیؒ کا رجحان اصحاب سبت کے مسخ معنوی کی طرف تھا یعنی ان کے اخلاق وخصائل بندر کے ہوگئے لیکن اجسام وابدان انسان ہی کے رہے۔

مولانا تھانویؒ نے بھی ان اقوال تابعین ومفسرین کو تسلیم نہیں کیا حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ :

۱۔ ''ایسے اقوال تو ہر واقعہ میں ملیں گے تو کیا ایسے اقوال سے ان صحیح ومسلم اور عقلی قواعد کو پس پشت ڈال دیا جائے گا۔'' ۸۴؎

اس کے بعد حضرت تھانویؒ نے اس آیت کریمہ کے حوالے سے نصوص قرآنی کی حقیقی تاویل وتوجیہہ بہت ہی مفصل ومدلل انداز میں تحریر کی ہے۔

## مغضوب علیہم اور ضالین کے مصداق:

سورۂ فاتحہ کی آیت ۷ کی تفسیر میں مولانا دریابادیؒ کی رائے گرامی جمہور مفسرین سے الگ نظر آتی ہے۔

غَيۡرِ الۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡن۔۸۵؎

[نہ وہ لوگ جو زیرِ غضب آ چکے ہیں اور نہ جو بھٹکے ہوئے ہیں۔]

اس آیات کی تفسیر میں مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''اہل تفسیر عموماً اس طرف گئے ہیں کہ **المغضوب علیھم** سے مراد یہود ہیں، احادیث وآثار بھی اس کی تائید میں ہیں، اور آیۂ کریمہ **من لعنہ اللہ وغضب علیہ** کے لفظ سے بھی یہی استنباط کیا گیا ہے، لیکن ایک قوم نے مشرکین مراد لی ہے، عجب نہیں کہ آیت ان سب کے حق میں عام ہو جو ازراہِ شرارت وخبثِ نفس حق کی مخالفت دیدۂ ودانستہ کرتے رہتے ہیں۔

اہل تفسیر عموماً اس طرف گئے ہیں کہ الضالین سے مراد نصاریٰ ہیں، حدیث وآثار بھی اس کی تائید میں ہیں، اور آیتِ کریمہ قد ضلّو امن قبل واضلوا کثیراً کے لفظ سے بھی یہی استنباط کیا گیا ہے لیکن

حقیقت یہ ہے کہ مغضوب علیھم اور ضالین کے مصداق کا حصر انہیں دو مذہب والوں کے ساتھ کر دینا صحیح نہیں، جو کھلے ہوئے مشرک وملحد ہیں، ظاہر ہے کہ وہ ضلالت میں ان سے بھی بڑھے ہوئے اور غضب الٰہی کے ان سے مستحق تر ہیں''۔۸۶؎

مولانا دریابادیؒ نے اپنی تفسیر میں تقابلی مطالعۂ مذاہب (یہودیت ونصرانیت اور مجوسیت) کو کافی اہمیت دی اور اس موضوع کی نزاکت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کا بہت ہی گہرائی سے مطالعہ کیا اور تفسیری توضیحات کے جدید علوم کے مطابق منطقی طرز واستدلال سے ہم آہنگ ہوکر جو اندراجات کیے ہیں اس سلسلہ میں انہوں نے بہت ہی محتاط رویہ اختیار کیا ہے، لیکن پھر بھی اس موضوع (تقابلی مطالعہ) کے مضر پہلو یا تنقید سے نہ بچ سکے۔

## ھامان وزیرِ فرعون یا کوئی اور؟:

چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے یہودیوں کے اعتراضات سے متاثر ومرعوب ہوکر ہامان کو سرے سے وزیرِ فرعون ہونے ہی کا انکار کر دیا اور آیت کی تاویل کر دی۔

وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ۔۸۷؎

[اور ہم نے انہیں زمین میں حکومت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین کو ان میں سے وہ کچھ دکھلائیں جن سے وہ ڈر رہے تھے۔]

مولانا دریابادیؒ اس آیت کی تشریح وتوضیح میں ھامان کے متعلق رقم طراز ہیں کہ :

''ہامان کا نام یہاں پہلی بار قرآن میں آیا ہے۔ یہ کون شخص تھا؟ یہود ونصاریٰ کہتے ہیں کہ مصر میں اس نام کا کوئی شخص تھا ہی نہیں، البتہ ایران میں ایک شخص اس نام کا گزرا ہے، اور (نعوذ باللہ) قرآن نے دونوں میں خلط کر دیا۔ لیکن ہاماں کو شخصی نام فرض ہی کیوں کیا جائے؟ جس طرح اس کا عطف ''فرعون' کے ساتھ یہاں اور آگے چل کر بھی آیا ہے، اس سے تو قیاس یہی ہوتا ہے کہ جس طرح فرعون شخصی نام نہیں، بلکہ شاہی لقب تھا، اسی طرح ہامان بھی کوئی سرکاری لقب ہی تھا۔ تاریخ سے اتنا تو بہر حال ثابت ہے کہ مصر کے ایک بہت بڑے دیوتا کا نام انگریزی تلفظ میں آمن (Amon) تھا۔ اس کے بڑے پجاری کے اختیارات بادشاہ سے بس کچھ ہی کم ہوتے تھے۔ عجب کیا کہ اس بڑے

پجاری کا سرکاری لقب، عربی تلفظ میں آ کر ہامان بن گیا ہو''۔۸۸؎

چنانچہ طارق اقبال اپنے مضمون قرآن میں ہامان کا ذکر اور جدید ''سائنسی تحقیق''، میں لکھتے ہیں کہ:

''حالانکہ اثریات (Archaealogy) کے تازہ انکشاف سے وہی بات سامنے آئی، جو قرآن نے ظاہر کی تھی، کہ ہامان، فرعون کا وزیر تھا''۔۸۹؎

کسی بڑے دیوتا کے پجاری کو مجازاً وزیر کہنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ مولانا دریابادیؒ نے وضاحت کرتے ہوئے تاویل کا سہارا لیا ہے۔

اسی طرح مفسر دریابادیؒ نے سورۂ ''ص'' کی آیت کی تفسیر میں جمہور مفسرین سے ہٹ کر الگ رائے قائم کی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَى كُرْسِيِّهِ جَسَداً ثُمَّ أَنَاب۔۹۰؎

[اور ہم نے سلیمان کو امتحان میں ڈالا اور ہم نے ان کے تخت پر ایک ادھورا جسم ڈالا رجوع کیا۔]

مولانا دریابادیؒ اس آیت کی تفسیر اپنے تشریحی حاشیہ میں تحریر کرتے ہیں کہ :

''اسلامی روایتوں میں (جو نہ درایۃً ہی اعلیٰ درجہ کی ہیں اور نہ عقلاً آسانی سے قابلِ قبول) آتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے محل میں ۷۰ کی تعداد میں حرم تھے۔ اولاد کی خواہش خصوصاً غزا و جہاد کے اغراض سے دل میں پیدا ہونی قدرتی تھی۔ ایک روز آپ کے دل میں آیا کہ ایک شب میں اگر کل حرم حمل سے رہ جائیں، تو سوکڑیل جوان غزا و جہاد کے لیے ہاتھ آسکتے ہیں، ارادے پر عمل بھی فرمایا، لیکن نتیجہ حسب مراد نہ نکلا، صرف ایک خاتون کے حمل رہا اور ان سے بھی اولاد ناقص الخلقیت پیدا ہوئی۔

۷۰ یا ۱۰۰ بیویوں سے ایک ہی شب میں شب باش ہونا کیسے آسانی سے قابل قبول ہے؟ جس کا جسم لا کر کرسی پر ڈال دیا گیا''۔۹۱؎

مولانا دریابادیؒ کا یہ کہنا کہ ''روایت اعلیٰ درجہ کی نہیں ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس روایت کو امام بخاری و مسلم سمیت تمام محدثین نے نقل کیا ہے۔ اگرچہ امام بخاریؒ نے اس روایت کو اس آیت کی تفسیر کے تحت نہیں نقل کیا ہے لیکن بطور شہادت کے اس طرح کی روایتوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اور مولانا دریابادیؒ

فرماتے ہیں کہ ''نہ عقلاً آسانی سے قابل قبول ۷۰ یا ۱۰۰ بیویوں سے ایک ہی شب میں شب باش ہونا کیسے آسانی قابل قبول ہے۔''

اس سلسلے میں ضروری وضاحت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے افعال واعمال خارق عادت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو ایک معجزاتی طاقت وقوت عطا فرماتا ہے، لہٰذا حضرات انبیاء علیہم السلام کو عام انسانوں کی طاقت وقوت پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے جو کہ کسی بھی طریقے سے درست نہیں ہے، اس وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک ہی شب میں ۷۰ یا ۱۰۰ ر بیویوں سے شب باش ہونا ہرگز ناممکن اور محال نہیں ہوسکتا۔

حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام ازواج مطہرات (اس وقت (۹) ازواج تھیں) ایک ہی شب میں تشریف لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے بھی اس واقعہ کی تائید وتصدیق ہوتی ہے کہ انبیاء کرام کے افعال خارق للعادۃ ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خاں رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ :

> ''علماء نے نقل کیا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت کے چالیس آدمیوں کی طاقت کے بقدر قوت رجلیت عطا کی گئی تھی اور جنت کے ایک آدمی کی قوت دنیا کے سو آدمیوں کی قوت کے برابر ہوگی۔ اس لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے چار ہزار آدمیوں کی قوت کے برابر قوت دی گئی تھی۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو سولہ ہزار بیویوں سے شادی کا حق تھا۔ ایسی صورت میں بتلایئے کہ بیویوں کے ساتھ ایک وقت میں جماع کس طرح اور کیونکر قابل اعتراض ہوسکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنی زبردست خارق للعادۃ قوت کے باوجود وقت واحد میں صرف نو (۹) بیویوں پر اکتفا کرنا یہ بھی بطور خرق عادت آپ ہی کی خصوصیت ہے جیسا کہ باوجود فاقون اور قلیل خوراک کے رکانہ پہلوان کو پچھاڑ دینا اور غزوۂ خندق میں پتھر کی چٹان کو جس کو توڑنے سے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت عاجز ہوگئی تھی کدال مار کر ریت کی طرح بہا دینا۔ آپ کے خرق عادت جسمانی قوت کی واضح دلیل ہے''۔[۹۲]

مولانا دریابادیؒ نے قرآن کریم کے ترجمہ کے سلسلہ میں عام طور سے نظم قرآنی کی رعایت کا اہتمام خوب

رکھا ہے لیکن بہت سے مقامات پر وہ دوسروں کا ترجمہ قبول کر لیتے ہیں اوراس سے متاثر ہو جاتے ہیں حالاں کہ وہ لفظ قرآنی کے خلاف ہے۔ مثلاً قرآن مجید کی آیت بقرۃ کا ترجمہ اکثر مفسرین نے گائے کے معنیٰ سے کیا ہے مگر مولانا دریابادیؒ نے بعض مفسرین کے زیر اثر اسے گائے اور بیل دونوں معنی میں مشترک سمجھ لیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُواْ بَقَرَةً قَالُواْ أَتَتَّخِذُنَا هُزُواً قَالَ أَعُوذُ بِاللّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ۔ ۹۳

[اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہیں اللہ حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔]

مولانا دریابادیؒ نے اس آیت میں ترجمہ تو گائے ہی کا کیا ہے، لیکن تشریحی حاشیہ میں بعض مفسرین کے ترجمہ کو بھی کسی نہ کسی حد تک قبول کیا ہے۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں کہ :

''بقرہ۔ اصلاً صرف گائے کے لیے ہے اور ثور کا مؤنث ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے اُسے گائے اور بیل دونوں کے لئے عام رکھا ہے اور یہاں اس سے بیل مراد لی ہے''۔ ۹۴

جن الفاظ میں قرآن کریم کا نزول ہوا۔ ان کے ایک مخصوص معانی اور مخصوص اصطلاحات ہیں، عام طور سے وہ ہر جگہ یکساں ہی ہیں۔ جیسے صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، ربا، صدقہ، ونسک یہ ان الفاظ قرآنیہ میں نہیں ہیں جو مختلف مقامات واحوال پر مختلف معانی ومفاہیم کے لیے لائے گئے ہیں۔ جیسے امت، ملت، دین، حق وغیرہ۔ لیکن اس سلسلہ میں مولانا دریابادیؒ کا موقف بالکل مختلف ہے، وہ اپنے افتتاحیہ نمبر دو میں لکھتے ہیں کہ اسلامی اصطلاحات بہت بعد کی پیداوار ہیں۔

چنانچہ مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''اسلامی اصطلاحیں بہت بعد کی چلی ہیں، قدیم لفظی ومعنوی اشتراک سے دھوکا نہ کھانا چاہئے، دور قبل اسلام میں وہی لفظ اگر کسی کی زبان سے ادا ہو تو اس کا ترجمہ اسلامی اصطلاح میں کر دینا کہیں تو غیر ضروری ہوگا، اور کہیں صریح غلطی مثلاً ایک لفظ صلوٰۃ ہے، جس کا اردو ترجمہ اسلامی اصطلاح میں نماز ہے، لیکن حضرت شعیبؑ کی قوم جب اس کا استعمال کرتی ہے تو ضروری نہیں کہ اس موقع پر بھی اس کا ترجمہ ''نماز'' ہی سے کیا جائے، اوراس کے تصور میں قیام، قعود، رکوع، سجود وغیرہ نمازِ اسلامی کے ارکان

کوشامل رکھا جائے بلکہ ''پوجا'' یا ''پوجا پاٹ'' بھی کافی ہوسکتا ہے'' ۔95

صلوٰۃ تمام انبیاء کرام اور ان کے مومنوں کے ہاں تھی اور جتنے بھی آسمانی مذاہب ہیں ان میں نماز کا حکم دیا گیا تھا، ہوسکتا ہے کہ ادائیگی کے طریقے میں، ارکان واجبات میں، اوراد واذکار میں کچھ فرق رہا ہو، لیکن جہاں تک لفظ ''صلوٰۃ'' کا تعلق ہے تو قرآن نے اسلام اور تمام آسمانی مذاہب کے لئے لفظ ''الصلوٰۃ'' یا ''صلوٰتک'' کا ہی استعمال کیا ہے، ان کے مابین کوئی فرق وامتیاز باقی نہیں رکھا، مولانا دریابادیؒ کا حضرت شعیبؑ کی صلوٰۃ کو ''پوجا پاٹ'' سے تعبیر کرنا سراسر قرآن کی واضح اور متعین تعبیر کے خلاف ہے، جو ان کے افکار ومعلومات پر مبنی ہے۔ اسی طرح مولانا دریابادیؒ کا جمہور مفسرین سے ہٹ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو فرشتہ قرار دیئے جانے کے بجائے دیوتا قرار دینا یہ ان کی ذاتی افکار وآرا ہیں اور قرآن مجید کی واضح اور روشن تعبیر کے خلاف ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَراً إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ۔96

[اور بولیں حاش للہ یہ آدمی نہیں، یہ تو کوئی دیوتا ہے اونچے قسم کا۔]

مولانا دریابادیؒ اس آیت کی تشریح میں تحریر کرتے ہیں کہ :

''تقویٰ اور عفاف میں بھی اپنی مثال آپ تھے، جاہلی متمدن قوم کی عورتیں تقویٰ اور عفاف کے اس معیار سے بھلا کیا واقف؟ دنگ ہوگئیں۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اپنی زبان میں بول اٹھیں کہ یہ نوجوان انسان کاہے کو ہے، یہ تو کوئی دیوتا ہیں، آکاش سے اُترے چلے آرہے ہیں'' ۔97

مولانا دریابادیؒ کا یہ کہنا کہ یہ قول مشرک عورتوں کا ہے اور یہ ملك کے تصور سے ہی ناآشنا ہیں۔ غلط افکار پر مبنی ہے کیونکہ جاہلی متمدن اقوام اور مشرکوں کے یہاں فرشتوں کا تخیل وتصور رہا ہے۔ خود قرآن مجید اس بات کی تصدیق وتصویب کرتا ہے کہ مشرکین فرشتوں کے قائل تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ اگر رسول اپنے دعویٰ رسالت میں سچے ہیں تو فرشتے ہمارے پاس کیوں نہیں آتے؟ یہ الگ بات ہے کہ ان کے یہاں دیوتا پرستی کی بیماری فرشتوں کے فرائض کی غلط تشخیص سے پیدا ہوتی ہے، آگ کے فرشتہ کو اگنی دیوتا اور بارش کے فرشتہ کو اندر

دیوتا تصور کرلیا ہے۔مولانا دریابادیؒ نے ایک دوسرے مقام پر فرشتہ اور دیوتا کے درمیان بنیادی فرق بیان کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :

''فرشتہ اور دیوتا دونوں کے تصور کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے،فرشتہ تمام تر مخلوق اور عبد ہوتا ہے، اللہ کے حکم سے موجودات کے کسی خاص شعبہ پر مامور جس سے اثنائے خدمت میں کسی غلطی،لغزش یا خیانت کا احتمال ہی نہیں،دیوتا اس کے برعکس خود ایک مستقل بالذات وخود مختار وجود ہوتا ہے اور عبد نہیں بلکہ معبود''۔۹۸؎

**آیت وضو اور قرأت نصب:**

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آیت وضو میں ارکانِ وضو کی تعلیم دی ہے،اور یہ آیت احکامِ قرآنی کی اہم ترین آیتوں میں شمار ہوتی ہے۔اس آیت میں چوتھا فرض یہ ہے کہ(**وارجلکم الیٰ الکعبین**)اور اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت (دھولیا کرو) اس کو بعض حضرات نے مسح والے قریبی کلمہ (وامسحوا برؤسکم) سے وابستہ کرکے''ل'' کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ایک طرف مولانا دریابادیؒ نے قراءت نصب کے سلسلہ میں متعدد فقہاء کے اقوال نقل کئے ہیں اور سُنّت رسولؐ اور تعامل صحابہؓ سے غسل رجلین کو ثابت کیا ہے،دھونے کی قرأت اور حکم دونوں کو جمہور کا مسلک بھی کہا ہے لیکن دوسری طرف مسح رجلین اور قرأت جر کو شیعہ امامیہ کا مذہب ہی نہیں بلکہ بعض اکابر اہلِ سنت اور بعض صحابہؓ وتابعین کا بھی مسلک قرار دیا ہے۔لہٰذا جب غسل رجلین سنت رسولؐ اور تعامل صحابہؓ سے ثابت ہے،تو مسح رجلین اور قراءتِ جرّ کیسے متواتر ہوسکتی ہے۔

**ذوالقرنین کا سفر ثالث اور مولانا دریابادیؒ کا موقف :**

قرآن کریم نے ذوالقرنین کا واقعہ بیان کیا ہے،کہ ذوالقرنین ایک نیک دل اور انصاف پسند حکمران تھے اور ایک عظیم سلطنت کے مالک تھے،اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے تھے انہوں نے اپنی پوری زندگی میں متعدد اسفار کئے،اور فتح وکامرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔انہوں نے سب سے پہلے مغرب کا سفر کیا اور پھر مشرقی سمت کا رُخ کیا،مشرف ومغرب کے فاتحانہ سفر کے بعد انہوں نے ایک تیسرا سفر بھی کیا جس کی تفصیل قرآن کریم کی اس آیت سے ہورہی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

حَتَّى إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْماً لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلا ۔۹۹

[یہاں تک کہ جب وہ پہاڑوں کے درمیان پہنچے تو اُن کے اوپر ایک قوم کو پایا جو گویا کوئی بات ہی نہیں سمجھتے تھے۔]

ذوالقرنین کا یہ آخری سفر کس سمت میں تھا؟ اکثر مفسرین اور مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ سفر شمال کی طرف تھا، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر معارف القرآن میں بیان کرتے ہیں کہ: قرآن میں اس سمت کا نام نہیں لیا مگر آبادی زیادہ جانبِ شمال ہی ہے، اس لئے اکثر مفسرین نے اس سفر کو شمالی ممالک کا سفر قرار دیا، تاریخی شہادتیں بھی اس کی مؤید ہیں۔۱۰۰

مگر اس سلسلہ میں مولانا دریابادیؒ کی جغرافیائی تحقیق مختلف ہے چنانچہ مولانا دریابادیؒ رقم طراز ہیں کہ :

''قرآن مجید میں اس سمت کی بابت کوئی اشارہ نہیں۔قدیم مفسرین نے اپنے وقت کی جغرافی معلومات پر اعتماد کر کے لکھ دیا ہے کہ سمت شمال مراد ہے لیکن اس پر کوئی دلیل نقلی یا عقلی قائم نہیں کی ہے۔ان کے قیاس کی بنیاد تمام تر یہ ہے کہ قدیم جغرافیہ میں انسانی آبادی عموماً شمال ہی کے سمت دکھائی گئی ہے۔

اغلب یہ ہے کہ اس تیسرے جنگی سفر کی سمت بھی مشرق ہی تھی۔اور چونکہ سمت مشرق کا ذکر ابھی اوپر آچکا ہے اس لئے کسی مزید تصریح وتعیین کی ضرورت نہ تھی''۔۱۰۱

مولانا دریابادیؒ کی تفسیر وترجمہ میں یہ چند باتیں بھی نقد ونظر کا ہدف بن سکتی ہیں۔

☆ مولانا دریابادیؒ نے صوفیائے کرام کے اقوال بالخصوص مرشد تھانویؒ کے حوالے سے بہت کثرت سے نقل کئے ہیں جس طرح علامہ آلوسی بغدادیؒ نے آیات قرآنیہ کو صوفی تعبیرات کے ماتحت کیا ہے اسی وجہ سے ان کی قرآنی وتفسیری حیثیت مجروح ہوئی ہے۔حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو بھی روح المعانی کے مصنف علامہ آلوسی بغدادیؒ اسی باب تصوف کی وجہ سے بہت پسند تھے، اگرچہ حضرت تھانویؒ نے ان کے منہج کو اختیار نہیں کیا اور نہ ہی علامہ آلوسی کی طرح کلامِ الٰہی کو کلامِ صوفیہ کے ماتحت کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حضرت تھانویؒ نے متعدد مقامات پر صوفیانہ تشریحات کے

ذریعہ آیات قرآنیہ کی تہ در تہ جہات ومعانی کی گرہیں کھولی ہیں مگر وہ خالص صوفیانہ بھی نہیں ہیں۔ پیش رومفسرین وشارحین کی تفسیری تعبیرات میں ان کا ثبوت ملتا ہے، پھر بھی یہ صوفیانہ تشریحات محض لطائف وظرائف کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔ مرشد تھانویؒ اور اکابر مفسرین کے اقوال وتعبیرات کتاب وسنت پر مبنی ہیں لیکن مولانا دریابادیؒ نے اصل حوالہ دینے کے بجائے صرف مرشد تھانویؒ کا حوالہ دیا ہے، یہ منہج بڑا ہی عجیب وغریب لگتا ہے۔ اصل میں مولانا دریابادیؒ نے جامعیت کا تصور نہایت وسیع سمجھ لیا ہے، یہ صحیح اس وقت ہوسکتا ہے جبکہ ہر رطب ویابس سے پاک ہو۔

☆ قرأت قرآنی کے سلسلہ میں بھی مولانا دریابادیؒ اپنے پیش رومفسرین میں کسی نہ کسی سے متاثر ومغلوب ضرور ہوئے ہیں۔ اور ان مباحث قرأت قرآنیہ میں بھی مفسر تھانویؒ کی اثر پذیری نظر آتی ہے، اور یہ کہنا کسی نہ کسی حد تک صحیح ہوگا کہ حضرت تھانویؒ فن قرآت کے باب میں بہت زیادہ ماہر نہیں تھے، بلکہ ایک روایتی مفسر تھے۔

☆ اکثر مفسرین حضرات سورتوں کے فضائل بیان کرتے ہیں مگر مولانا دریابادیؒ نے اپنی ''تفسیر ماجدی'' میں اس کا اہتمام والتزام نہیں کیا۔

☆ متن حواشی میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں مولانا دریابادیؒ عربی وفارسی کی عبارتیں نقل کرتے ہیں۔ مگر ان کا اُردو ترجمہ نہیں کیا، علماء ودانشور تو ان عبارتوں سے استفادہ کرلیں گے مگر عوام الناس کے لیے ان عبارتوں سے استفادہ کرنا بڑا ہی مشکل ہے۔

☆ مولانا دریابادیؒ نے متن حواشی میں کچھ مقامات کی تفسیر بہت ہی مختصر تحریر کی ہے حالانکہ وہ مقامات تفصیل طلب ہیں۔

☆ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا دریابادیؒ اردو کے ادیب اعظم تھے اور ایک خاص طرز کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی تھے، ان کی صحت زبان ومحاورہ اہلِ علم وادب بالخصوص اردو داں طبقہ کے ہاں مسلم ہے اس کے باوجود ''تفسیر ماجدی'' کے بعض مقامات پر مشکل الفاظ کے معانی اور تذکیر وتانیث میں بھی بسا اوقات الجھن پیش آتی ہے۔

مولانا دریابادیؒ ''تفسیر ماجدی'' کی جلد اوّل میں لکھتے ہیں کہ :

''اسی طرح مشائخ محققین بعض دفعہ مباحات سے روک دیتے ہیں کہ کہیں غیر مباح کی طرف ''منجرّ'' نہ ہو جائے''۔۱۰۲

☆ ایک اُردو ادیب کے قول کے مطابق حرکات کو اردو میں پیش، زبر، زیر کہتے ہیں اور عربی زبان میں ضمہ، فتحہ، کسرہ کہتے ہیں، لیکن اردو ہی میں زیر کو ''خفض'' کہنا اردو کے ساتھ سراسر زیادتی ہے اس طرح کی بہت سی مثالیں ''تفسیر ماجدی'' میں مل سکتی ہیں۔ہم کم علموں نے آج تک ''عمل دخل'' تو سنا تھا لیکن مولانا دریابادیؒ نے اسے ''عملہ دخلہ'' بنا دیا یہ نہ پڑھا تھا اور نہ سنا تھا۔

چنانچہ مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ :

''جب سے سائنس اور علوم طبعی کا عملہ دخلہ پوری طرح شروع ہو گیا............'')۔۱۰۳

ان مثالوں میں کاتب و ناشر کی بھی غلطی ہو سکتی ہے لیکن خاص طور سے اصل حواشی اور افتتاحیوں کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب مولانا دریابادیؒ کے قلم سے ہی لغزشیں ہوئی ہیں۔

بہر کیف کوئی بشر خطاؤں اور لغزشوں سے مبرا و منزہ نہیں ہے۔اس طرح کی لغزشیں ترجمہ و تفسیر، تشریح و تعبیر اور زبان و بیان ہر جگہ ہو سکتی ہے، لیکن پھر بھی تفسیر ماجدی اپنی تمام تر بشری محدودیت کے باوجود اردو تفاسیر میں ایک امتیازی شان کی حامل ہے۔

# مراجع ومصادر


۱۔ الاعلیٰ: ۱۸۔۱۹

۲۔ ابومحمد بن اسمٰعیل بن بردزبۃ البخاریؒ (م ۲۵۶ھ) الامام الصحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ قولوآ منّا باللہ وما انزل الینا، مکتبہ الاصلاح لال باغ، مرادآباد، بدون تاریخ (یوپی) جلد ثانی، ص:۶۴۴

۳۔ البقرۃ: ۶۱

۴۔ عبدالماجد دریابادیؒ مولانا، تفسیر ماجدی، مکتبہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۱۴ء، جلد اوّل، ص: ۱۶۲

۵۔ الاعراف: ۸۰

۶۔ تفسیر ماجدی، جلد دوم، ص: ۳۴۲

۷۔ یوسف: ۱۸

۸۔ تفسیر ماجدی، جلد سوم، ص: ۱۶۱

۹۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، تاریخ تصوف، مکتبہ دارالکتاب، لاہور، بدون تاریخ، ص: ۹۹

۱۰۔ محمد حسینی، سید، جوامع الکلم، (مرتب: محمد حسینی اکبر) نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۵ء، ص: ۲۸

۱۱۔ ابونصر، عبداللہ بن علی السراج الطّوسی، کتاب اللمع فی التصوف، نیکلیسون، لیڈن، ۱۹۱۴ء، ص: ۲۲

۱۲۔ ابوعبداللہ حاکم، محمد بن عبداللہ، المستدرک علی الصحیحین، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۰ء، ج۱، ص: ۱۲۹

۱۳۔ ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینی (م ۲۷۵ھ) الامام سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، باب خبز الشعیر اشرفی بکڈپو، بدون تاریخ، دیوبند، ص: ۲۴۸

۱۴۔ عبیداللہ فہد فراہی، ڈاکٹر، تصوف ایک تجزیاتی مطالعہ، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص: ۲۴

۱۵۔ ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا، سید، تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک، مکتبہ مجلس تحقیقات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء، ص: ۲۹

۱۶۔ البقرۃ: ۹

۱۷۔ تفسیر ماجدی، جلد اوّل، ص: ۹۷

۱۸۔ البقرۃ: ۱۴۴

۱۹ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۲۹۲

۲۰ البقرۃ:۲۰

۲۱ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۹۱

۲۲ الجمعۃ:۶

۲۳ تفسیر ماجدی، جلدہفتم، ص:۲۲۵

۲۴ البقرۃ:۵۷

۲۵ تفسیر ماجدی، جلدہفتم، ص:۱۵۶

۲۶ سعودعالم قاسمی، پروفیسرمحمد، قرآن کی دعوت فکر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۰ء، ص:۱۱۴ تا ۱۱۵

۲۷ تفسیر ماجدی، جلداول، مقدمہ، ص:۱۰

۲۸ البقرۃ:۲۲

۲۹ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۹۵

۳۰ ایضا، ص:۹۵

۳۱ البقرۃ:۲۹

۳۲ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۱۱۱

۳۳ مسلم بن الحجاج القشیری، ابوالحسین، الامام، صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب فصل الوضوء، مکتبہ کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، بدون تاریخ، جلداول، ص:۱۱۸

۳۴ المائدۃ:۶

۳۵ تفسیر ماجدی، جلددوم، ص:۲۴

۳۶ ایضاً ص:۲۴

۳۷ ایضاً، ص:۲۵

۳۸ ایضاً، جلددوم، ص:۲۱

۳۹ البقرۃ:۲۲۹

۴۰ تفسیر ماجدی، جلداوّل، ص:۴۴۸

۴۱ ابوسفیان اصلاحی، ڈاکٹر، مطالعات قرآن، مطبع آروراپرنٹرس اینڈ پبلشر دہلی، جولائی ۲۰۰۵ء، ص:۱۸۰

۴۲ ایضاً،ص:۱۸۰

۴۳ تفسیر ماجدی، جلد اول،ص:۴۰

۴۴ ایضاً، جلد دوم،ص:۳۳۸

۴۵ ایضاً، جلد دوم،ص:۲۲۸

۴۶ ایضاً، جلد اوّل،ص:۲۲۱،۲۲۲

۴۷ تحسین فراقی، ڈاکٹر، عبدالماجد دریابادیؒ احوال وآثار، ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲ کلب روڈ، لاہور ۱۹۹۳ء،ص:۲۲۵

۴۸ تفسیر ماجدی، جلد دوم،ص:۳۴۵، ایضاً، جلد سوم،ص:۱۲۸

۴۹ تفسیر ماجدی، جلد اول،ص:۵۰

۵۰ یوسف:۴۹

۵۱ تفسیر ماجدی، جلد سوم،ص:۱۸۹

۵۲ ایضاً، جلد پنجم،ص:۲۹۷

۵۳ البقرۃ:۳۵

۵۴ تفسیر ماجدی، جلد اول،ص:۱۲۵

۵۵ البقرۃ:۳۸

۵۶ تفسیر ماجدی، جلد اول،ص:۱۳۱

۵۷ البقرۃ:۱۸۷

۵۸ تفسیر ماجدی، جلد اول،ص:۳٦۴ تا ۳٦٦

۵۹ البقرۃ:۱۸۵

٦۰ تفسیر ماجدی، جلد اول،ص:۳۵۹

٦۱ تفسیر ماجدی، جلد اول،ص:۱۲۴

٦۲ ایضاً، جلد دوم،ص:۴۱۲

٦۳ الاعراف:۱۸۹

٦۴ عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا، حکیم الامت، نقوش وتاثرات، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء،ص:۳٦۳

٦۵ النساء:۱

۶۶؎ اشرف علی تھانویؒ، مولانا، بیان القرآن، مکتبہ رحمانیہ، اقرأ سینٹر اردو بازار لاہور، بدون تاریخ، جلد اول، ص:۳۲۳

۶۷؎ حکیم الامت، نقوش و تاثرات، ص:۵۱۱

۶۸؎ ایضاً، ص:۵۱۲

۶۹؎ ایضاً، ص:۴۱۰

۷۰؎ ایضاً، ص:۴۴۴

۷۱؎ ایضاً، ص:۴۴۴۔۴۴۵

۷۲؎ ایضاً، ص:۳۷۸

۷۳؎ ایضاً، ص:۳۷۸

۷۴؎ ایضاً، ص:۳۸۳

۷۵؎ ایضاً، ص:۳۸۶۔۳۸۷

۷۶؎ البقرۃ:۷۵

۷۷؎ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص:۱۸۵

۷۸؎ اٰل عمران:۵۴

۷۹؎ بیان القرآن

۸۰؎ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص:۵۹۹

۸۱؎ الاعراف:۱۶۶

۸۲؎ حکیم الامت، نقوش و تاثرات، ص:۳۵۸

۸۳؎ ایضاً، ص:۳۵۸

۸۴؎ ایضاً، ص:۵۲۹

۸۵؎ الفاتحہ:۷

۸۶؎ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص:۶۱

۸۷؎ القصص:۶

۸۸؎ تفسیر ماجدی، جلد پنجم، ص:۱۲۶

۸۹؎ طارق اقبال، (مضمون)، قرآن میں ہامان کا ذکر اور جدید سائنسی تحقیق''، روزنامہ خبریں، ۵/نومبر ۲۰۱۵ء

۹۰ سورۂص:۳۴

۹۱ تفسیر ماجدی، جلدششم،ص:۸۷

۹۲ سلیم اللہ خاں صاحب، مولانا نفحات التنقیح، مکتبہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی کراچی، ۲۰۰۲ء، ص:۱۸۸

۹۳ سورۃ البقرۃ:۶۷

۹۴ تفسیر ماجدی، جلداول،ص:۱۷۷

۹۵ ایضاً،ص:۴۲

۹۶ سورۃ یوسف:۳۱

۹۷ تفسیر ماجدی، جلدسوم،ص:۱۷۴

۹۸ ایضاً، جلداول،ص:۱۶

۹۹ سورۃ الکھف:۹۳

۱۰۰ شفیع صاحبؒ، مفتی محمد، معارف القرآن، ناشر فرید بکڈپو، دہلی۔۶، ۱۹۹۸ء، جلدپنجم،ص:۲۳۷

۱۰۱ تفسیر ماجدی، جلد چہارم،ص:۱۵۷

۱۰۲ ایضاً، جلداول،ص:۱۲۵

۱۰۳ ایضاً، جلداوّل،ص:۳۰

☆☆☆

# باب چہارم

## یہودیت "تفسیر ماجدی" کی روشنی میں

**فصل اول:** یہودیت: آغاز وارتقاء اور یہودیت کا مختصر تاریخی پس منظر

**فصل دوم:** حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے دور میں بنی اسرائیل کا عروج وزوال اور بنی اسرائیل پر اللہ کے احسانات

**فصل سوم:** یہود کے ایمانی واخلاقی بگاڑ اور بعض عقائد باطلہ

☆☆☆

## فصل اول:

# یہودیت: آغاز وارتقاء اور یہودیت کا مختصر تاریخی پس منظر

### لفظ یہود کی لغوی تحقیق اور وجہ تسمیہ:

لغات کے متخصصین نے لفظ ''یہود'' کی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ھــاد یھــود ھــوداً کے معنی رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں جیسا کہ ابن فارس وغیرہ نے لکھا ہے۔ ''واماالیھود فمن ھاد یھود ای تـاب ھـوداً وسـمـوا بہ لانھم تابوا عن عبادۃ العجل [1] جہاں تک اسم یہود کا تعلق ہے تو یہ ھاد یھود سے جس کے معنی ہے توبہ کرنا، لوٹنا۔ ان کا یہ نام بچھڑے کی عبادت سے توبہ کرنے کی وجہ سے پڑا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے: ''إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ''۔[2] [ہم نے آپ کی طرف رجوع کیا یعنی توبہ کی۔]

لسان العرب میں ابن منظور یہود کی لغوی توضیح میں لکھتے ہیں کہ:

" الھـود التـوبۃ ، ھـاد، یھـود ھـودا وتھود ، تاب ورجع الی الحق فھو ھا ئد ویھود اسم للقبیلۃ''[3]

[ھود بمعنی توبہ یہ ھاد یھود ھوداوتھوّد سے مصدر ہے جس کا معنی ہے حق کی طرف لوٹا اور یہود ایک قبیلہ کا نام ہے۔ اس کے بعد ابن منظور نے مختلف اقوال بیان کیے ہیں۔ اس کے معنی توبہ کرنا بخشش کی طرف قریب ہونا۔]

اللہ تعالی فرماتے ہیں:

فَتُوبُواْ إِلَى بَارِئِكُمْ [4]

[اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو۔]

اسی طرح اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَالَّذِينَ هَادُواْ [5]

[جولوگ ایمان لائے اور جولوگ یہودی ہوئے۔]

حدیث مبارکہ میں ہے:

عـن ابـی هـريـرةؓ انه كان يقول قال رسول اللهﷺمامن مولودالا يولد على الفطرة فابواه يهوّد انه و ينصرانه ويمجسانه ۶

[حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ آپﷺ نے فرمایا کہ ہر بچہ دین وفطرت پر پیدا ہوتا ہے پس اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا آتش پرست بنا دیتے ہیں۔]

مشہور لغوی راغب اصفہانی لفظ یہود کی تشریح اسطرح کرتے ہیں:

''ہ ۔ و ۔ د ۔ الھود ۔ کے معنی نرمی کے ساتھ رجوع کرنے کے ہیں اس سے التھوید (تفعیل) ہے عرف میں ھود بمعنی توبہ کے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں اناھدنا الیک ۔ بعض نے کہا لفظ یہود بھی انـا هـدنـا اليك سے ماخوذ ہے۔ یہ اصل میں ان کا تعریفی لقب تھا۔ لیکن ان کی شریعت منسوخ ہونے کے بعد ان پر بطور جنس بولا جاتا ہے نہ کہ تعریف کے لیے۔ ھادفلاں کے معنی یہودی ہو جانے کے ہیں''۔ ۷

## یہود کی اصطلاحی تعریف :

یہودی دانشور اس بات کے معترف ہیں کہ یہودیت کی جامع اور آسان تعریف کرنا تقریباً ناممکن اور بے انتہا مشکل کام ہے۔

جامع اردو انسائیکلوپیڈیا میں ''یہود'' عنوان کے متعلق لکھا ہے:

''یہودی: لفظ یہودی ہودا سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں یہودی مذہب کی پیروی کرنے والے۔ یہ اسرائیلی بھی کہلاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ اسرائیلی قبیلے سے ہیں۔ جنوب مغربی ایشیا کے سامی بولنے والی قوموں سے ان کا گہرا تعلق ہے توریت کے مطابق یہودی حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے حضرت اسحٰق کی اولاد ہیں۔ ان کا قبیلہ عیسائیت سے کئی سو سال پہلے مصر کے شمال مشرقی حصہ میں بس گیا تھا اور زراعت کرتا تھا۔ فرعون مصر رمسیس دوم کے دور میں یہ ظلم وتشدد کا شکار بنے اور حضرت موسیٰؑ کی سر کردگی میں یہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ کوہ سنائی پر حضرت موسیٰؑ پر احکام عشرہ (Ten Commadments) نازل ہوئے''۔ ۸

البتہ یہودیت کی جامع ترین تعریف یہ ہے:

''یہویت وہ مذہب ہے جس میں ایک خدا کی وحدانیت اوراس پر ایمان کے ساتھ ساتھ ایک نسل کی عظمت و برتری کا عقیدہ داخل دین ہے۔''

قرآن مجید میں الیھود یھود یا، صیغہ جمع ''ھودا'' اور "الذین ھادو "جولوگ یہودی بن گئے) نیز بنی اسرائیل اور آل عمران کی اصطلاحیں کم وبیش مترادفات کے طور پر استعمال ہوئیں ہیں۔ اگر چہ ''یہودی'' کی اصطلاح یا تو قدیم سلطنت یھود ا کے باشندوں، یا یہودا بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد یا مذہب یھود پر عامل شخص کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔

اور بنی اسرائیل (اولاد یعقوبؑ) کا لفظ وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور حضرت اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام کے تمام بیٹوں کی اولاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تاہم عام طور پر اس سے مراد حضرت موسیٰ کی شریعت کو ماننے والے لوگ ہیں مگر چوں کہ یہودی مذہب کی تعلیمات فقط اولاد یعقوب تک محدود رہی ہیں اس لیے یہ لفظ ایک نسلی گروہ کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔[9]

اس دنیا میں زیادہ تر ادیان و مذاہب کا نام ان کے بانیوں کے نام پر رکھا گیا ہے جیسے جین مت جو مہاویر جین سے منسوب ہے اور بدھ مت جو گوتم بدھ سے منسوب ہے۔ لیکن یہودیوں کے ساتھ ایسا نہیں کیوں کہ یہودی حضرات یہ نہیں کہتے کہ ان کے دین کے مؤسس و بانی جناب حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے ''یہودا'' تھے بلکہ وہ اپنا جدّ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف دی سوشل سائنسز میں لکھا گیا ہے کہ:

> لفظ ''یہودی'' دو طرح کے مجموعات سے تعلق رکھنے والے گروہوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اول: وہ لوگ جو انجیل یا اس کے بعد کے صحیفے کی رو سے کسی ایسے خاندان یا نسل میں پیدا ہوئے جو کہ انجیل کی رو سے یہودی کہلاتے ہیں۔
>
> دوم: یہ لفظ اعتقادات کے مجموعے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو یہودیت کہلاتا ہے اور ان عبادات کے طریقے پر عمل پیرا ہوتا ہے جو کہ اس کا تقاضا کرتی ہیں۔ یعنی ایسا فرد جو کہ یہودی عقائد کا پیروکار ہو اور ان پر یقین رکھتا ہے ہو''۔[10]

اس تعریف کی رو سے ایک خاص نسل سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ یہودی کہے جاتے ہیں اور ان کے افکار، اعمال، عادات و اعتقادات کا مجموعہ یہودیت کہلاتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا امریکا کا مقالہ نگار رقم طراز ہے کہ:

''یہودیت'': یہودی لوگوں کا مذہب، جو قریب ۳ ہزار برس پر محیط تاریخ کا حامل ہے۔ انجیل میں بھی یہودیت کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے جو کہ صدیوں قبل راہبوں کی تحریروں میں لکھی گئی اور نہ ہی اس کے لیے مذہب کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس کے صرف رسم و رواج قواعد و ضوابط بیان کیے گئے ہیں جو کہ زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہیں، نہ ہی انجیل یا یہودی تحریرات میں اس کو تسلیم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ بسا اوقات ''یہودیت'' کے نظریے کو لفظی شکل دینے کی کوشش کی گئی لیکن پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی''۔[11]

تفسیر ابن کثیر میں یوں لکھا ہے:

''لفظ یہود ھوادہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مودۃ اور دوستی کے ہیں یا یہ تھود سے ماخوذ جس کے معنی توبہ کے ہیں۔ جیسے قرآن میں ہے انا ھدنا الیک حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں اے اللہ ہم تیری طرف توبہ کرتے ہیں۔ پس انہی دو وجوہات کی بنا پر یہود کہا گیا۔ توبہ اور آپس کی دوستی کی وجہ سے اور بعض کہتے ہیں وہ یہ اولاد یہود کی بنا پر کہا گیا اور ایک قول یہ ہے کہ تورات پڑھتے وقت بنی اسرائیل ہلتے تھے اس لیے انہیں یہود یعنی حرکت کرنے والا کہا گیا''۔[12]

مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی کہتے ہیں کہ:

''یہودا یعقوب علیہ السلام کے ان بارہ بیٹوں میں سے چھوٹے بیٹے ہیں جن سے بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں کا ظہور ہوا جو یشوع کے زمانے میں مفتوحہ علاقہ انہی لوگوں کے درمیان تقسیم ہوا اور اس تقسیم میں ارشیلم سے لے کر اس کے جنوب کا تمام علاقہ بنی یہودا کے حصہ میں آیا۔ حضرت داؤد اسی خاندان سے تھے۔ ان کے بعد ان کے بعد ان کے وارث ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ ہوئے۔ جنھوں نے اپنے دارالسلطنت میں ہیکل کی تعمیر کی اس سے بنی یہودا کی عظمت میں مزید اضافہ ہوا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کے اندر اختلافات پیدا ہوئے اور یہ پوری قوم دو حصوں میں بٹ گئی ایک حصہ بنی یہودا کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا بنی اسرائیل کے۔ بقیہ خاندان کے نام اس کے بعد بالکل غیر معروف ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ بعد کی تاریخ میں یہودا اور بنی اسرائیل دو ہی نام لیتے ہیں۔ جب یہ لوگ کلدانیوں کی اسیری میں مبتلا ہوئے تمام بنی اسرائیل کے لیے یہود کا لفظ ایک مشترک نام کی حیثیت

سے استعمال ہونے لگا''۔[۱۳]

مولانا عبدالماجد دریابادی ''یہود'' اور یہودیت'' کا مختصر پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اور سنیے۔ سارے قرآن میں کہیں کہیں یعنی کوئی آٹھ دس جگہ بجائے اسم الیھود کے ایک فقرہ الذین ھادا آیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو یہودی بن گئے جنھوں نے یہودیت اختیار کر لی، پھر وہی سوال کہ ایک مفہوم کے لیے دو لفظ کیسے؟ پھر وہی جواب کہ دونوں کا بعینہٖ ایک مفہوم ہی نہیں، یہ معلوم ہے کہ یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی طرح تبلیغی مذہب نہیں بلکہ ہندومت کی طرح نسلی مذہب ہے نسل اسرائیل نے اپنے لیے جو قومی مذہب اختیار کیا۔ بس اسی کا نام یہودیت پڑ گیا۔

اب ہوا یہ کہ گرد و پیش بہت سے لوگ مثلاً اسرائیلی نہ تھے۔ اس لیے یہودی تو ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن یہود کا زمانہ اقبال کا تھا، اور اقبال کا اثر پڑوسیوں پر پڑنا لازمی ہے یہود کے فنون اور صنعتوں سے ان کی آسمانی کتابوں کے علوم اور حکمتوں سے، اور خود ان کی دولت و امارت کی چمک دمک سے ان ہمسایہ قوموں کی نظر ایسی خیرہ ہوئیں کہ انھوں نے بے اختیار طور طریقے تہذیب و معاشرت، زبان و تمدن یہاں تک کہ عقائد و اعمال ان ہی کے اختیار کر لیے۔

اور رفتہ رفتہ یہویت کے اندر جذب ہو گئے گم ہو گئے جیسے آج سے کچھ روز پیشتر ہندوستان میں انگریزوں کے دور اقبال میں سینکڑوں ہندوستانی دیکھتے دیکھتے ''صاحب بہادر'' بن جاتے تھے یا پھر خود انگریزوں اور انگریزوں کی مثالیں بھی اسی ہندوستان میں ملیں گی کہ ہندو مذہب اور ہندو رسم و رواج ایسے پسند آئے کہ سناتن دھرم باضابطہ قبول کیے بغیر انھوں نے بولنا چالنا کھانا پینا، رہنا سہنا سب طور طریقے ہندوؤں کے اختیار کر لیے۔، اور عملاً بالکل ہندو ہو گئے۔

یہود کے عروج و اقبال کے زمانہ میں قبیلے ان ہمسایوں کے ایسے تھے جو اسی طرز پر رفتہ رفتہ یہودیت میں داخل ہو گئے تھے، یوں کہیے کہ یہودیت ان کے اندر سرایت کر گئی تھی، حجاز کے شمال میں نیز وسط میں ایسے عرب قبیلے متعدد تھے، جو اپنی عربیت چھوڑ کر بے تکلف یہودیت میں غرق ہو گئے تھے، قرآن نے لحاظ میں نازک فرق کو بھی دیکھا جہاں کہیں موقع اس قسم کے لوگوں کی تذکیر یا تنبیہ کا ہوا وہاں بجائے الیھود کے الذین ھادوا ہی استعمال کیا۔[۱۴]

خلاصۂ کلام یہ کہ یہ نام یا تو یہودا ابن یعقوب کی وجہ سے پڑا یا یہ نام ان کے بچھڑے کی عبادت سے رجوع کرنے کی وجہ سے رکھا گیا۔ مقالہ نگار کی رائے میں یہودیوں کا زمانہ عروج واقبال کا تھا اور اسکے اثرات ان کے پڑوسیوں پر پڑنا لازمی تھے اس لیے رفتہ رفتہ انھوں نے بھی یہودیت اختیار کر لی۔

عبداللہ احمد مسدوسی ''یہودیت'' کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

''یہودیت دنیا کے موجود مذاہب میں سب سے پرانا (قدیم) مذہب ہے کہا جاتا ہے کہ یہودی مذہب ان دو عظیم الشان مذاہب اسلام اور عیسائیت کا پیشرو ہے جو کرۂ ارض کے بیشتر حصے پر پھیلے ہوئے ہیں اور جن کی تعلیمات میں ابراہیمی مذہب کے وہ اصول وقواعد بھی پائے جاتے ہیں جن پر یہودی مذہب کا بڑی حد تک دارومدار ہے''۔ [۱۵]

اس مذہب پر ایک چھوٹی سی قوم کا اعتقاد و یقین ہے جو اسی مناسبت سے یہودی کہلاتی ہے۔

رابرٹ وین ڈئر یہودی مذہب کے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

''یہودی مذاہب کی ابتداء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ۱۹۰۰ ق م میں اس وقت کی جب وہ اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین میسوپوٹیما (موجودہ عراق) سے نقل مکانی کر کے مغرب کی جانب گئے۔ ان کی اولاد ایک قوم بنی اور اس نے بحیرۂ روم کے کنارے کنعان کی سرزمین کو فتح کر کے وہیں بس گئے''۔ [۱۶]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی توحید، دعوت توحید، اور اطاعت خداوندی سے عبارت تھی۔ شرک اور مظاہر پرستی اپنی برأت کا اعلان کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعوت توحید کا فرض منصبی نہ صرف اپنی زندگی کے آخری لمحات تک محدود رکھا بلکہ آپ نے اپنی اولاد کو بھی اس مشن کے لیے تیار کیا تا کہ وہ تشنگان حق و صداقت کی پیاس بجھا سکیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں کہ:

''حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی تھے جن کو اللہ تعالی نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا جنھوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام وفلسطین سے ریگستان عرب کے مختلف گوشوں برس ہا برس لوگوں کو اللہ کی فرمانبرداری کی دعوت پھر اپنے مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں اپنے خلفاء مقرر کیے۔ مشرق اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو شام وفلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو اور اندرون عرب میں اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مامور کیا پھر اللہ

ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا''۔[۱۷]

اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ:

''حضرت ابراہیم علیہ السلام (۱۸۰۰ق م) عراق کے باشندے تھے۔ جب انھوں نے اپنے عہد کی ستارہ پرستی کے خلاف تن تنہا علم جہاد بلند کیا تو نمرود یا ان کی قوم نے ایذا رسانی کے درپے ہوکر ان کو آگ میں زندہ جھونک دیا جس سے اللہ تعالیٰ نے نجات دی۔ بعد میں وہ بڑی مشکلوں سے گزرتے ہوئے مصر اور پھر کنعان (فلسطین وشام) میں آبسے اور پھر انھوں نے اپنے آدھے کنبے یعنی بی بی ہاجرہؑ اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ معظّمہ میں بسایا خود بی بی سارہؑ اور ان کے بیٹے اور حضرت اسحاقؑ کے ساتھ فلسطین میں مقیم رہے''۔[۱۸]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ:

''حضرت اسحاقؑ کے فرزند یعقوبؑ تھے جن کی اولاد بنی اسرائیل کے نام سے موسوم ہے اصل دین جو حضرت موسیٰؑ اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء لائے وہ اسلام ہی تھا ان ابنیاء میں کوئی یہودی نہ تھا یہ مذہب اس نام کے ساتھ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ اس خاندان کی طرف منسوب ہے جو حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد جب سلطنت دوٹکڑے ہوئی تو یہ خاندان اس ریاست کا مالک بنا جو یہودیوں کے نام سے مشہور ہوا اور دوسرے قبائل نے اپنی الگ ریاست بنالی۔ جو سامریہ کے نام سے مشہور ہوئی پھر اسیریا نے نہ صرف سامریہ کو برباد کیا بلکہ ان کے نام ونشان کو بھی مٹادیا۔ اس کے بعد یہودا اور بن یامین کی نسل باقی رہ گئی۔ جس پر یہودا کی نسل کے غلبے کی وجہ سے یہوداہ کے الفاظ کا اطلاق ہونے لگا اس نسل میں کاہنوں نے اپنے خیالات ورجحانات کے مطابق عقائد ورسوم اور مذہبی ضوابط کا جو ڈھانچہ صد ہا برس میں تیار کیا وہ یہودیت ہے یہ ڈھانچہ چوتھی صدی قبل مسیح میں بننا شروع ہوا اور پانچویں صدی تک بنتا رہا اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی شریعت وہدایت کا بہت تھوڑا عنصر اس میں شامل ہے''۔[۱۹]

## یہوداہ کے نام سے یہودی مشہور ہونا:

مولانا عبدالکریم پاریکھ لکھتے ہیں کہ:

''اللہ کی توحید کے لیے ایسا زبردست اور مضبوط عقیدہ رکھنے والی ذات اقدس حضرت یوسفؑ ان بنی اسرائیلیوں کو اپنے انتساب کے لیے پسند نہیں آئی کہ وہ اپنے آپ کو یوسفی مشہور کرتے۔ مگر ایک معمولی

بھائی یہوداہ کے نام سے یہودی مشہور ہونا پسند کیا تاریخی طور پر نہ صرف عوام بلکہ علماء وفقہا بنی اسرائیل بھی اس کھڈ میں گرنے سے بچ نہ سکے''۔[20]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ حق اور باطل کی امتیازی حیثیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ ایک فطری اور قدرتی امر ہے کہ جب باکردار اسلاف کے ناخلف ان کے کردار سے دور ہوجاتے ہیں تو وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ ہم فلاں کے پیروکار ہیں بلکہ یہ ہونا بھی نہیں چاہیے تاکہ حق حق رہے اور باطل باطل اگر یہ لوگ کہتے کہ ہم یوسفی ہے یا ابراہیمی اور یعقوبی ہیں تو حالات وواقعات ان کو جھٹلاتے کہ کہاں تم اور کہاں یہ صاحب عزیمت وبصیرت انبیاء''۔[21]

## یہودیت کا تاریخی پس منظر :

محمد شریف ہزاروی یہود کی تاریخ کے آغاز پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ بات مسلم ہے کہ اسرائیل حضرت یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ ہیں اور حضرت یعقوب علیہ السلام ہی کی طرف بنی اسرائیل کی نسبت ہے مختلف جگہوں سے منتقل ہوکر فلسطین میں انھوں نے سکونت اختیار کرلی تھی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹوں نے فلسطین کو ہی اپنا مسکن بنا کر وہاں دیہاتی زندگی بسر کرنا شروع کی۔ اس بنا پر ہم یہود کی تاریخ حضرت یعقوب علیہ السلام سے شروع کرتے ہیں اس کا پہلا مرحلہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا فلسطین سے مصر منتقل ہونا ہے''۔[22]

ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ:

''جوڈیا Jodea قدیم زمانہ میں شمال فلسطین کے ایک ملک کا نام تھا دراصل یہ نام اس علاقے کو وہاں رہنے والے قبیلے (Juddah) کی مناسبت سے دیا گیا اس علاقے کے باشندے کو Judeans کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لفظ (Jew) اسی سے نکلا ہے ڈیوڈ بادشاہ یہودیوں کے علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اسرائیلیوں کو ایک سلطنت کے تحت متحد کیا اور یروشلم کو اس کا دارالسلطنت بنایا۔ سلیمان کے مرنے کے بعد یہ قوم دوحصوں میں منقسم ہوگئی۔ اسرائیلیوں کی ایک سلطنت جنوب کی طرف قائم ہوئی اور شمال کی طرف دوسری سلطنت Juddah قائم ہوئی یروشلم Juddah والوں کا دار الخلافہ رہا۔ ۵۸۷ ق م بن یمین نے یروشلم پر قبضہ کرلیا اور بہت سارے یہودیوں کو نکال دیا گیا۔ ۳۸ ق م میں آزادی حاصل کی لیکن ۶۳ ق م میں یہ ایک رومی صوبے کے ماتحت ہوگئے۔ یہودیوں نے

۶۶ ق م میں رومیوں کے خلاف انقلاب برپا کیا جو جوڈیا ۱۰ ق م میں اختتام پذیر ہوگیا۔ جبکہ رومیوں نے یروشلم فتح کیا اور ہیکل کو تباہ کر دیا''۔ ۲۳ ؎

ہم یہود کی تاریخ کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرتے ہیں پہلا حصہ یعقوب علیہ السلام سے لے کر یوشع بن نون کے شام میں فاتحانہ داخلے کے واقعات پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ شام کی فتح سے لے کر اب تک کے واقعات پر پھیلا ہوا ہے۔

کتاب وسنت میں اس حصے کے کچھ اجزاء محفوظ ہیں اور بعض دوسرے واقعات کی طرف اشارات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس حصے کی تاریخ کے لیے ہمیں یہودی روایات بائبل اور تالمود پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ یہودیوں کو جنگ عظیم کے بعد سخت ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔

عبداللہ احمد مسدوسی مزید لکھتے ہیں کہ:

> ''اس لیے یہودی جرمنی سے بھاگ کر فلسطین میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ اور یہ رفتہ رفتہ یوماً فیوماً ترقی کرتی گئی۔ تا آنکہ سالانہ ساٹھ ہزار کی خطرناک حد پر پہنچ گئی۔ یہ سلسلہ چار سال ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک جاری رہا اور اس طرح چار سال کی قلیل مدت میں دو لاکھ سے زائد یہودی فلسطین کے چھوٹے سے ملک میں جس کی آبادی تقریباً بارہ لاکھ تھی داخل ہوئے اور انھوں نے اپنی قوت کو مستحکم کر لیا''۔ ۲۴ ؎

اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کی ہدایت ورہنمائی کے لیے مسلسل انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کو مبعوث فرمایا جنھوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں ان کی رہنمائی کی۔

سیکڑوں برس کی ذلت آمیز غلامی سے انھیں نجات دلائی۔ لیکن انھوں نے انبیاء کی اطاعت و فرمانبرداری عزت وتکریم کرنے کے بجائے قدم قدم پر سرتابی کی اور اپنی تہمتوں اور سازشوں سے انھیں جسمانی وذہنی اذیتیں پہنچائیں۔ ان کو جھٹلانے کے ساتھ ساتھ قتل انبیاء کے مرتکب ہوئے بے تکے سوالات اور بے جا مطالبات کیے۔

اللہ تعالی کی طرف سے نازل شدہ کتابوں میں تحریف لفظی کر ڈالی، احکام الٰہی میں من مانی تاویلیں کیں، گمراہ کن خیالات کا پروپیگنڈہ کیا۔ احکام الٰہی کی مسلسل خلاف ورزی اور معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے قساوت قلبی کے شکار ہوئے۔ سودی لین دین کو جائز قرار دیا جس کی وجہ سے اللہ تعالی کا عذاب بنی اسرائیل پر

آیااوران کی مختلف قوموں کو برباد کر دیا گیا۔

تاریخ یہودیت کا آغاز حضرت یعقوب علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے جس کا پہلا دور یعقوب علیہ السلام کا فلسطین سے مصر منتقل ہونا ہے، اور آپ کے بیٹے یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالی نے مصر میں حکومت و بادشاہت عطا فرمائی تو یعقوب علیہ السلام کے اہل وعیال بھی سرزمین مصر منتقل ہوگئے اور اسے اپنا مسکن بنایا حضرت موسی علیہ السلام کی آمد سے پہلے بنی اسرائیل دورِ فراعنہ میں مظالم کا شکار رہے یہاں تک کہ اللہ تعالی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور آپ پر توریت نازل ہوئی انھوں نے فرعون کو ایک اللہ پر ایمان کی دعوت دی اور کہا کہ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف نہ بلائے اور زمین میں تکبر نہ کرے اور یہ کہ نبی اسرائیل پر ظلم وستم کر کے ان کو نہ ستائے۔ فرعون پھر بھی خواب غفلت میں پڑا رہا، اوراسی طرح لوگوں پر ظلم وستم کرتا رہا۔ خدا نے اپنے عذاب کے چند نمونے فرعونیوں کو دکھلائے تا کہ وہ لوگ اللہ تعالی کی طرف رجوع اور توبہ کرلیں کبھی قحط سالی سے دوچار ہوئے۔ اور کبھی سیلاب آیا کبھی کھیتیاں ٹڈیاں کھا گئیں۔ اور کبھی دریا کا پانی سرخ ہو گیا۔ لیکن فرعون اوراس کے ساتھی سرکشی سے باز نہ آئے اور نہ ایمان لائے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں لکھا ہے کہ:

> ''حضرت موسیٰ کو اللہ تعالی نے وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو لے کر رات کو چپکے سے نکل جا، تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔ یہ بھی بتادیا کہ سمندر کے راستے سے جانا ہے۔ سمندر کو جو کہ خشک ہو رہا ہے پار کر جاؤ اور آخر میں یہ بشارت بھی دے دی کہ فرعون مع اپنے لشکر کے غرق کر دیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ حکم الٰہی کی تعمیل کرتے ہوئے بنی اسرائیل کو راتوں رات مصر سے نکال کر لے گئے اور بحیرۂ قلزم کے کنارے ڈیرے لگا دیے ادھر فرعون نے فوجیں جمع کرنے کے لیے شہروں میں نقیب بھیج دیے اور کہلا بھیجا کہ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں اور انھوں نے ہم کو بہت غضبناک کیا ہے چنانچہ صبح ہوتے ہی یہ لوگ ان کے تعاقب میں چل پڑے۔ جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو حضرت موسیٰؑ کے ساتھی چیخ اٹھے ہم تو پکڑے گئے۔ حضرت موسیٰؑ نے انھیں یہ کہہ کر تسلی دی کہ گھبرانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں میرا پروردگار میرے ساتھ ہے، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔ (سورۃ الشعر: ۶۲) انھیں وحی کے ذریعہ حکم ملا کر وہ اپنا عصا سمندر پر ماریں عصا مارنے سے یکا یک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ بن گیا ان دو ٹکڑوں کے درمیان سمندر میں سے خشک راستہ بن گیا حضرت موسیٰؑ کو

مزید حکم ہوا کہ کسی تعاقب کا خوف کیے بغیر سمندر پار کر جائیں۔ فرعون اور اس کا لشکر تعاقب میں سمندر پار کرنے کی کوشش میں غرق ہو جائیں گے۔ فرعون نے جب حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو یوں سمندر پار کرتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے اپنے لشکر سمیت چل پڑا، حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل بحفاظت وسلامت سمندر پار کر گئے اور فرعون اپنے لشکر سمیت غرق ہو گیا''۔ ۲۵؎

اس طرح بنی اسرائیل کو ہمیشہ کے لیے فرعون سے نجات مل گئی۔ فرعون کی ہلاکت کے اس تاریخی واقعہ کے بعد، اللہ تعالی نے موسیٰؑ کو حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل کو ارض مقدس (Promised Land) کی طرف لے جائیں۔ جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر ارض مقدس کے قریب جزیزہ نمائے سینا آئے اور ایک سال سے زیادہ مدت یہیں قیام پذیر رہے۔ تورات کے اکثر احکامات یہیں آپؑ پر نازل ہوئے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ لکھتے ہیں:

''لہٰذا حضرت موسی کی معرفت خدا کا حکم ہوا کہ اپنی قوم سے کہو کہ ارض مقدس میں داخل ہوں اور وہاں کے جابر وظلم حکمرانوں کو نکال کر عدل وانصاف کی زندگی بسر کریں ہم وعدہ کرتے ہیں کہ فتح تمہاری ہوگی اور تمہارے ظالم دشمن ناکام ہوں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے اس سے پہلے کہ نبی اسرائیل کو ارض مقدس میں داخل ہونے کے لیے آمادہ کریں۔ بارہ آدمیوں کو تفشیش حال کے لیے بھیجا، وہ فلسطین کے قریبی شہر اریحا میں داخل ہوئے اور تمام حالات کو بغور دیکھا، جب واپس آئے تو حضرت موسیٰؑ کو بتایا کہ وہ بہت جسیم اور رتن وتوش کے زبردست ہیں اور بہت قوی ہیکل ہیں۔ اب حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس بستی (اریحاء) میں داخل ہو اور دشمن کا مقابلہ کر کے اس پر قابض ہو جاؤ خدا تمہارے ساتھ ہے۔ بنی اسرائیل نے یہ سن کر جواب دیا کہ موسیٰؑ! وہاں تو بڑے ظالم لوگ بستے ہیں ہم تو اس وقت تک بستی میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں، یوشع اور کالب نے جب یہ دیکھا تو قوم کو ہمت دلائی اور کہا شہر کے پھاٹک سے گذر جانا مشکل نہیں ہے۔ چلو اور ان کا مقابلہ کرو ہم کو پورا یقین ہے کہ تم ہی غالب رہو گے۔ لیکن بنی اسرائیل پر اس بات کا بھی مطلق اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنے انکار پر قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر وحی نازل فرمائی ''موسیٰؑ! تم غمگین نہ ہو! ان کی نافرمانی کا تم پر کوئی بار نہیں، اب ہم نے ان کے لیے یہ سزا مقرر کر دی ہے کہ چالیس سال اسی میدان میں بھٹکتے پھریں گے، اور ان کو ارض مقدسہ میں جانا نصیب نہ ہوگا۔ چنانچہ بنی اسرائیل ''تیہ'' کے میدان میں گھومتے اور پھرتے پھراتے پہاڑ کی اس چوٹی کے قریب پہنچے جو ''ہو'' کے نام

سے مشہور تھی تو حضرت ہارون کو پیغام اجل آ پہنچا''۔ ۲٦

پھر حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر موآب کے علاقے میں داخل ہوئے۔ اس علاقے کو فتح کرنے کے بعد حضرت موسیٰ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد حضرت یوشعؑ ان کے خلیفہ اول بنے جنھوں نے دریائے اردن کو پار کر کے شہر اریحا فتح کیا۔ یہ فلسطین کا پہلا شہر تھا جو بنی اسرائیل کے قبضے میں آیا۔ پھر قلیل مدت میں ہی پورا فلسطین فتح ہو گیا۔ غرض یہ جناب یوشع بن نونؑ کی پیشوائی اور رہبری میں بنی اسرائیل داخل ہوئے، کنعان کے ساحلی علاقوں میں فلسطینی لوگ پہلے ہی سے آباد تھے۔

حکیم احمد حسین تاریخ ابن خلدون کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو یہاں مشرک قومیں آباد تھیں ان میں بدترین قسم کا شرک پایا جاتا تھا۔ ساری خدائی بہت سے معبودوں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔ ان دیویوں دیوتاؤں کی طرف ایسے بڑے ذلیل اعمال منسوب تھے کہ اخلاق لحاظ سے انتہائی پست بدکردار انسان بھی ان کے ساتھ مشتہر ہونا پسند نہ کرے۔ ان کے ہاں بچوں کی قربانی کا عام رواج تھا۔ تورات میں واضح طور پر ان قوموں کے سلسلے میں جو ہدایات موجود ہیں ان میں کہا گیا کہ یہ قومیں ناقابل اصلاح ہیں ان کے ساتھ رہنے بسنے اور اخلاقی، اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا لیکن بنی اسرائیل نے ان ہدایات پر عمل نہ کیا اور ان کو پس پشت ڈال دیا اور قبائلی عصبیت کے باعث یہ پسند کیا کہ متحدہ سلطنت کی بجائے مفتوحہ علاقوں کا ایک ایک حصہ لے کر الگ ہو جائے اس طرح فلسطین کا مختصر سا علاقہ ۱۲ قبائل میں منقسم ہو گیا وہ قبائل یہ تھے۔

۱۔ بنی یہودا　　۲۔ بنی شمعون　　۳۔ بنی یمین　　۴۔ بنی دان

۵۔ بنی افرائیم　　٦۔ بنی روبن　　۷۔ بنی حد　　۸۔ بنی منسی

۹۔ بنی اشکار　　۱۰۔ بنی زبولوت (زبلون) ۱۱۔ بنی نفتالی　　۱۲۔ بنی آشر

انتشار اور تفرقے کی وجہ سے کوئی قبیلہ طاقتور نہ بن سکا کہ علاقے کو مشرکین سے پاک کر دے آخر کار انہیں یہ گوارا کرنا پڑا کہ مشرکین ان کے ساتھ رہیں اس طرح بری عادتیں ان میں گھس آئیں''۔ ۲۷

چوں کہ بنی اسرائیل انتشار وافتراق کی وجہ سے ان کی حیثیت کمزور پڑ گئی تھی لہٰذا جب ان کی جنگ فلسطینیوں سے ہوئی تو وہ ہار گئے۔ پھر انھوں نے اپنے نبی شموئیل (Samuel) سے درخواست کی کہ وہ

خدا تعالیٰ سے ان کے لیے ایک طاقتور بادشاہ بنانے کی گزارش کریں۔شموئیل علیہ السلام کی دعا کے نتیجہ میں خدا نے شاؤول (طالوت Saul) کو ان کا بادشاہ بنایا۔ بنی اسرائیل کو شاؤول کی پیشوائی پسند نہ آئی۔اپنی پندرہ سالہ حکومت میں شاؤول ہمیشہ مصروف جنگ رہے۔انھیں جنگوں داؤد (David) نامی انسان مرد مجاہدین بن کر ابھرا۔ داؤد نے بنی اسرائیل کے زبردست دشمن جالوت کو صرف ایک ہی وار میں قتل کردیا۔شاؤول نے اس شجاعت سے خوش ہوکر اپنی بیٹی کا نکاح حضرت داؤد علیہ السلام سے کردیا اور انھیں اپنا سپہ سالار بھی بنادیا۔

الغرض اگر اللہ تعالیٰ طالوت کی سرپرستی اور قیادت میں بنی اسرائیل کو جمع نہ کرتا تو پھر وہ دنیا کی پست و ذلیل ترین قوم بن کر رہ جاتی۔

شاؤول کی وفات کے بعد، حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ بنے۔حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی اپنے زمانہ میں متعدد جنگیں لڑیں اور بہت سی فتوحات نصیب ہوئیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے جانشین اور سلطنت (Judea) کے بادشاہ بنے۔وہ اپنے علم وحکمت عدل وانصاف، تدبیر حکومت کے لے آج بھی مشہور ہیں۔تقریباً چالیس سال تک حکومت کرنے کے بعد جب (۹۲۸ سال قبل مسیح میں) حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس دنیا سے کوچ کیا تو ان کا بیٹا رجعام (Rehboam) بادشاہ بنا۔

شیخ احمد دیدات لکھتے ہیں:

''حضرت داؤد وسلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل پر دوبارہ دنیا پرستی کا غلبہ ہوگیا اور باہمی نفاق کی بدولت سلطنت دوحصوں میں تقسیم ہوگئی''۔۲۸؎

(۱) شمالی فلسطین اور مشرق اردن میں سلطنت اسرائیل

(۲) جنوبی فلسطین اور ارادوم میں سلطنت یہود

اول سلطنت کا دارالحکومت سامریہ اور دوسری سطلنت کا دارلحکومت یروشلم بنا۔ دونوں سلطنتوں میں رقابت شروع ہوگئی۔

مزید لکھتے ہیں:

''رقابت اور کشمکش کی اسی فضا میں حضرت الیاس اور عیسیٰ نبی علیہما السلام نے ان کو تنبیہ کی اور ان کی

بداخلاقیوں کا مداوا کرنے کی کوشش کی حضرت الیاس علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جس منزل اور بردباری کی طرف یہ تیزی سے جارہے تھے اس کا علاج کرنا چاہئے۔لیکن ہر اصلاحی کوشش بیکار ثابت ہوئی ۔ بالآخر آشوریوں کے ہاتھوں ان کی شمالی ریاست کا خاتمہ ہوگیا۔ اس ریاست کے خاتمے سے پہلے عاموس (Amos) نبی اور یوشع نبی (Hashea) نے اسرائیلوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہے مگر ان کی ضد اور سرکشی میں مزید اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ آموس نبی کو اصلاحی سرگرمیوں سے رک جانے اور ریاست بدر ہونے پر مجبور کردیا۔ چنانچہ نتیجہ آشوریوں کے ہاتھوں ذلت اور خواری کی صورت میں نکلا۔ سارگوں نہ صرف ان کی سلطنت کا خاتمہ کیا بلکہ ہزاروں کو ہلاک اور باقیوں کو سلطنت کے مختلف حصوں میں منتشر کردیا۔ بنی اسرائیل کے لیے تباہی اپنی بدترین صورت میں بخت نصر کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئی عظمت وشوکت چھنی اور اسیری کا زمانہ شروع ہوا۔ زبردستی اور محرومی کا دور کہ اس کے بعد جن اخلاقی اور اعتقادی پستیوں میں گرے کہ دوبارہ اٹھ نہ سکے اکثریت میں اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کی صفات عنقا ہوچکی تھیں''۔[29]

حضرت عزیر علیہ السلام یہود کے ایک مشہور گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسیری بابل کے زمانے کے بعد حضرت عزیر علیہ السلام نے دین موسیٰ علیہ السلام کی تجدید کا کام سرانجام دیا۔ خیر وصلاح کی لوگوں کو دعوت دی اور برائیوں سے دور رہنے کی تلقین کی، قوانین شرعی کو نافذ کرنے کی کوشش کی، یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا۔ یہودیوں کی دربدری کی وجہ سے اصل توریت ضائع ہوچکی تھی لہٰذا عزیر علیہ السلام نے توریت کو دوبارہ جمع کیا اور مرتب شکل میں شائع کرایا یہی وہ کتاب ہے جو عہد نامہ عتیق کہلاتی ہے۔(Old Testamemt) ۱۵۰ سال بعد بیت المقدس کو از سرنو آباد کیا، اور بیت المقدس یہودی مذہب کی تہذیب کا مرکز بن گیا۔

ایس، ایم ناز لکھتے ہیں کہ:

''شام کے فرمانبروا (اینٹیوکس ثالث) نے ۹۸ ق م میں فلسطین پر حملہ کردیا اور اس پر قبضہ جمالیا۔ وہ یہودیوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ انھوں نے جابرانہ قوت کا استعمال کیا تو یہودیوں میں شدید رد عمل کے نتیجے میں ایک زبردست تحریک نے جنم لیا جسے تاریخ میں مکابی بغاوت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کے نتیجے میں مذہب سے مخلص پکے کٹر یہودیوں نے یونانیوں کو نکال کر اپنی آزاد ریاست قائم کرلی جو ۶۷ ق م تک جاری رہی۔ یہ صورت حال زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ یہ تحریک جس دینی واخلاقی روح کے ساتھ اٹھی وہ رفتہ رفتہ فنا ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ خواہشات نفسانی اور دنیا

پرستی نے لے لی۔آخر کار ان میں پھوٹ پڑ گئی انھوں نے رومن فاتح جنرل پومپی (Pompy) کو فلسطین پر حملہ کی دعوت دے دی اس نے ۶۳ ق م میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کو ختم کر دیا۔رومن فاتحین کی پالیسی تھی کہ وہ مقامی حکمرانوں کے ذریعہ کام کرتے تھے انھوں نے دیسی ریاست قائم کر دی جو بالآخر ایک ہوشیار یہودی ہیرود اعظم کے قبضے میں آئی اس نے دونوں طرف کے لوگوں کو خوش رکھا اور قیصر کی خوشنودی حاصل کر لی اس وقت یہودیوں کی اخلاقی و دینی حالت انتہائی زوال پذیر ہو چکی تھی ۴۱ ق م رومیوں نے ہیرود اعظم کے پوتے کو ان تمام علاقوں کا فرمانروا بنا دیا اس نے اقتدار کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں پر مظالم کی انتہا کر دی اس قوم کے سامنے حضرت یحییٰ کا سر قلم کیا گیا مگر اس ظلم عظیم کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھی پھر حضرت عیسیٰؑ کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا گیا"۔۳۰

پامپی کی موت کے بعد قیصر (جولیس سیزر، Julius Caeser شہنشاہ روم بنا، لیکن وہ بھی قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ مارک انتھونی Mark Antony تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔انتھونی نے ہیروڈ کو ایک یہودی گورنر کی حیثیت سے منتخب کیا جو اپنے دین سے بے بہرہ تھا لیکن بادشاہ روم کا وفادار تھا۔کہا جاتا ہے ہیروڈ بہت ظالم و جابر اور بے رحم انسان تھا۔

البتہ اس نے معبد دوم (ہیکل دوم کی تزئین کاری اور توسیع میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہیروڈ کی موت کے بعد تخت و تاج اس کے چار بیٹوں کے حصہ میں آیا اقتدار بجائے کسی ایک کے ہاتھ سونپنے کے چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہیروڈ کے ان ہی چار بیٹوں میں سے ایک Jon thebaptist نے حضرت یحییٰ کا قتل کیا تھا ۶۶ء کے آتے آتے تمام رومنوں اور یہودیوں میں کشیدگی پیدا ہوگئی اور انھوں نے حکومت روم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، رومیوں نے اس بغاوت کو کچل دیا تین سال تک جنگ کرتے رہے۔اس جنگ کا خاتمہ بادشاہ روم کے بیٹے قیطس نے کیا اور یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو قید کر کے اپنے ساتھ روم لے گیا اس ظلم و ستم کے بعد یہودیوں کا نام و نشان اور اثر و رسوخ ایسا مٹا کہ ہزار برس تک ان کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی۔پہلی جنگ عظیم تک یہودیوں کی تعداد اسّی ہزار تک ہوگئی۔

محمد یوسف خاں تقابل ادیان میں یہودیوں کی تاریخ اور دوسری جنگ عظیم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''۲؍نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانیہ نے اعلان کیا کہ فلسطین میں یہودیوں کا ایک وطن قائم کیا جائے گا جس کے لیے برطانوی حکومت اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش اور تعاون کرے گی فلسطینی حکومت کے قیام کا اعلان سن کر عرب ممالک میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور اس پر احتجاج ہوا پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک فلسطین ترکی کا حصہ تھا لیکن جنگ کے دوران برطانیہ نے اس پر قبضہ کرلیا تھا۔ جولائی ۱۹۲۰ء میں اتحادیوں کی اعلیٰ کمان کا ایک اہم اجلاس ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ فلسطینی علاقہ برطانیہ کی تحویل میں دیا جائے اس سے یہودیوں کو بہت تقویت ملی جسے دیکھ دنیا بھر سے یہودی آ کر یہیں آباد ہونا شروع ہو گئے فلسطینی عرب باشندوں کو احساس ہوا کہ اگر یہودیوں کی تعداد اسی طرح بڑھتی رہی تو ہم لوگ اقلیت کے درجہ میں رہ جائیں گے انھوں نے ہنگامے شروع کردیئے عربوں اور یہودیوں میں صلح ہوجائے لیکن اس میں انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اس کے بعد اگست ۱۹۳۷ء میں یہودیوں کا ایک عالمی اجلاس سوئٹزرلینڈ میں طلب کیا گیا ۱۹۳۹ء کے آغاز میں لندن میں ایک گول میز کانفرنس ہوئی لیکن عربوں نے کسی اجلاس میں شرکت نہ کی ۱۷؍مئی ۱۹۳۹ء کو مسئلہ فلسطین پر برطانوی حکومت نے ایک ''قرطاس ابیض'' شائع کیا جس میں دس سال کے اندر فلسطین میں ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کردے گی۔ اس پر عرب مطمئن ہو گئے اور دونوں پر امن رہے اسی دوران دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی دوسری طرف جرمنی سے یہودیوں نے فلسطین منتقل ہونا شروع کردیا اور فلسطین میں حالات کشیدہ ہو گئے یہودیوں نے دہشت گردی کی کارروائیاں شروع کردیں بلکہ خفیہ فوج بنانا شروع کردی اور ۱۹۴۴ء میں توڑ پھوڑ کی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو مسئلہ فلسطین کا بل جنرل اسمبلی میں پیش ہوا جہاں ''تقسیم وطن'' کی تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوگئی اسی دوران عربوں اور یہودیوں کا اس علاقے میں بہت خون بہا ادھر ۱۴؍ ۱۹۴۸ء رات بارہ بجے برطانوی حکومت نے فلسطین سے اپنا تسلط کرنے کا اعلان کردیا اور ڈیوڈ بن گوریاں اسرائیل کا سب سے پہلا وزیر اعظم تھا۔ جس نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا جس پر شام، لبنان، اردن، عراق، مصر اور سعودی عرب نے اسرائیل پر حملہ کردیا۔ ۱۹۴۹ء تک یہ جنگ جاری رہی لیکن اس جنگ میں اسرائیل کا پلڑا بھاری رہا اور فلسطین کے تین چوتھائی حصے پر اسرائیل کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۹۵۶ء میں اسرائیل نے برطانیہ اور فرانس کی شہ پا کر مصر پر حملہ کردیا۔ اسی طرح ۱۹۷۳ء میں بھی اور آج تک اس علاقے میں خانہ جنگی ہو رہی ہے''۔ (خدا امن قائم کرے)۔[۳۱]

## اردو تفاسیر میں تقابلی مطالعۂ مذاہب :

تقابلی مطالعۂ مذاہب سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں پائے جانے والے معروف ومشہور مذاہب کی تعلیمات کا غیر متعصّبانہ اور غیر جانبدارانہ تقابل کیا جائے، نیز ان مذاہب کی خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائے، اور ان مذاہب کے بنیادی عقائد، عبادات اور رسومات کا عادلانہ جائزہ لیا جائے اور ان کی اصل تعلیمات کی روشنی میں ان کے متعلق غیر متعصّبانہ رائے قائم کی جائے۔

اُمّت وسط کی حیثیت سے مسلمانوں پر دعوت وتبلیغ کا جو فریضہ عائد ہوتا ہے اس سے عہد برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تمام آسمانی مذاہب کے ماننے والوں کے مذہبی معتقدات، عبادات اور نظریۂ کائنات سے مکمل واقفیت حاصل کی جائے۔

جب ہندوستان میں تقابلی مطالعۂ آغاز وارتقاء ہوا، تو اس کے اصول ومبادی اور طریقۂ کار مغربی علمی تحقیقات سے ہی مستعار لیے گئے، اور بالخصوص اہل اسلام، یہودیوں اور مسیحیوں کے درمیان مشترک اقدار تلاش کئے گئے اور آسمانی مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوششیں کی گئیں اور ان کے مابین نقطۂ اتحاد وہم آہنگی تلاش کی گئی چنانچہ انسانی معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان مفاہمت اور امن وامان برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری بھی ہے۔

اس نقطۂ اتحاد کی دعوت قرآن کریم کی اس آیت سے واضح ہوتی ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ" ۳۲

[آپ کہہ دیجئے کہ اے اہلِ کتاب! ایسے قول کی طرف آ جاؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہم بجز اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کریں۔]

قرآن کریم میں مختلف مذاہب کا تذکرہ کہیں اجمال تو تو کہیں تفصیل سے آیا ہے۔ جیسے یہودی مذاہب، صابی مذہب، عیسائی مذہب مجوسی مذہب اور مشرکانہ مذاہب وغیرہ۔

قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَى وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۳۳؎

[بے شک جولوگ ایمان لا چکے ہیں اور جولوگ یہودی ہوئے اور صابی اور نصاریٰ اور مجوس اور جو مشرک ہیں بے شک اللہ ان (سب) کے درمیان فیصلہ کردے گا قیامت کے دن بے شک اللہ ہر شئے سے واقف ہے۔]

سرسید احمد خانؒ نے اردو میں مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ کی داغ بیل ڈالی، اور" تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام " اور "تفسیر قرآن" اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے تحریر کر ڈالے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ:

"سرسید نے اپنی تفسیر میں بائبل (کیتھولک اور پروٹسٹنٹ) دونوں کا استعمال کیا ہے۔ تفسیر میں جا بجا بائبل کے بیانات سے فائدہ اٹھایا اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی تحریک کو ایک قدم اور آگے بڑھایا"۔۳۴؎

تقابل ادیان پر جو دوسری تفسیر منظر عام پر آئی وہ شیخ عبدالحق حقانیؒ "فتح المنان بتفسیر الرحمٰن" یعنی تفسیر حقانی ہے۔ شیخ عبدالحق حقانیؒ کا مذاہب باطلہ کی تردید کے سلسلہ میں طریقہ یہ ہے کہ آپ اوّل اوّل اس مذہب کے تاریخی احوال بیان کرتے ہیں پھر اسی مذہب کی کتب اصلیہ سے اس مذہب کے عقائد بیان کر کے قرآنی آیات سے اس کی تردید پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد عقائد باطلہ سے متعلق اسی کی کتب اصلیہ سے متعارض عبارات مع حوالہ نقل کرتے ہیں، پھر اس کی دلائل عقلیہ، نقلیہ اور الزامی سے تردید کرتے ہیں، آپ کا یہ انداز تفسیر آپ کی مکمل تفسیر میں جا بجا نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشروں میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی اپنی "تفسیر قرآن" میں تقابلی مطالعۂ مذاہب (یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت) کو کافی اہمیت دی۔ چنانچہ مولانا دریابادیؒ نے اس موضوع کی نزاکت اور جدید شارح و مفسر قرآن کے لیے اس کی لازمیت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''لازمی ہے کہ جدید مفسر وشارح قرآن تاریخ اقوام پر بھی نظر رکھتا ہو اور جغرفیہ عالم پر بھی، اور یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، اور عرب اور نواحِ عرب کے شرکیہ مذاہب سے فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو، اور جدید سائنس کے بھی مختلف شعبوں (خصوصاً فلکیات) سے بھی مطلقاً بے بہرہ نہ ہو، ورنہ باوجود تدیّن و تقویٰ، صالحیت ومقبولیت کے سخت غلطیوں کا شکار ہوجائے گا.........مفسر کا محض صالح ومتقی ہونا ہرگز اس کی ضمانت نہیں کہ اس کی تاریخی، جغرافی، عام سائنسی معلومات بھی صحیح ہیں، قرآن مجید یقیناً ایک دینی صحیفہ ہے لیکن اس کا علمی پایہ بھی ہرگز ایسا نہیں کہ کسی کو اس پر کسی اعتبار سے بھی حرف گیری کا موقع مل سکے''۔[۳۵]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے قرآن اور اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے دیگر ادیان خصوصاً یہودیت ونصرانیت کا مذہبی کتب سے قرآنی مندرجات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور مخالفین اسلام کی طرف سے اٹھائے جانے والے اعتراضات کے جوابات انہیں کی کتب سے دیے ہیں۔

مظفر حسین غزالی لکھتے ہیں:

''مولانا دریابادی صاحبؒ کا قرآنی کام اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام ہے۔ انھوں نے جس انداز سے اس زمانہ کے معیاری مستند اور مخالف نظریات اور مستشرقین کے مواد سے استفادہ کیا اور اس (Original source) کی بنیاد پر ان کا آپس میں تقابل کیا اور پھر اسلام کے مقابلہ میں ان کا کھوکھلا پن ثابت کیا ہے اور جس سلیقے سے ان چیزوں کو ساتھ لے کر چلے ہیں، یہ ان ہی کا طرۂ امتیاز ہے ان کی خدمات آج بھی مشعل راہ ہیں''۔[۳۶]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے مختلف مذاہب کے بنیادی عقائد عبادات اور رسوم کا ایسا ناقدانہ اور عادلانہ جائزہ لیا ہے جس سے ہر مذہب کی قدر و قیمت، خوبی اور خامیاں پوری طرح روشن ہوگئیں۔ دین اسلام کی فضیلت اور اس کی حقانیت کو تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے تاکہ نئی نسل اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس پر شعوری ایمان لائے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ''تفسیر ماجدی'' کے متعلق رقم طراز ہیں:

''مجھے تفسیروں میں دو چیزوں کی جستجو اور تلاش زیادہ رہتی تھی۔ ایک یہود و نصاری سے متعلقہ آیات میں قرآن نے جن تاریخی پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں ان کی بقدر ضرورت تاریخی تفصیل کہ اس

کے بغیر قرآن کریم کا وہ مطمح نظر پورا سامنے نہیں آ سکتا جو ان آیات سے متعلق ہے دوسرے یہ کہ تورات وانجیل اور قرآن حکیم کے مقاصد کا تقابلی انداز سے موازنہ کہ اس کے بغیر قرآنی مقاصد کی بالا دستی اور برتری سامنے نہیں آ سکتی تھی ۔ اس جلیل القدر تفسیر میں کتاب کھولتے ہی پہلی نظر میں یہی دو مقصد سامنے آ گئے اور عرصۂ دراز کی تشنگی اکدم بجھتی نظر آئی ۔ اس لیے میں اپنے ذہنی نقطۂ نظر سے انہی دو پہلوؤں کو تفسیر کے امتیازی پہلو سمجھنے پر مجبور ہو گیا''۔[۳۷]

فصل دوم:

# حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے دور میں

## بنی اسرائیل کا عروج وزوال اور بنی اسرائیل پر اللہ کے احسانات

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نہایت جلیل القدر رسول گزرے ہیں۔حضرت ابراہیمؑ کو اللہ نے ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ ان کو یہودی بھی مانتے ہیں عیسائی بھی، ہندو بھی مانتے ہیں اور مسلمان بھی، حضرت ابراہیمؑ کے حالات ہر مذہب کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

تفسیر قرآن کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے حالات زندگی بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

**حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کا وجود مسعود:**

''نوح علیہ السلام کے بعد دنیا از سرنو آباد ہوئی اور آپؑ کے بعد آپ ہی کی اولاد سے نسل انسانی کا سلسلہ پھلا اور بڑھا، ہدایت اور ضلالت دونوں سلسلے جاری ہوئے، نئے نئے ملک آباد ہوئے، قومیں بنی اور بگڑیں۔جیسے حضرت ادریس علیہ السلام اور ان کی تعلیمات حضرت ہود اور ان کی امت قوم عاد، حضرت صالح اور ان کی امت قوم ثمود، اس طرح کے ذیلی عنوانات ہیں جو بطور تمثیل پیش کیے جا سکتے ہیں۔

بعض روشن خیال لوگوں کا کہنا ہے کہ ابراہیم قدیم زمانے کی کوئی متعین شخصیت نہیں ہے بلکہ یہ شیخ قبیلہ کا لقب ہوا کرتا تھا۔مولانا عبدالماجد دریابادیؒ وضاحت کرتے ہیں کہ:

> ''ابراہیمؑ تو وہ بزرگ تھے جن سے علاوہ مشرکین عرب کے، یہود و نصاریٰ بھی خوب ہی واقف تھے، ان کا تعارف اور بھی غیر ضروری تھا یہ ابراہیم علیہ السلام وہی ہیں جو اسلامی عقیدہ کے علاوہ یہودی و نصرانی عقیدہ میں بھی بڑے جلیل القدر پیغمبر گزرے ہیں، ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی اور نبوت چوں کہ مسلمانوں کے علاوہ یہود اور نصرانیوں کو بھی مسلم ہے، اس ان قوموں کے علماء نے بھی آپ کے حالات کی تحقیق وجستجو میں کوئی درجہ کاوش کا اٹھا نہیں رکھا ہے۔موجود محرف بائبل میں تاریخی غلطیوں کی کثرت

سے اکتا کر بعض روشن خیال محققین نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابراہیم نامے کوئی تاریخی شخصیت گزری ہی نہیں بلکہ یہ محض ایک نوعی نام تھا یا، ہر شیخ قبیلہ کا لقب، لیکن اب پھر تحقیق کا رخ بدلا اور بیسویں صدی کے ربع اول کے ختم ہوتے ہوتے پھر آپ کی تاریخی شخصیت کا پوری طرح قائل ہوجانا پڑا ہے''۔۳۸

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سلسلۂ نسب کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ:

''توریت کی روایت ہے کہ آپ کے اور نوحؑ کے درمیان دس ۱۰ پشتوں کا فرق ہوا ہے یعنی آپ ان کی گیارہوں پشت میں تھے لیکن خود توریت ہی کے شارحین کا خیال بعض قوی قرائن کی بنا پر یہ ہے کہ توریت میں نسب نامہ کی کچھ پشتیں چھوٹ گئی ہیں''۔۳۹

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر'' تھا اس کی تصدیق قرآن کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَاماً آلِهَةً إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔۴۰

[اور وہ وقت یاد کرو جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ کیا تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو؟ بیشک میں تمہیں تو اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں (مبتلا) دیکھتا ہوں۔]

عبدالماجد دریابادیؒ آزر کی وجہ تسمیہ بیان فرماتے ہیں کہ:

''آزر عربی توریت میں اس نام کا املا تارح ملتا ہے اور انگریزی میں تیرا (Terah) اور تالمود میں زارہ۔ جو لوگ علم اللسان کے مبادی سے بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی نام مختلف زمانوں میں جا جا کر کیسے کیسے تلفظ اختیار کر لیتا ہے۔ فلسطین کے قدیم مسیحی مورخ یوسیبیس (۲۶۴ءتا ۳۴۹ء کے ہاں ''آثر'' یا ''ہاتھر'' آیا ہے۔ ان دنوں تلفظوں کی مشابہت ومماثلت آزر سے بالکل ہے اور آزر وزارہ بھی اگر ایک ہی مادہ سے مشتق ہوں تو کچھ بعید نہیں۔ نام کا تلفظ قدیم زبانوں میں کئی کئی طرح آیا ہے مسلمانوں کے لیے قرآنی لفظ آزر کافی ہے۔ اور یہود کی مستند کتاب جیوش انسائیکلو پیڈیا میں اتنا اور بھی ہے۔ وہ علاوہ بت پرست ہونے کے بت ساز اور بت فروش بھی تھا۔ توریت میں یہ تصریحات بھی ہیں کہ اس کی اولاد میں علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے دولڑکے اور بھی تھے نحور اور حاران نیز یہ کہ اس کی وفات شام کے شہر حران میں ۲۰۵ سال کی عمر میں ہوئی، توریت ہی میں یہ بھی ہے کہ تارح کی عمر ۷۰ سال کی تھی، جب حضرت ابراہیم کی پیدائش ہوئی، اور حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش جدید ترین

تخمینہ کے مطابق ۲۱۶۰ء ق م کی ہے۔ آزر کا زمانہ اس حساب سے ۲۲۳۰ء ق م تا ۲۰۲۵ء ق م ٹھہرتا ہے۔"[۴۱]

عبدالماجد دریابادی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام ولادت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"وطن آبائی ملک بابل یا کلدانیہ (انگریزی تلفظ میں کالڈیا) تھا، جدید جغرافیہ میں اسی ملک کو عراق کہتے ہیں جس شہر میں آپ کی ولادت ہوئی، اس کا نام توریت میں اور (UR) آیا ہے، مدتوں یہ شہر نقشہ سے غائب تھا، اب از سر نو نمودار ہو گیا ہے کھدائی کے کام کی داغ بیل ۱۸۹۴ء میں پڑ گئی تھی ۱۹۲۲ء میں برطانیہ اور امریکہ کے ماہرین اثریات کی ایک مشترکہ تحقیقی مہم برٹش میوزیم اور پنسیلوینیا یونیورسٹی کے زیر اہتمام عراق کو روانہ ہوئی اور اور کھدائی کا کام پورے سات سال جاری رہا، رفتہ رفتہ پورا شہر نمودار ہو گیا ورعراق آثار قدیمہ نے عجائب خانہ کے حکم میں لاکران کھنڈروں کو محفوظ کر دیا ہے، یہ شہر خلیج فارس کے دہانہ فرات اور عراق کے پایۂ تخت بغداد کے تقریباً درمیانی مسافت پر ہے"۔[۴۲]

یہی وہ مقام ہے جو آپؑ کی ولادت باسعادت سے مشرف ہوا۔

## حضرت ابراہیمؑ کا سال ولادت اور وفات :

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ حضرت ابراہیمؑ کے سال ولادت اور وفات کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

"سال ولادت سر چارلس مارسٹن محقق اثریات کی جدید ترین تحقیق کے مطابق ۲۱۶۰ء ق م ہے اور عمر شریف توریت میں ایک سو پچھتر سال درج ہے، سال وفات اس حساب سے ۱۹۸۵ء ق م ٹھہرتا ہے"۔[۴۳]

## دعوت توحید اور شرک سے اظہار برأت:

فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ 0 إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفاً وَمَا أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔[۴۴]

[لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو بولے اے لوگو میں اس شرک سے بری (اور بیزار) ہوں جو تم کیا کرتے ہو یقیناً میں نے تو اپنا رخ یکسو ہو کر اس کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔]

عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

"یہ ارشاد نہیں ہوا کہ جس شرک میں میں اب تک مبتلا تھا، بحمداللہ اب اس سے نکل آیا، بلکہ ارشاد یہ

ہور ہا ہے کہ جس شرک میں تم لوگ میری قوم والو! مبتلا ہو۔ میں اس سے بری و بیزار ہوں''۔[45]

حضرت ابراہیمؑ کی قوم سیدھی سچی اور فطری تعلیم ماننے کے بجائے، الٹے آپ کے سر ہوگئی، اور طرح طرح کی کج بحثیاں کرنے لگی جیسا کہ ہر غبی، جاہل، مشرک قوم کا شیوہ ہے۔ بہر حال اس کے بعد مشرک قوم موحد اعظم پر ٹوٹ پڑی اور بحث و مباحثہ اور کٹھ حجتی کرنے لگی۔

آپ نے فرمایا:

أَتُحَاجُّونِّيُ فِيُ اللّٰهِ وَقَدُ هَدَان [46]

مولانا دریابادیؒ مزید لکھتے ہیں کہ:

''تم مجھ سے بحث و جدل کے لیے توحید کے مسئلہ میں چلے ہو، جو میرے اوپر بالکل کھل چکا ہے، اور مجھے ہدایت علم الیقین کیا معنی عین الیقین کے ساتھ مل چکی ہے''۔[47]

## حضرت ابراہیمؑ کی تذکیر و تبلیغ اور نمرود سے مناظرہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت و تقدس اور فضلیت کے قائل مسلمان یہودی اور مسیحی سبھی ہیں لیکن آپ کی تذکیر و تبلیغ کا تذکرہ صرف قرآن کریم کے صفحات میں محفوظ ہے۔ باقی بائبل میں یہ موضوع کوئی اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ نمرود صرف علامتی خدائی کا مدعی نہیں تھا بلکہ وہ خدائی اختیار و اقتدار کا دعوے دار تھا۔ چنانچہ قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان مناظرانہ حجت بازی کا حال بیان کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَلَمُ تَرَ إِلَى الَّذِيُ حَآجَّ إِبُرَاهِيُمَ فِيُ رِبِّهِ أَنُ آتَاهُ اللّٰهُ الُمُلُكَ [48]

[اے مخاطب کیا تو نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کی جو ابراہیم سے ان کے پروردگار کے باب میں مباحثہ کر بیٹھا اس (شیخی) میں آ کر کہ اللہ نے اسے بادشاہت دے رکھی تھی۔]

عبدالماجد دریابادیؒ کتاب پیدائش کے حوالہ سے نمرود نامی بادشاہ کا وجود بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ بحث و مناظرہ کرنے ولا کون تھا؟ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلا کا کوئی معاصر بادشاہ تھا یہ تصریحات تو قرآن مجید بلکہ اس آیت کے اندر موجود ہیں۔ بہر حال تاریخ توریت اور روایات یہود میں تسلیم ہے کہ نمرود نامی بادشاہ کا وجود تھا بادشاہ بہت بڑا تھا اور ساتھ ہی سخت ظالم اور مشرک اور آزر اس کا وزیر تھا۔ توریت میں ہے: ارکوش سے نمرود پیدا ہو، زمین پر جبار ہونے لگا، خداوند کے سامنے وہ

صیاد دو جبار تھا، اسی واسطے مثل ہوئی کہ خداوند کے سامنے نمرود سا صیّاد وجبّار''۔ (پیدائش ۹۸:۱۰) اور حسب روایت یہود یہ نمرود اپنے قبیلہ والوں کی مختصر فوج سے آل یافث کو شکست دینے کے بعد زمین کا بادشاہ ہو گیا۔ اور آزر کو اس نے اپنا وزیر بنایا اس کے بعد اپنی عظمت کے نشہ میں نمرود خدا سے بیگانہ ہو گیا اور بہت سخت قسم کا مشرک ہو گیا۔'' (جیوش انسائیکلو پیڈیا۔ جلد ۹ ص ۳۰۹)۔ بابل (کلدانیہ) ہی کی تاریخ میں ایک اور بادشاہ کا نام آتا ہے جو بابل کا سب سے پہلا انسانی خدا تھا۔ بعض مؤرخین نے اسے نمرود کا مرادف قرار دیا ہے'' (انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس جلد ۶ ص ۳۴۶) کلدانیوں کا ملکی اور قومی مذہب خوب خیال رہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت اصلاً شمس پرستی تھا، یعنی سورج دیوتا کی پوجا اور یہی سب دیوتاؤں کا سردار تھا، نمرود کلدانی، فرعون مصری کی طرح، اپنے کو اسی خدائے اعظم کا مظہر یا بُروز، یا اوتار سمجھتا تھا، اور اہل توحید کو ملک کا غدار و باغی اور سرکاری مذہب کا دشمن ومنکر قرار دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ اہل توحید کے خدائے واحد سے بھی جلنے لگا جوزیفس، یہود کا مورخ قدیم اپنی تاریخ آثار یہود میں لکھتا ہے: وہ لوگوں کی خوشحالی کو خدا کی جانب نسبت دینے سے روکنے لگا۔ گویا کہ وہ خود قادر علی الاطلاق ہے وہ کہتا تھا کہ اگر اب کی خدا نے طوفان نوح کی طرح دنیا کو ڈبویا تو میں اس سے انتقام لوں گا''۔ (باب اول ۴:۲) ۴۹؎

## نمرود خدائی اختیار واقتدار کا مدعی:

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ۔۵۰؎

[جبکہ ابراہیمؑ نے کہا میرا رب تو وہی ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے۔]

نمرود مدعی اپنے خدا اور مظہر خدا ہونے کا تھا، اس نے داعی توحید کو چیلنج دے کر پوچھا کہ وہ کون سا خدا ہے جس کی طرف تم دعوت دے رہے ہو؟ ذرا میں تو اس کے اوصاف سنو؟ حضرت ابراہیم نے جواب میں فرمایا کہ حیات وموت کی ساری قوتیں اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہی سارے نظام ربوبیت کا سرچشمہ ہے کسی بندہ میں یہ طاقت نہیں کہ اس نظام حیاتی وفنائی کو بدل دے یا اس میں کوئی ادنیٰ تصرف کر دکھائے۔

نمرود بادشاہ کا دماغ آپ کے پُر مغز استدلال تک نہ پہنچ سکا مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''نمرود نے موت وحیات کے اسباب بعید وخفی کو چھوڑ کر اور صرف اسباب ظاہری وسطحی کو سامنے رکھ کر جواب دیا کہ سامان معیشت تو سب میرے ہاتھ میں ہے میں جسے چاہوں روزی دوں اور جسے چاہوں

بھوکوں مار ڈالوں، یا کسی اور طریقے سے اس کی زندگی ختم کر دوں''۔۵۱؎

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مناظرے سے معلوم ہوتا ہے کہ نمرود الوہی اقتدار و اختیار کا دعوے دار تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نظام ربوبیت و نظام حیاتی و فنائی اور اسباب معیشت کسی اور ذات کے لیے تسلیم کرنے پر کسی بھی صورت میں تیار نہیں تھے۔ ظاہر ہے حق و باطل میں مفاہمت کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔

عبدالماجد دریابادی مزید لکھتے ہیں کہ:

''اس استدلال کو اور زیادہ قریب الفہم بنانے کے لیے موحد اعظم نے دوسری مثال پیش کر دی، آپ نے فرمایا کہ یہی کر دکھاؤ سورج اپنے ارادہ سے عام سنت الٰہی کے خلاف ذرا اپنا رخ ہی بدل دے حضرت ابراہیمؑ نے استدلال وہی قائم رکھا۔ صرف مخاطب کی سطحی ذہنیت کا لحاظ کر کے اس کی مثال دوسری پیش کر دی اور فرمایا کہ اچھا کائنات حیاتی نہ سہی کائنات طبعی ہی کے خدائی نظام میں ایک ادنیٰ تصرف کر کے دکھا دو نمرود سورج دیوتا کا اوتار تھا، اور سورج کے خدائی اعظم ہونے کا قائل اس کے عقیدہ کے ابطال کی تردید میں سورج ہی کو پیش کرنا اس پر بہترین گرفت تھی۔ عاجز والا جواب ہو گیا۔ اس کا جواب کسی مشرک و آفتاب پرست کے پاس ہو سکتا تھا؟ نہ اس وقت کسی سے بن پڑا، آج کسی سے بن پڑنا ممکن ہے۔ عاجز ولا جواب ہو جانے کے باوجود وہ ایمان نہ لایا، اور ایمان لاتا ہی کیسے؟ جو لوگ غصہ اور عناد سے کجروی اختیار کئے ہوئے رہتے ہیں انھیں ہدایت کبھی بھی نصیب نہیں ہوتی''۔۵۲؎

## مشرکین پر مشرکانہ حماقت کا اعلانیہ سبق:

ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کہ اپنی قوم کی مشرکانہ حماقت کا برملا اظہار کیا جائے۔ جب اس قوم کے میلے کا دن آیا جس میں وہ بڑی خوشیاں مناتے اور کہیں شہر سے باہر جاتے تھے چھوٹے بڑے سب کے سب کھنچے چلے جا رہے تھے۔

تو آپؑ نے اپنے دل میں یا زیر لب کہہ دیا۔ اور آس پاس کے ایک دو شخصوں نے سن بھی لیا کہ اچھا جا تو رہے ہو کہ ''اور بخدا میں تمہارے بتوں کی گت بنا ڈالوں گا جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے۔ وَتَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُم بَعْدَ أَن تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ۔۵۳؎

یعنی میں تمہارے ان بتوں کی دھجیاں بکھیر دوں گا اور پوری طرح خبر لوں گا۔ ان سب لوگوں کے میلے

میں جانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک ہتھوڑی لے کر سب کو توڑ دیا اور جوان میں سب سے بڑا بت تھا وہ ہتھوڑی اس کے گلے میں لٹکا دیا۔

ارشاد باری تعالی ہے:

فَجَعَلَهُمْ جُذَاذاً إِلَّا كَبِيراً لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُون ۔۵۴

[چنانچہ آپ نے انھیں ٹکڑے ٹکڑے ہی کر ڈالا بجز ان کے بڑے (بت) کے، تا کہ وہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں۔]

جب قوم پوری میلے سے واپس ہوئی اور اپنے بتوں کا یہ حال دیکھا تو پورے شہر میں کہرام مچ گیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''اور اب منظر یہ ہے کہ مندر میں پوجا پاٹ کرنے والے جب پوجا کے لیے جمع ہوتے ہیں تو انھوں نے باقی مورتیوں کی یہ گت بنی دیکھی، سناٹے میں آ گئے اور ایک دوسرے سے لگے کہنے کہ ایسی شدید گستاخی کی جرأت ہوئی کس کو''؟۔۵۵

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

قَالُوا مَن فَعَلَ هَذَا بِآلِهَتِنَا إِنَّهُ لَمِنَ الظَّالِمِين ۔۵۶

[بعض ان میں بولے کہ ہم نے ایک نوجوان کو جسے ابراہیم کہا جاتا ان کا ذکر برائی کرتے سنا تھا۔]

تلاشی ہوئی پوری قوم جمع تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو طلب کر کے پوچھا گیا کہ اے ابراہیم! کیا تم نے یہ کیا ہے؟ تم نے ہمارے بتوں کی یہ درگت بنائی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام موقع کی تاک ہی میں تھے اور آپ نے اصل حقیقت پر بات کرنے سے پہلے ان کی ناسمجھی اور بے عقلی پر بھر پور طنز کیا اور بڑے بت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''کہ جی اور کیا۔ اور کہیں ان بڑے ٹھاکر جی ہی نے یہ حرکت نہ کی ہو۔ آپ ان ہی سے کیوں نہیں دریافت کر لیتے''۔۵۷

ان بے عقلوں پر اتنا بڑا حملہ تھا کہ ان کی زبانیں بند ہو کر رہ گئیں دل میں سوچنے لگے کہ یہ پتھر کے بے جان بت کیسے گفتگو کر سکتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے جھکے ہوئے سروں کو دیکھا تو فرمایا کہ اللہ تعالی کو چھوڑ کر کس کی پوجا میں لگے رہتے ہو؟ جو نہ ذرہ برابر تمہیں نہ نفع پہنچ سکتے ہیں اور نہ نقصان۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''تف ہے تمہاری مورتیوں کی بے بسی و بیچارگی پر اور تف ہے تمہاری عقل و دانش پر کہ ایسوں کو اپنا خدا مانے ہوئے اور بنائے ہوئے ہو۔'' ۵۸

یعنی جن مورتیوں کو اپنے ہاتھوں سے گڑھا اور تراشا انہیں کی پوجا کرنے میں لگ جاتے ہو۔

## آگ نے کر ہی دیا انداز گلستاں پیدا:

وہ تمام لوگ اپنے بتوں کی درگت اور توہین برداشت کر نہ سکے کہنے لگے کہ لوگو: اس کو مار ڈالو، جلا ڈالو، آپس میں مشورہ کر کے طے کیا گیا کہ اتنے بڑے جرم کی سزا تو یہی ہوسکتی ہے کہ ابراہیم کے لیے ایک بڑا آتش کدہ تیار کرا کر اس میں جھونک دیا جائے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی رقم طراز ہیں کہ:

''مجرموں کو آگ میں ڈال کر جلا دینے کی سزا اس وقت مختلف قوموں کے قانون میں عام تھی۔ روایات یہود میں آتا ہے کہ بادشاہ بابل نے ایک خاص بھٹی اس کے لیے تیار کرائی۔ پانچ پانچ گز کے دور میں لکڑی کا ڈھیر لگا کر اس میں آگ لگائی گئی اور ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینکا گیا''۔ ۵۹

ادھر تمام مشرکین نے اپنی تدبیریں کر کے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا ادھر اللہ نے آگ سے فرمایا اے آگ تو ابراہیمؑ پر سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا چنانچہ وہ آگ گل گلزار بن گئی۔

ارشادِ ربّانی ہے:

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْداً وَسَلَاماً عَلَى إِبْرَاهِيمَ ۶۰

[ہم نے حکم دیا اے آگ تو ٹھنڈی اور بے گزند ہو جا ابراہیمؑ کے حق میں۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کی تشریح فلسفیانہ انداز میں لکھتے ہیں کہ:

''جو خدا آپ کو جلانے کا حکم دیتا ہے وہ اس پر بھی آسانی سے قادر ہے کہ اسے نہ جلانے کا حکم بھی دے یہ کہنا کہ آگ تو جماد لایعقل اور بے شعور ہے اس سے خطاب کیوں کر ہوا گا۔ عجیب احمقانہ اعتراض ہے آگ کی جمادیت بے شعوری وغیرہ اگر ہے تو ہماری نسبت سے ہے۔ یا خود خالق کائنات کی نسبت سے بھی۔'' ۶۱

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

## ذبح عظیم، جو یادگار بن گئی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام بارگاہ خداوندی میں سراپا سوال بن کر یہ دعا کیا کرتے تھے۔

رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ۔[۶۲]

[اے میرے رب مجھے نیک اولاد سے نوازیے۔]

بالآخر اللہ تعالی نے آپ کی فریاد سن ہی لی۔ اور ایک حلیم، بردبار اور ہونہار اسماعیل کی صورت میں بیٹا عطا بھی کردیا گیا۔

اور اس نورِ نظر لخت جگر اسماعیل نے ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا اور امید ہو چلی تھی کہ یہ ہونہار بیٹا اپنے بوڑھے باپ کا ضعف و کمزوری کی عمر میں سہارا بنے گا۔

لیکن عین اسی زمانہ میں حضرت ابراہیم کو عالم رویا میں یہ حکم ربی پہنچا کہ: اپنے اکلوتے فرزند کو خدا کی راہ میں قربان کردیں انبیاء کے خواب بے معنی نہیں بامعنی ہوتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جب سیانے ہوکر باپ کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہوگئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عالم رؤیا میں دیکھا کہ آپؑ ان کو ذبح کر رہے ہیں۔ حضرات ابنیا کا خواب بھی وحی ہی کی ایک قسم ہوتا ہے آپ علیہ السلام اسے امر الٰہی سمجھے۔ اور تعمیل پر آمادہ ہوگئے''۔[۶۳]

بیٹا خواب سن لیا اب اپنی رائے بتاؤ۔

وہ بولے: ابا جان! آپ کر ڈالئے جو کچھ آپ کو حکم ملا ہے حکم ربی کے بعد صلاح مشورہ کیسا؟ کر گزریئے بیابان میں باپ نے اپنے بیٹے کو کروٹ لٹا دیا اور ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''جیسا کہ ذبح کے وقت جانور کو لٹاتے ہیں اور گلے پر چھری پھیرا ہی چاہتے تھے کہ ہم نے انھیں آواز دی کہ اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا۔ انسانی قربانی کا رواج اب تک بھی بعض باطل مذہبوں میں قائم ہے، اور اس زمانے میں تو یہ رواج عام تھا''۔[۶۴]

حضرت ابراہیمؑ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ جنتی مینڈھے کی قربانی کرا کر عملاً اس دستور کو صحیح رخ دے دیا گیا۔ اور انسانی قربانی کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔ چنانچہ اسی سنت ابراہیمی کو آج تک مسلمان زندہ کرنے کے لیے بے شمار جانوروں کی قربانیاں زمین کے گوشہ گوشہ میں کرتے ہیں یہ سب یادگار ہے اسی ذبح عظیم کی۔

## حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملک شام کی طرف ہجرت اور ترک وطن:

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ۔ ۶۵

[تو جب وہ کنارہ کش ہو گئے ان لوگوں سے اور ان سے بھی جن کی وہ لوگ اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے، تو ہم نے انھیں اسحٰق اور یعقوب کو عطا کیا۔]

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ آپ علیہ السلام کی ہجرت شام اور ترک وطن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جب آپ نے اپنے شہر حران (ملک کلدانیہ) سے ہجرت کر کے ملک شام میں آ بسے تو اس ترک وطن واہل وطن سے آپ دنیوی و مادی اعتبار سے بھی گھاٹے میں رہے۔ دوسرا وطن آپ کو مل گیا صاحب اولاد آپ ہوئے۔ اولاد در اولاد تک پیمبری ہوئی۔ ساری خوشیاں آنکھوں نے دیکھ لیں آپ کی اس ہجرت اور ترک وطن کا ذکر توریتِ موجودہ میں ان الفاظ میں ہے۔ اور خداوند نے ابرام کو کہا تھا کہ تو اپنے ملک اور اپنے فرانسیوں کے درمیان سے اور اپنے باپ کے گھر اس ملک میں جو میں تجھے دکھلاؤں گا نکل چل، اور میں تجھے اایک بڑی قوم بناؤں گا۔ اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور تو ایک برکت ہوگا سو وہ ملک کنعان میں آئے (پیدائش ۱۲۔۵) اور ابرام رفتہ رفتہ دکھن کی طرف گیا''۔ (پیدائش ۹:۱۲)۔ ۶۶

## دینی سرداری و امامت آپ کے حصہ میں تھی:

ارشاد خداوندی ہے کہ

قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً۔ ۶۷

[ارشاد ہوا کہ میں یقیناً تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔]

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''توریت میں بھی یہ وعدہ امامت ان الفاظ میں ہے اب اور میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ اور تجھ کو

مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا۔ اور تو ایک برکت ہوگا۔ اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں، برکت دوں گا اور ان کو جو تجھ پر لعنت کرتے ہیں لعنتی کروں گا، اور دنیا کے سارے گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے۔ (پیدائش: ۱۲۔۱،۲) یہ دینی سرداری اور امامت پورے ایک عالم کی آج تک آپ کے حصہ میں چلی آ رہی ہے، اور اسلام کے علاوہ بھی جو مذاہب توحید سے کچھ بھی لگاؤ کو رکھتے ہیں یعنی یہودیت و نصرانیت وہ آپ کی امامت پر متفق و متحد ہیں ایک نامور فرنگی فاضل بیسویں صدی کے ثلث اول کے ختم پر آپ کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے ابراہیم کی ہستی کسی بدوی سردار کی نہ تھی کہ وہ لوٹ مار کرے اور ملک گیری کرتے رہتے ان کی اصلی اہمیت مذہب کے دائرہ میں ہے۔ وہ حقیقتاً مورث اعلیٰ کسی نسل کے نہیں، بانی و امام وہ مذہبی تحریک کے تھے، محمد کی طرح جو ان کے دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے، وہ ساری قوموں اور قبیلوں کے رہنما کی حیثیت رکھتے، اور توریت کے حسب روایت وہ اسرائیلی مذہب کے بانی تھے''۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد اول، ص ۵۰، طبع چہارم دہم) ۶۸؎

یہود نصاریٰ کے نوشتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے فضائل اس وقت بھی درج تھے اور آج تک لکھے چلے آتے ہیں۔ توریت مروّجہ میں ہے:

''اپنے باپ ہام اور سرہ پر جو تمہیں جنی نگاہ کرو کہ جب میں نے اسے بلایا وہ اکیلا تھا پھر اس کو برکت دی اور اس کو بہت بنایا۔'' (یسعیاہ ۵۱: ۲) اور وہ خدا پر ایمان لایا اور یہ اس کے لیے صداقت محسوب ہوا۔'' (پیدائش ۱۵: ۶) اور مسیحیوں کی انجیل مروجہ میں ہے، ابراہیم خدا پر ایمان لایا یہ اس پر راست بازی گنا گیا بس جان لو کہ جو ایمان والے ہیں وہی ابراہیم کے فرزند ہیں: (گلیتون۔۳: ۶) نیز رومیوں۔ ۴: ۳) ۶۹؎

## حضرت ابراہیمؑ کی اولاد:

وَوَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوب۔ ۷۰؎

[اور ابراہیم علیہ السلام اس کی ہدایت کر گئے اپنے بیٹوں کو اور ایسی ہی یعقوبؑ بھی (اپنے بیٹوں کو)۔]

مفسر عبدالماجد دریابادیؒ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کتابِ پیدائش کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

''آپ کے صاحبزادے آٹھ تھے (۱) حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت ہاجرہ مصری کے بطن سے (۲) حضرت اسحٰقؑ، حضرت سارہ عراقی کے بطن سے (۳) زوان (۴) لقسان (۵) مدان (۶) مدیان (۷) اسیاق (۸) سنوح یہ سب حضرت قطورہ کے بطن سے تھے''۔ (پیدائش ۲۵: ۱،۲) ۷۱؎

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''اسماعیلؑ ابراہیمؑ کے فرزند اکبر تھے، آپ کی مصری بیوی حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے سال ولادت غالباً ۲۰۷۴ ق م۔ سال وفات غالباً ۱۹۳۷ ق م۔ توریت میں ہے کہ عمر ۱۳۷ سال کی پائی۔ آپ کے بارہ ۱۲ فرزند ہوئے اوران سے بارہ نسلیں چلیں، توریت میں ان بارہ فرزندوں کے نام درج ہیں اور یہ تصریح ہے کہ ''یہ اپنی امتوں کے بارہ رئیس تھے''۔ (پیدائش ۲۵: ۱۲) عرب کا مشہور وعالی نسب قبیلہ قریش آپ ہی کی نسل سے ہے، اس لیے آپ رسول اللہ ﷺ کے بھی مورث اعلیٰ ہوئے اہل کتاب کہلانے والوں نے آپ کے خلاف زہر اگلنے اور اپنے خبث وعناد کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھی ہے، تاہم ایسی کتاب کی تصریحات کو کیا کریں گے جو تحریف وتلبیس کی ہر ممکن کوشش کے بعد بھی نہ مٹ سکیں، ان میں ابراہیم خلیل کی دعا بھی شامل ہے اور خداوند کریم کے وعدے بھی اور تاریخ کا بیان بھی۔ ''اورابرام نے خدا سے کہا کہ کاش اسماعیلؑ تیرے حضور جیتا رہے''۔ (پیدائش ۱۷: ۱۸) اسماعیل کے حق میں میں نے تیری دعا سنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور ایسے برومندوں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا۔'' (پیدائش ۱۷: ۲) اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیرا انداز ہوگیا۔'' (پیدائش ۲۱: ۲۱) ۲۷؎

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ایک پیغمبر برحق کی حیثیت سے اسلام میں جو مقام ومرتبہ ہے وہ ظاہر ہے، لیکن آپ کا مستقل معجزہ یہ ہے کہ جن قوموں نے آپؑ کی اور آپؑ کی والدہ ماجدہ کی ہجو کی اور بدگوئی کو اپنا شعار بنالیا ہے، ان تک کہ نوشتوں میں آپ کی تعظیم منقول چلی آتی ہے چنانچہ بعض احبار یہود کا یہ قول آج تک یہود ہی کی دائرۃ المعارف میں لکھا چلا آتا ہے کہ:

''جو کوئی خواب میں اسماعیل کو دیکھ لے حق تعالیٰ کے ہاں اس کی دعا قبول ہوجائے گی''۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۶۔ ۶۲۸)''۔ ۳۷؎

## حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ماجدہ:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کی متعلق اکابر احبار یہود کی جیوش انسائیکلو پیڈیا کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

''آپ کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ شاہ مصر کی صاحبزادی تھیں، مصر کا شاہی خاندان حضرت ابراہیم

کے خاندان کی ایک شاخ تھا، عراق سے منتقل ہوکر مصر میں آباد ہو گیا تھا، جب حضرت ابراہیمؑ اپنے سفر میں ادھر سے گذرے تو بحیثیت ایک شیخ قبیلہ کے آپ کو شاہ مصر نے اپنا مہمان بنایا، اور رخصت کے وقت آپ کے اعزاز واکرام میں اپنی صاحبزادی کو بطور تحفہ پیش کیا، اور تواضع وانکساری کی راہ سے کہ مشرقی میزبانی کا خاصہ ہے، کہا کہ یہ آپ کی کنیزی کے لیے ہدیہ ہے، اور اردو زبان میں یہ محاورہ آج تک چلا ہوا ہے، شادی بیاہ کے موقع پر بڑے سے بڑا معزز شخص بھی اپنی لڑکی کو کنیز ہی کہہ کر داماد اور سمدھی کے سامنے پیش کرتا ہے مشرقی تواضع کے اس عام پیرایۂ بیان سے معاندین کو گویا ایک بڑی معتمد ومستند دستاویز ہاتھ آ گئی، اور ام اسماعیل ان کے یہاں آج تک کنیز ہی چلی آ رہی ہیں۔ واقعات بہرحال واقعات ہیں، انہیں کوئی کہاں تک جھٹلا سکتا ہے؟ اسی جیوش انسائیکلو پیڈیا میں اکابر احبار یہود کے حوالہ سے ہے۔ ہاجرہ فرشتہ ہی کو دیکھ کو ہیبت زدہ ہوئیں ان کی عصمت مآبی اس سے ظاہر کہ ابراہیم نے انہیں اپنے پاس سے الگ کر دیا جب بھی ان کی وفاداری میں فرق نہیں آیا، ان کے نام کے ایک معنی'' آراستہ '' بھی بیان ہوتے ہیں اور یہ اس بناء پر کہ وہ زیور اخلاق حسن عمل سے آراستہ تھیں''۔ جلد۶، ص: ۱۳۸۔ اور اسی میں ایک دوسری جگہ یہ روایت بھی درج ہے کہ:۔'' بادشاہ نے خود اپنی صاحبزادی بطور کنیز ہدیہ کردی''۔ (جلد ۱۱، ص: ۵۵) اور قصص یہود کا جو مجموعہ گنز برگ (GINZBERG) نے چار جلدوں میں مرتب کر کے شائع یا ہے اس میں ہے۔ بادشاہ مصر نے عہد کرلیا کہ وہ ابراہیم کو ہر طرح پر قوت وشوکت بنا کر رہے گا، چنانچہ اپنی بیٹی تک ہدیہ دے دی سارہ کی تعلیم وتربیت میں رہ کر وہ بھی ویسی ہی باخدا بن گئیں اور ہر طرح ابراہیم کی رفاقت کے قابل''۔ (جلد اول، ص: ۲۲۷ وص: ۲۲۸) ۴ے

## حقیقتاً بانیٔ اسلام کون؟ :

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے :

رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ۔۵ے

[اے ہمارے پروردگار ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنادے اور ہماری نسل سے اپنی ایک فرمانبردار اُمّت پیدا کر۔]

مولانا دریابادیؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

'' ایک یہودی ٹوری (Towry) نامی امریکہ کے ییل (Yale) یونیورسٹی کا استاد اپنی اسلام دشمنی میں آکسفورڈ والے مارگولیس آنجہانی کا پورا جانشین ہے، لیکن ایک بات بڑے پتے کی اس کی زبان سے

بھی نکل گئی ہے، کہتا ہے: اسلام کی بنیاد تو حقیقۃً اسماعیل کے ہاتھوں پڑی جو اہل عرب کے مورث اعلیٰ ہیں''۔

(جیوش فاؤنڈیشن آف اسلام، ص۶، دیباچہ)۔۷۶

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی والدہ اور آپؑ کی ولادت و وفات کے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

حضرت اسحٰق: حضرت ابراہیم، کے دوسرے صاحبزادے حضرت سارہ کے بطن سے تھے (۲۰۶۰ق م تا ۱۸۸۰ق م)۔ سال ولادت ۲۰۶۰ق م اور سال وفات ۱۸۸۰ق م، عمر شریف توریت میں ۱۸۰ سال درج ہے، یہ بھی درج ہے کہ آپ کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر سو سال تھی۔

آپ کے بستر مرگ کا منظر قصص الیہود میں یوں دکھایا گیا ہے:

''جب اسحٰق نے دیکھا کہ ان کا وقت موعود آپہنچا تو انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلالیا اور کہا کہ تمہیں خدائے تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں جس کی صفات، علیم، عظیم، قیوم، عزیز ہیں اور جو آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی ہر شی کا خالق ہے کہ تم خوف اسی کا رکھنا اور عبادت اسی کی کرنا''۔ (جلد اول، ص، ۴۱۶)۔۷۷

حضرت اسحٰق علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق یہود و نصاریٰ بھی کرتے ہیں، آپ کے صاحبزادوں میں سب سے زیادہ شہرت حضرت یعقوبؑ نے پائی، جو نبوت سے بھی سرفراز ہوئے۔

اہل تحقیق اور اکثر مفسرین حضرات کی رائے یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ذبیح اللہ تھے۔ لیکن توریت میں ذبیح اللہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کو بتایا گیا ہے۔ قرآن کریم نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کو صراحت سے بیان کردیا ہے۔

## حضرت یعقوب علیہ السلام اور آپؑ کی اولاد:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ حضرت یعقوب علیہ السلام اور آپؑ کی اولاد کے متعلق کتاب پیدائش کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ:

یعقوبؑ حضرت ابراہیم خلیلؑ کے پوتے اور حضرت اسحاقؑ نبی کے صاحبزادہ تھے اور نبی زادہ ہونے کے علاوہ خود بھی نبی تھے، اسرائیل آپ ہی کا دوسرا نام ہے۔

توریت میں ہے:

''اور خدا نے اسے کہا کہ تیرا نام یعقوب ہے، تیرا نام آگے کو یعقوب نہ کہلائے گا بلکہ تیرا نام اسرائیل ہوگا سو اس نے اس کا نام اسرائیل رکھا۔'' (پیدائش۔۳۵:۔۱۰۱)

عمر حسب روایت توریت ایک سوسینتالیس ۱۴۷ سال کی پائی زمانہ غالباً ۲۰۰۰ ق م تا ۱۸۵۳ ق م ولادت کنعان (فلسطین) میں ہوئی ۱۸۷۰ ق م میں اپنے نامور فرزند یوسفؑ نبی کے پاس مصر میں منتقل ہو گئے، وفات یہیں ہوئی۔

چار ازواج طاہرات سے آپ کے بارہ فرزند تھے، ان کے نام حسب تصریح توریت حسب ذیل ہیں:

(۱) روبن، (۲) شمعون (۳) لادی (۴) یہوداہ (۵) اشکار (۶) زبلون (۷) یوسف (۸) بن یامین (۹) دان (۱۰) نفتالی (۱۱) جد (۱۲) آشر۔ (پیدائش ۳۵:۲۴۔۲۶)۔۸ے

## نسل اسرائیلی اور نسل اسماعیلی کی رقابت:

مولانا دریابادی نسل اسرائیلی، اور نسلی اسرائیلی کی رقابت کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''نسل اسرائیلی اور نسل اسماعیلی دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک مدتوں سے چلی آ رہی تھی، حضرت ابراہیمؑ دونوں سلسلوں کے مورث اعلی تھے، ابتدائی نعمت خاص الخاص یعنی توحید کی علمبرداری نسل اسرائیل سے اس کی مسلسل نافرمانیوں کی پاداش میں چھن کر ایک اسماعیلی پیغمبر کے واسطے سے اب ساری دنیا کے لیے عام ہو رہی ہے''۔۹ے

## بنی اسرائیل:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی حضرت سارہؓ عراقی کے بطن سے جو نسل کا سلسلہ چلا، اسی کو قرآن کریم نے بنی اسرائیل کہا ہے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کے فرزند حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا، اور ان کا وطن ملک شام تھا، یہیں یہ لوگ آباد تھے قدیم فلسطین شام کا حصہ تھا، بنی اسرائیل ایک قومی ونسلی اصطلاح جو مذہبی حیثیت سے یہود اور اہل کتاب کے نام سے متعارف تھے، توریتِ محرف ومسخ شدہ ہو کر بھی ان کے درمیان موجود تھی، انبیاء علیہ السلام کی نبوت اور ان پر نزول وحی کی طرح روز جزا وسزا کے کسی نہ کسی صورت میں قائل تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا بَنِیۡ إِسۡرَائِیۡلَ اذۡكُرُواۡ نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡ أَنۡعَمۡتُ عَلَیۡكُمۡ ۔۸۰

[اے بنی اسرائیلؑ! میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیا۔]

مولانا دریابادی بنی اسرائیل کے سلسلے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مشہور و نامور پیغمبر حضرت ابراہیمؑ عراق ثم شامی ثم حجازی (۲۱۶۰ یا ۱۹۸۵ ق م) مشہور و نامور نسلیں چلیں ایک بی بی ہاجرہؑ مصری کے بطن کے فرزند حضرت اسماعیل سے، یہ نسل بنی اسماعیل کہلاتی اور آگے چل کر قریشی اسی کی ایک شاخ پیدا ہوئی، ان کا وطن عرب رہا۔ دوسری بی بی سارہؑ عراقی کے بطن کے فرزند حضرت اسحٰقؑ کے فرزند حضرت یعقوب عرف اسرائیلؑ سے یہ نسل بنی اسرائیل کہلاتی۔ اس کا وطن شام رہا، قدیم جغرافیہ میں فلسطین کوئی ایک ملک نہ تھا، شام ہی کا جز تھا، ایک تیسری نسل تیسری بیوی حضرت قطورہ سے چلی اور بنو قطورہ کہلائی، لیکن اسے تاریخ میں اس درجہ کی اہمیت حاصل نہیں''۔۸۱

## بنی اسرائیل کی دنیا والوں پر فضیلت اور اس کی حقیقت:

اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کو ان کے عہد میں ساری دنیا کے لوگوں پر فضیلت و برتری عطا کی تھی، وہ اس وقت روئے زمین کی سب سے برگزیدہ قوم تھی، اور وہ اللہ کے محبوب بندے تھے، قرآن مجید نے اس فضیلت و برتری کا ذکر کئی جگہ کیا ہے، اللہ تعالی نے سورہ بقرہ میں ارشاد فرمایا ہے:

يَا بَنِیۡ إِسۡرَائِیۡلَ اذۡكُرُواۡ نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡ أَنۡعَمۡتُ عَلَیۡكُمۡ وَأَنِّیۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعَالَمِیۡنَ۔۸۲

[اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو نعمت تم پر کی اور اس بات کو میں نے تمھیں دنیا فضیلت دی۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس فضل خداوندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''بنی اسرائیل نام کسی مذہب یا فرقہ یا عقیدہ کا نہیں ایک خاص نسل کا ہے، افضلیت یہاں مذہب یہودیت کی نہیں نسل اسرائیل کی بیان ہو رہی ہے سوال یہ ہے کہ اس نسل کی افضلیت سارے عالم پر کس معنی میں ارشاد ہو رہی ہے، اور وہ کون سی ایسی نعمت تھی جو بحیثیت نسل بنی اسرائیل کے ساتھ بلا شرکت غیرے مدتوں مخصوص رہی؟ اگر کہیے کہ دولت یا حکومت یا تجارت یا کثرت آبادی، تو اول تو یہ انعامات اللہ کے خود اس درجہ کے نہیں کہ ان کا ذکر اس شان واہتمام کے ساتھ کیا جائے اور انھیں کو معیار فضیلت و افضلیت بنایا جائے اور پھر یہ نعمتیں تو بہت سی قوموں کو اپنے اپنے ساتھ کیا جائے اور انھیں کو معیار فضیلت و افضلیت بنایا جائے اور پھر یہ نعمتیں تو بہت سی قوموں کو اپنے اپنے ساتھ کیا جائے اور انھیں کو معیار فضیلت و افضلیت بنایا جائے، اور پھر یہ نعمتیں تو بہت سی قوموں کو اپنے اپنے وقت میں

نصیب رہ چکی ہیں، کلدانیہ، مصر، ہندوستان ان سب ملکوں کا تمدن اپنے زمانہ میں اسرائیلیوں سے قبل عروج پر رہ چکا ہے اور تاریخ کا بیان ہے کہ ان قوموں کا دنیوی جاہ وحشم اسرائیلوں سے بڑھ چڑھ کر رہا ہے، پھر آخر قوم اسرائیل کی وہ مخصوص فضلیت کیا تھی؟ تاریخ کی زبان سے جواب ایک ہی ملتا ہے کہ وہ دولت یا اللہ کی اعلیٰ ترین نعمت ''مسلک توحید'' کی تھی۔ دنیا کی تاریخ کے جس دور میں ساری قومیں اور ساری نسلیں کم وبیش شرک میں مبتلا تھیں یا اس کی طرف بہی چلی جارہی تھیں، یہ نسل اسرائیل ہی ایک ایسی قوم تھی، جومن حیث القوم توحید کی علمبردار رہی عقیدۂ توحید وعقیدۂ رسالت میں چولی دامن کا ساتھ ہے کی اور انبیاء ورسل جہاں تک کسی نسل کا تعلق ہے نسل اسرائیل ہی میں مسلسل پیدا ہوتے رہے۔ انبیاء ورسل اور ان کی تعلیمات کا چرچا صرف بنی سرائیل میں تھا۔ ہندوستان کی آریہ نسل میں فلسفہ، ہندسہ، ریاضیات معقولات کے ماہرین وعلماء جیسے بھی پیدا ہوتے رہے ہوں بہرحال حلولیت کا شرک اس میں حلول ہی کئے ہوئے تھا، اور توحید ورسالت کی دعوت صرف سامی نسل کی شاخ اسرائیلی کے حصہ میں آئی تھی، موجودہ یہود کو بھی اپنے اسلاف کی یہ امتیازی حیثیت یاد ہے جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ہے: بنی اسرائیل پر خاص فرض عائد ہوا تھا کہ توحید باری کی دعوت دیتے رہیں اور آفتاب پرستی، ماہتاب پرستی کواکب پرست کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔'' (جلد ۶ ص ۵) بنی اسرائیل کا واحد فریضہ دنیا میں خدا کا گواہ بننا تھا۔'' (جلد ۶ ص ۲) مخلوقات کے مراتب مختلف ہیں ذی شعور مخلوق غیر ذی شعور سے فائق وبرتر ہیں انسان فائق ترین ہے، انسانوں میں بنی اسرائیل بحیثیت موحد پرستاران حق کے مشرکوں سے افضل وبالاتر ہیں''۔ (جلد ۶ ص ۱۱ ''سیاسی قوموں میں سب سے پہلے عبرانیوں ہی کی رسائی اپنے انبیاء کی تعلیم سے توحید باری تک ہوئی''۔'' (جلد ۸، ص ۶۵۹) ۸۳؎

## بنی اسرائیل پر فرعونیوں کے مظالم:

فرعون اور اس کے کارکنوں نے سرزمین مصر میں بنی اسرائیل پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے، اور انہوں نے بنی اسرائیل پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ کردی تھی، انتہائی ذلیل ورسوا کر کے رکھا تھا یہاں تک کہ معصوم نرینہ اولاد کو قتل کئے جانے اور بچیوں کو زندہ رکھنے کا قانون بنایا تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡأَرۡضِ وَجَعَلَ أَهۡلَهَا شِيَعاً يَسۡتَضۡعِفُ طَائِفَةً مِّنۡهُمۡ يُذَبِّحُ أَبۡنَاءهُمۡ وَيَسۡتَحۡيِیۡ نِسَاءهُمۡ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ۔ ۸۴؎

[ واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اوراس کے باشندوں کوگروہوں میں تقسیم کر دیا، ان میں سے ایک گروہ کووہ ذلیل کرتا تھا،اس کے لڑکوں کوقتل کرتا اوراس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا، یقیناً وہ مفسدلوگوں میں سے تھا۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرعونیوں کی اس باغیانہ روش اورظلم و بربریت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''فرعون نے باغیانہ روش اختیار کی اور خود کو خدا سمجھ بیٹھا،حکومت کا نظام بھی مساویانہ نہ تھا۔ملک کے عوام کومختلف گروہوں میں تقسیم کررکھا تھا۔کچھ گروہوں کے ساتھ ظلم و بربریت کے لئے سارے اقدامات کوروارکھا، یہاں تک کہ ان کی نرینہ اولاد کوقتل کئے جانے کا باضابطہ آئین بنایا،اورعورتوں کو اپنی خدمت کے لئے مجبورکیا''۔

توریت میں ہے:

اگر بیٹا ہوتو اسے ہلاک کردو،اوراگر بیٹی ہوتو اسے جینے دو،ان میں جو بیٹا پیدا ہواتوتم اسے دریا میں ڈالدو،اور جو بیٹی ہو،جیتی رہنے دو۔(خروج:۱:۱۵،۲۲)

مشہوراورقدیم یہودی مؤرخ جوزیفس (جس کا زمانہ حضرت مسیح سے معاً بعد کا ہے ) کے الفاظ بھی تقریباً یہی ہے:

یہ ایک بہت سخت ابتلا تھا۔(تاریخ آثار یہود، باب۲،فصل:۹) ۸۵؎

مولانا دریابادیؒ کتاب خروج کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مصریوں نے بنی اسرائیل کی زندگی تلخ بنادیا تھا اوروہ سخت محنت ومشقت سے کام لیتے تھے جس کی مزید تفصیلات تاریخ آثار یہود میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

توریت میں ہے:

''مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پرسختی کی،اورانہوں نے سخت محنت سے گارااوراینٹ کا کام،اورسب خدمت کھیت کی کرواکے ان کی زندگی تلخ کی،اوران کی ساری خدمتیں جووہ ان سے کراتے تھے،مشقت کی تھیں۔(خروج ۱:۱۳،۱۴)

قدیم ترین اسرائیلی مؤرخ جوزیفس کی تاریخ آثار یہود(History of Jewish anti Quities) میں تفصیلات اورزیادہ موجود ہیں۔

توریت میں ہے:

''اگر بیٹا ہوتو اسے ہلاک کردو۔اورفرعون نے اپنے سب لوگوں کوتاکید کرکے کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو اسے دریا میں ڈالدو''۔(خروج ۱:۵،۲۲)۸۶؎

## بعثت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی حالت:

قوم بنی اسرائیل ایک طویل عرصے سے فرعونیوں کے مظالم کی چکی میں پس رہی تھی، کئی صدیوں تک ظلم اور ڈکٹیٹرشپ کو برداشت کرتے کرتے فرعونیوں کا ڈروخوف بھی دل میں زبردست طریقے سے گھر کر گیا تھا۔ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں سے ایک نبی کو مبعوث کیا جو انتہائی مقدس ترین نبی ورسول حضرت موسیٰ کی شکل میں ظاہر ہوئے، جس فرعون کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا اس کا اصل نام ولید بن مصعب تھا۔فرعون بنی اسرائیل کو سخت سزائیں دیتا اور ان سے بے انتہا محنت ومشقت کے کام لیتا تھا اس کے باوجود یہ لوگ دین حق پر قائم رہے، حضرت آسیہ بھی ان ہی لوگوں میں سے تھیں جن کے ساتھ فرعون نے شادی کی تھی۔

## ولادت موسیٰ اور صندوق کا دریائے نیل کی نظر:

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو ان کی والدہ ماجدہ کو فرعونیوں کے قتل کا خدشہ لاحق ہوا اور نومولود کے معاملہ میں وہی کیا جس کا اللہ نے حکم فرمایا تھا، ارشاد الٰہی ہے:

إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّكَ مَا يُوحَى ٥أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي وَلِتُصْنَعَ عَلَى عَيْنِي ـ۸۷؎

[جب کہ ہم نے تمہاری ماں کو وہ بات الہام کی جو الہام ہی کئے جانے کے قابل تھی (یعنی) یہ کہ (موسیٰ) کو ایک صندوق میں رکھ پھر اسے دریا میں ڈال دے پھر دریا انہیں کنارہ لے آئیگا، تو انہیں وہ پکڑ لے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور ان کا دشمن ہے اور میں نے تمہارے اوپر اپنی طرف سے محبت کا اثر ڈال دیا تھا اور تاکہ تم کو میری خاص نگرانی میں پرورش کیا جائے۔]

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''یہ وحی، وحی نبوّت نہ تھی، وحی الہام تھی۔اور الہام غیر انبیاء کے لئے بھی جائز وثابت ہے۔بعض مسیحی فاضلوں نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کے والد ماجد عمران کا گھر لب دریا تھا۔نیل اسی طرف سے بہتا ہوا

فرعون کے محل کے نیچے سے گزرتا تھا اور ایک وقت مقررہ پر دختر فرعون (قرآن نے اس کی تصحیح کر کے بتایا کہ نہیں بلکہ آسیہ زوجۂ فرعون) سیر دریا کے لئے آتی تھی۔ والدۂ موسیٰ نے سوچا کہ بچہ کے بچنے کی اور کوئی صورت تو ظالم حکومت کے کارندوں سے ہے نہیں، ایک لگتی ہوئی صورت یہ البتہ ہو سکتی ہے کہ بچہ ازخود دختر فرعون (صحیح یہ کہ زوجۂ فرعون) کے حضور تک پہنچ جائے۔ بس یہی سوچ کر مادر مہربان صورتحال کا صحیح اندازہ کر کے موسیٰ کو بجرے پر بٹھا بہاؤ پہاڑ کے رخ چھوڑ دیا۔ اور نتیجہ بالآخر بالکل حسب مراد نکلا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، قدیم تذکرہ نویسیوں کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ بڑے حسین وجمیل تھے''۔۸۸؎

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن صندوق کے بہاؤ کی نگرانی کر رہی تھی اور برابر دریائے نیل کے کنارے اس صندوق کے بہاؤ کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ صندوق شاہی محل کی دیوار سے لگ گیا، فرعون کی بیوی حضرت آسیہ نے اپنی خادماؤں کے ذریعہ اسے اٹھوالیا، جب اسے کھلوا کر دیکھا تو ایک معصوم بچہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں، اور اس کی پرورش کے لئے انا کا اہتمام کیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِذْ تَمْشِي أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى مَن يَكْفُلُهُ فَرَجَعْنَاكَ إِلَى أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَقَتَلْتَ نَفْساً فَنَجَّيْنَاكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنَّاكَ فُتُوناً فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَى قَدَرٍ يَا مُوسَى۔۸۹؎

[(یہ اس وقت ہوا) جبکہ تمہاری بہن چلتی ہوئی آئیں پھر بولیں کہ میں تمہیں ایسے کا پتہ دوں جو اس کو (خوب اچھی طرح) پالے؟ تو ہم نے تم کو تمہاری ماں کے پاس پھر پہنچا دیا کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کریں۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کے متعلق قصر فرعونی میں کس طرح ہوئی، اس کو توریت کے حوالے سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''موسیٰ علیہ السلام کی بہن اجنبی بن کر شاہی محل کی طرف چلیں اور دیکھا کہ بچہ مچلا ہوا ہے تو خوش تدبیری کے ساتھ اپنی اور ان کی ماں ہی کو رضاعت کے لئے بلوایا''۔

توریت میں ہے:

''تب اس کی بہن نے فرعون کی بیٹی کو کہا کہ کہئے تو میں جا کے عبرانی عورتوں میں سے ایک دائی تجھ پاس

لے آؤں تا کہ وہ تیرے لئے اس لڑکے کو دودھ پلائے فرعون کی بیٹی نے اسے کہا کہ جا، وہ چھوکری گئی۔ اور لڑکے کی ماں کو بلایا فرعون کی بیٹی نے اسے کہا کہ اس لڑکے کو لے۔ اور میرے لئے دودھ پلا۔ میں تجھے درماہا دوں گی، اس عورت نے لڑکے کو لیا اور دودھ پلایا۔ (خروج ۲: ۷۔ ۹)۔ توریت میں ہے کہ ان صاحبزادی کا اسم مبارک مریم تھا۔ بہ قول بعض شارحین توریت کے یہ حضرت موسیٰ سے ۱۵/سال بڑی تھیں، اور اگر حضرت موسیٰ کی تاریخ پیدائش ۱۵۲۰ق م صحیح مانی جائے تو ان کی ہمشیرہ کا سال پیدائش ۱۵۳۵ق م ہوتا ہے۔[90]

والدہ موسیٰ ایک اجنبی دایہ کی حیثیت سے بلائی گئیں۔ رضاعت شروع کی۔ کبھی اپنے گھر لاتیں۔ کبھی فرعون کے محل پہنچا دیتیں۔

اس کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام جوان ہوگئے تو ایک دن دوپہر کے وقت شہر میں داخل ہوئے تو ایک قبطی اور سبطی (بنی اسرائیل) میں لڑائی ہو رہی تھی چنانچہ وہ سبطی فریاد رسی کرنے لگا، ظلم و زیادتی قبطی کر رہا تھا تو رگ حمیت جوش میں آگئی اور اسے ایک گھونسہ رسید کیا، گھونسے کا لگنا تھا کہ قبطی کا کام تمام ہوگیا۔ اتفاق سے آس پاس کوئی موجود نہ تھا اس لئے یہ بات صیغۂ راز میں رہ گئی کہ اس قبطی کا قاتل کون ہے؟

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَوَكَزَهُ مُوسَى فَقَضَى عَلَيْهِ [91]

[سو موسیٰ نے اس کو گھونسا مارا ہے پس اس کا کام تمام کر دیا۔]

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پایا کہ مصری ظالم تھا اور اسرائیلی مظلوم آپ نے گھونسا رفع ظلم کے لئے تادیباً مارا اور یہ محض اتفاق تھا کہ اس سے مصری مرگیا......فرعون کی قاہرانہ وجابرانہ حکومت تو اسرائیلیوں پر قائم ہی تھی۔ زور وقہر کے قصے سے اسرائیلیوں پر روز ہی پیش آتے رہتے ہوں گے''۔[92]

دوسرے دن پھر اسی طرح کا واقعہ پیش آیا کہ دو عبرانی آپس میں جھگڑ رہے ہیں اس مرتبہ وہ اسرائیلی ناحق پر تھا اس کی طرف آگے بڑھے وہ چلا اٹھا کہ تم ہی نے اس سے پہلے اس مصری کو قتل کیا ہے، آج مجھے بھی مارنے کا ارادہ ہے اس سے قتل کا راز فاش ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام وہاں سے مدین کی طرف ہجرت کر گئے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر مدین پہنچ گئے اور آپ علیہ السلام مصر سے مدین تک کے طویل

سفر کے بعد بھوک، پیاس کی شدت سے تھک کر چور ہو گئے تھے اس لئے ایک درخت کے سایہ میں آرام کر رہے تھے اور آپ علیہ السلام کے نزدیک ہی ایک کنواں بھی تھا وہاں دو لڑکیاں جو اپنی بکریوں کے ریوڑ کو پانی پلانے کے لئے لائی تھیں اور مجمع سے دور حیا و تہذیب کے ساتھ کھڑی اپنی باری کی منتظر تھیں کہ جب تک سرکش وقوی مردوں کا مجمع چھٹ نہیں جاتا اور یہ لوگ اپنے مویشیوں کو سیراب نہیں کر لیتے ہم یہیں کھڑے رہیں گے۔اور ہمارے والد بزرگوار کمزور وضعیف ہیں اب ان میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ یہاں آسکیں اوران کی مزاحمت کرسکیں۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ بات سنی تو آگے بڑھے اور خدمت خلق،شفقت کے تقاضے سے ان لڑکیوں کے جانوروں کو خود پانی بھر کر پلا دیا۔انہوں نے یہ واقعہ اپنے والد محترم سے جا کر بیان کیا تو ان کے والد نے کہا کہ بیٹی اس نوجوان کو گھر بلا لاؤ۔تاکہ ان کا کچھ تو حق میزبانی ادا کریں۔

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''شکر یہ ادا کرنا آج ہی کی مہذب ومتمدن قوموں کا شیوہ نہیں،قدیم تہذیب بھی اسے اپنا ایک جزء بنائے ہوئے تھی''۔

توریت میں ہے:

> ''اور جب وہ اپنے باپ رعوایل کے پاس آئیں،اس نے پوچھا کہ تم کیوں کر سویرے پھریں؟ وہ بولیں ایک مصری نے ہمیں گڈریوں کے ہاتھ سے بچایا،اور ہمارے لئے جتنا کافی تھا،پانی بھرا۔اور گلے کو پلایا،اس نے اپنی بیٹیوں سے کہا کہ وہ مرد کہاں ہے؟تم اسے کیوں چھوڑ آئیں؟اسے بلاؤ کہ روٹی کھاوے''۔(خروج۔۲:۱۸،۲۰) ۹۳

## حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شیخ کی بیٹی سے رشتۂ ازدواجیت:

ان بزرگ کی صاحبزادی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلانے آئی اور کہا کہ میرے والد نے آپؑ کو گھر بلایا ہے اور وہ اس کا بدلہ وصلہ دینا چاہتے ہیں جو آپ نے ہماری خاطر ہمارے جانوروں کو پانی پلایا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس تشریف لے گئے اوران سے اپنے حالات بیان کئے کہ میں ایک ظالم و جابر حکومت کے خوف سے ہجرت کر کے آیا ہوں انہوں نے کہا کہ تم خوف مت کرو کیونکہ تم ظالم لوگوں سے بچ

کر نکل آئے ہو۔

حضرت موسیٰ مہمان اور بزرگ میزبان کے درمیان یہ گفت وشنید ہو ہی رہی تھی کہ اس لڑکی نے جو حضرت موسیٰ کو بلانے گئی تھی اپنے والد محترم سے کہا کہ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ ۹۴

[اے ابّا! ان کو نوکر رکھ لیجئے کیوں کہ اچھا نوکر وہی ہے جو قوت دار ہو، امانت دار ہو۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

''جس کے قوائے جسمانی بھی اچھے ہوں، محنت سے اپنے کام انجام دے سکے، اور اخلاقی صفات سے بھی متصف ہو، خدمت کی بجا آوری میں خیانت وبد دیانتی سے کام نہ لے۔ ان بی بی صاحبہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق دونوں چیزوں کے تجربے اتنے عرصہ میں ہو چکے تھے۔ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ یہ گفتگو صاحبزادی نے اپنے والد سے فی الفور کی ہو...... قرآن مجید ایسے ہر موقع پر درمیانی وقفہ کو بالکل نظر انداز کر جاتا ہے''۔ ۹۵

قرآن کریم نے اس کے بعد کے واقعہ کو حذف کر دیا اور جو واقعہ کا اصل جز ہے اس کو بیان کیا، حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جس کو قرآن کریم نے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ:

قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَى أَن تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْراً فَمِنْ عِندِكَ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِي إِن شَاء اللَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ۹۶

[وہ بولے میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک تمہارے نکاح میں دے دوں، اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو اور اگر تم دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری طرف سے (احسان) ہے اور میں تم پر کوئی سختی نہیں چاہتا، تم انشاءاللہ مجھ کو خوش معاملہ پاؤ گے۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''کسی مدت معینہ تک مویشیوں کی چرائی کا مہر تقرر ہو جانا، فقہ اسلامی میں بھی جائز ہے۔'' ''یہ بکریاں اگر ان صاحبزادی کی تھیں، تب تو ان کا مہر ادا کیا جانا ظاہر ہے، اور اگر باپ کی تھیں تو بالغہ کی رضا سے ایسا معاملہ اس شریعت میں بھی جائز ہے''۔ (تھانوی، ج۲/ص:۲۱۷)

ایک پیغمبر وقت اپنے ہونے والے داماد سے اپنی لڑکی کی شادی کے باب میں جس آزادی اور صفائی سے گفتگو کرر ہے ہیں ہندوستان کے رسم زدہ شریف مسلمان اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں!...... ہندو دیش کی بیجا شرم وحیا، غیر معقول حجاب وتکلف کا اسلام کے اندر شائبہ ہی نہیں۔ ۹۷

## حضرت موسیٰ علیہ السلام مع اہلیہ مصر واپسی اور کوہِ طور پر تجلی الٰہی:

ایفائے عہد اور مدت مقررہ بسر کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام مع اہل وعیال اپنے وطن مصر روانہ ہوئے، تو راستہ میں اللہ نے نبوت کا تاج پہنا دیا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

إِذْ رَأَى نَاراً فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّيْ آنَسْتُ نَاراً لَّعَلِّيْ آتِيْكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۹۸

[جب انہوں نے آگ دیکھی سوانہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا تم یہیں ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے کیا عجب میں اس میں سے کوئی شعلہ لے آؤں یا آگ کے پاس راستہ (کا پتہ) پا جاؤں۔]

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''آپ جب چلے ہیں تو آپ کے ساتھ بکریوں کا گلہ بھی تھا اور جب گلہ تھا تو کچھ گلہ بان بھی ضرور ہمراہ ہوں گے''۔

''تب اس نے گلے کو بیابان کی ایک طرف ہانک دیا اور خدا کے پہاڑ حرب کے نزدیک آیا''۔ (خروج، ۳:۱)

جاڑے کی اندھیری راتوں میں میدان میں آگ روشن کرنا یا الاؤ جلا کر بیٹھنا مشرقی قوموں میں عام دستور رہا ہے۔ توریت کی مسخ شدہ روایت یوں ہے:

''اس وقت خداوند کا فرشتہ ایک بوٹے میں سے آگ کے شعلہ میں اس پر ظاہر ہوا، اس نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوٹا آگ میں روشن ہے اور وہ جل نہیں جاتا، تب موسیٰ نے کہا کہ میں اب نزدیک جاؤں اور اس بڑے منظر کو دیکھوں کہ یہ بوٹا کیوں نہیں جل جاتا۔ جب خداوند نے دیکھا کہ وہ دیکھنے کو نزدیک آیا ہے، تو خدا نے اسے بوٹے کے اندر سے پکارا اور کہا کہ اے موسیٰ، اے موسیٰ، وہ بولا میں یہاں ہوں''۔ (خروج ۳:۲۔۴) ۹۹

اور خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ جوتا اتار و اس لئے کہ یہ متبرک اور مقدس مقام ہے۔

مولانا دریابادیؒ کتاب خروج کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''توریت میں تصریح ہے کہ یہ حکم مقام کے تقدس کی رعایت سے تھا، تب اس نے کہا یہاں نزدیک مت آ، اپنے پاؤں سے جوتا اتار، کیونکہ یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے، مقدس زمین ہے''۔[خروج ۳:۵]۱۰۰؎

جس وقت طویٰ کی مقدس وادی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نبوت سے سرفراز کئے جارہے تھے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا زور بازو بنانے اور نبوت عطا کرنے کی درخواست کی اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس درخواست کو شرف قبولیت بخشا، اور حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز کردیا۔ کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں بچپن ہی سے ہکلا پن اور آپؑ کو بولنے میں دشواری ہوتی تھی جبکہ ہارونؑ فطری فصاحت و بلاغت لسانی کے مالک تھے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ دونوں بھائی اپنے وقت کے مغرور و متکبر اور ظالم و قاتل فرعون کے دربار میں دعوت دیں اور پیغام الٰہی لے کر جاؤ۔ دونوں بھائی دربارِ فرعون میں پہنچے، فرعون سے اہل دربار کے سامنے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہ کی عبادت کرو اور بنی اسرائیل پر ظلم و ستم نہ کرو مگر وہ نہ مانا اور مزید سرکشی پر اتر آیا۔ بلکہ ان سے نبوت کی دلیل طلب کرنے لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معجزات دکھائے تاکہ حق و صداقت قبول کرے مگر روگردانی بڑھتی گئی اور آپؑ کو جادوگر قرار دے دیا، فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کے لئے دربار کے نامور جادوگروں کو جمع کیا، مگر حق کے آگے باطل کی چل نہ سکی اور مقابلہ کے بعد تمام جادوگروں نے دعوت حق کو قبول کرلیا۔

**فرعونیوں کے بنی اسرائیل پر شدید مظالم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر کوچ کرنا:**

جادوگروں سے مقابلہ کرانے کے بعد فرعون کی زبردست شکست ہوئی تو اس نے بنی اسرائیل پر اور بھی مظالم ڈھانا شروع کردیئے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رات کی تاریکی میں اپنی قوم لے جانے کا حکم دیا تو وہ حضرت موسیٰ کی قیادت میں مصر سے اپنے آبائی وطن شام و فلسطین کی طرف نکلے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

فَأَسۡرِ بِعِبَادِیۡ لَيۡلاً إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ ۝ وَاتۡرُكۡ الۡبَحۡرَ رَهۡواً إِنَّهُمۡ جُندٌ مُّغۡرَقُونَ ۱۰۱؎

[سو میرے بندوں کو رات میں لے کر چلو، بے شک تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا اور سمندر کو ساکن

چھوڑ دو، یہ ڈوبنے والی فوج ہے۔]

## فرعون کی غرقابی:

ادھر فرعون کو بنی اسرائیل کی روانگی کی خبر ہوگئی اور اس نے خود لشکر کی کمان کی اور ان کا پیچھا کیا۔ بنی اسرائیل نے فرعون کو لشکر سمیت آتے دیکھا تو بہت گھبرائے کہ بنی اسرائیلیوں کے سامنے مشرق کی جانب سمندر، دائیں بائیں شمال وجنوب میں پہاڑیاں اور پشت پر یعنی مغرب کی جانب فرعونی لشکر۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّا تَرَاءَ ى الْجَمْعَانِ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَى إِنَّا لَمُدْرَكُون ٥قَالَ كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّى سَيَهْدِيْنِ ١٠٢

[پھر جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے ہمراہی (گھبرا کر) بول اٹھے کہ ہم تو بس پکڑے گئے، موسیٰ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں کیونکہ میرے ہمراہ میرا پروردگار ہے وہ مجھے ابھی راہ بتادے گا۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ توریت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''توریت میں ہے:''جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اوپر کیں، اور مصریوں کو اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھا، اور وہ شدت سے ڈرے، تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی، اور موسیٰ سے کہا کہ کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو وہاں سے بیابان میں مرنے کے لئے لایا؟''۔

(خروج ۱۴:۱۰، ۱۱)

''لوگوں کا اپنے مقابلے میں شاہی فوج کو دیکھ کر گھبرا جانا ایک حد تک امر طبعی تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وعدۂ نصرت الٰہی پر بھروسہ تھا، اپنے پیمبرانہ وقار وسکینت کے ساتھ فرمایا کہ ''گھبراؤ نہیں'' ایسا ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ میرے پروردگار نے میرا ساتھ کہیں چھوڑ تھوڑے ہی دیا ہے۔ وہ مخلصی کی راہیں ابھی ابھی مجھے دکھا کر رہے گا''۔۱۰۳

بنی اسرائیل اپنے کو ہر طرف سے محصور دیکھ کر بہت پریشان ہوئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کا اضطراب اور گھبراہٹ دور کرنے کے لئے تسلی دی اور وحی الٰہی کے اشارے سے ان کو بے خوف وخطر سمندر میں چل پڑنے کا حکم دیا۔ سمندر کا پانی سمٹ کر دونوں طرف پہاڑ جیسی دیواروں کی طرح کھڑا ہوگیا۔ اور سمندر کے

بیچ میں خشکی ہوگئی اس طرح مسبب الاسباب کی تائیدغیبی سے اسرائیلیوں کا قافلہ سمندر پارکرگیا لیکن جب فرعون اوراس کی قوم نے سمندر پارکرنا چاہااورسمندر پارکرنے کے لئے اس میں گھس پڑے تو وہی پانی کی کھڑی ہوئی دیواریں آپس میں مل گئیں اور سمندر کا پانی پہلے کی طرح رواں دواں ہوگیا۔

چنانچہ بنی اسرائیل نے فرعون اوراس کے لاؤلشکر کی غرقابی اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھی، ڈوبتے وقت فرعون نے ایمان قبول کرنا چاہا مگراس وقت اس کا ایمان بارگاہِ خداوندی میں مقبول ومعتبر نہ ہوسکا۔اور خدانے اس کے جسم کوآئندہ نسلوں کے لئے نمونۂ عبرت بنادیا۔

**بنی اسرائیل کونظام شریعت اوردستور حیات کا عطیہ:**

جب اسرائیلیوں کوطوقِ غلامی سے نجات مل گئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کومصری حکومت کے پنجہ غضب سے نکال لائے تو مشیت خداوندی ہوئی اورقوم بنی اسرائیل بھی یہی چاہتی تھی کہ ان کوکوئی مستقل کتاب یاایک مکمل نظام شریعت عطاہو،تاکہ یہ لوگ اس پرعمل کرکے گمراہیوں سے محفوظ رہ سکیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کوکتاب وشریعت عطاکرنے کے لئے جزیرہ نما کے ایک پہاڑ کی چوٹی کوہِ طور پرتیس راتوں تک رہنے کاحکم دیا،تیس راتیں گزرنے کے بعد انہیں دس راتوں کااوراضافہ کرکے چالیس کردیا،اس طرح یہ چالیس دن کاایک مکمل چلّہ ہوگیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کاارشاد ہے:

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۱۰۴؎

[اور(وہ وقت یادکرو)جب ہم نے موسیٰ کوکتاب اورفرقان دیئے تاکہ تم راہ یاب ہوجاؤ۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس کی آیت کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ:

’’(اورجزئیات تک کے لئے زندگی کاایک دستورالعمل ہاتھ آجائے)اجمالاً راہِ ہدایت یعنی توحید کی تعلیم تواسرائیلیوں کوپہلے سے ملی ہوئی تھی،اور پیمبران کے درمیان موجود ہی تھی،اب کتاب اس لئے نازل فرمادی گئی کہ ایک مستقل ومرتب دستورالعمل جزئیات زندگی کاان کے ہاتھ میں آجائے،اور آئندہ یہ راہ سے بھٹکنے نہ پائیں‘‘۔۱۰۵؎

لکھی ہوئی تختیوں کی شکل میں یہ دستورزندگی عطاکی گئی،اورانہیں لکھی ہوئی تختیوں کوتوریت کہا جاتا

ہے جس کی تفصیل خود توریت میں موجود ہے:

## توریت:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ ۱۰۶

[اور اس نے اتارا تھا توریت اور انجیل کو۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ''کتاب توریت'' کی تعریف اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''توریت اور انجیل قرآن مجید کی اصطلاح میں دو مستقل آسمانی کتابوں کے نام ہیں، اور قرآن مجید تصدیق انہی کی کرتا ہے:

''لیکن موجودہ بول چال میں توریت نام ہے متعدد صحیفوں کے مجموعہ کا، جن میں سے ہر صحیفہ کسی نہ کسی نبی کی جانب منسوب ہے، لیکن ان میں سے کسی ایک صحیفہ کی بھی تنزیل لفظی کا دعویٰ کسی یہودی کو نہیں''۔۱۰۷

یہود کا موجودہ عقیدہ ہے کہ توریت صاحب الہام انبیاء کی مرتب کی ہوئی ایک انسانی کاوش ہے، لیکن توریت اسلامی عقیدہ کے مطابق من جانب اللہ نازل شدہ کتاب ہے، لیکن اس کتاب میں انقلابی تحریف کا زمانہ بھی گذرا ہے، اور آج تک تحریف کا دروازہ بند نہیں ہوسکا۔

## کوہِ طور:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ۱۰۸

[اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا اور ہم نے تمہارے اوپر (کوہ) طور بلند کیا۔]

مولانا دریابادیؒ ''کوہِ طور'' کی جغرافیائی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ:

''طور مطلقاً پہاڑ کو بھی کہتے ہیں اور جزیرہ نمائے سینا کے ایک مخصوص و متعین پہاڑ کا بھی نام ہے، جدید جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ طور کا اطلاق جزیرہ نمائے سینا کی متعدد پہاڑیوں پر ہوتا ہے، لیکن حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے سلسلہ میں جبل طور سے مراد جبل سینا ہوتا ہے لیکن خود جبل سینا کی کوئی ایک چوٹی نہیں، متعدد چوٹیاں ہیں، انہیں میں سے کسی کا نام طور ہوگا''۔۱۰۹

## بنی اسرائیل کی شرک و گوسالہ پرستی:

بنی اسرائیل کو سب سے مقدم اور بنیادی حکم توحید اور خدا پرستی کا دیا گیا تھا، اور شرک و بت پرستی سے

باز رہنے کی تلقین کی گئی تھی ،مگروہ مصریوں کی شرک وبت پرستی سے مانوس ہوکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنے لئے دیوی دیوتا مقرر کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسی بیہودہ خواہش پر سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ تم کیسے نامعقول مطالبے اور جہالت کی باتیں کررہے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو فرعون کے مظالم سے نجات دی ہے اور قعر مذلت سے نکال کر عزت کی زندگی نصیب عطا فرمادی ہے اور خدا کی قدرت وکرشمہ سازی کے حیرت انگیز واقعات اپنی کھلی آنکھوں سے بار بار مشاہدہ کر چکے ہو پھر بھی اپنے لئے دیوی دیوتا مقرر کرنے کا مطالبہ کرتے ہو،حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سخت سرزنش کے بعد بھی یہ لوگ اپنی اصلاح نہ کرسکے بلکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا سے بنی اسرائیل کے لئے ہدایت وشریعت طلب کرنے کے لئے کوہِ طور پر چلے گئے تو ان کی عارضی غیر حاضری میں سامری جادوگر کے کہنے پر اپنا تمام سونا چاندی اس کے حوالے کردیا اس نے اس سونے چاندی کو گلا کر ایک ایسا بچھڑا بنادیا جس سے ایک آواز نکلتی تھی حضرت ہارونؑ کی سخت دارو گیر کے باوجود عملی طور پر بت پرستی کا ارتکاب کر بیٹھے اور اپنے ہی زیورات سے بچھڑے کی ایک مورت بنا کر اس کی پوجا شروع کردی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجلَ مِن بَعْدِهِ وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ ۱۰۱

[پھر تم نے ان کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کرلیا اور تم (سخت) ظالم تھے۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ بنی اسرائیل کی شرک وگوسالہ پرستی ادیبانہ انداز میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''حضرت موسیٰ کی عارضی غیر حاضری کے زمانہ میں،ادھر حضرت موسیٰ پہاڑ پر تشریف لے گئے،ادھر ان کی مؤحد قوم نے گردوپیش کی مشرک قوموں کی دیکھا دیکھی ایک گوسالہ کی مورت سونے کی بنا کر اس کی پرستش شروع کردی۔

توریت میں خروج کا باب ۳۲ پورا اسی گوسالہ پرستی کی تفصیلات کی نذر رہے۔قرآن مجید نے اس قسم کے فسق شدید بلکہ شرک کو اکثر ظلم ہی سے تعبیر کیا ہے اور واقعی اس سے بڑھ کر ظلم انسان کا اپنے حق میں اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔اسرائیلیوں میں یہ گمراہی آئی کہاں سے؟اس سوال کے جوابات مختلف دیئے گئے ہیں،ایک قول ہے کہ مصریوں کی گاؤ پرستی کا عکس تھا،دوسرا قول ہے کہ مشرک کنعانیوں (فلسطینیوں) کے ہم جوار ہونے کا اثر تھا،تیسرا قول ہے کہ گوسالہ مورت تھی چندر ماں دیوتا کی،اور گوسالہ پرستی

مرادف تھی ماہتاب پرستی کی، بہرحال یہ شرک جس راہ سے بھی آیا ہو، قرآن نے اسے شرک ہی قرار دیا، خواہ وہ مورتی (نعوذ باللہ) خدائے واحد ہی کی کیوں نہ بنائی گئی ہو۔

گوسالہ پرستی اور شرک جیسے انتہائی جرم کی سزا چاہیئے تو یہ تھا کہ ساری قوم کو ملتی، شرک کرنے والوں کو شرک کی، اور باقی تماشہ دیکھتے رہنے والوں کو سکوت عن الحق اور اعانت جرم کی، لیکن واقعتاً سزا صرف ایک مخصوص گروہ کو ملی (جیسا کہ ابھی آتا ہے) اور باقی ساری قوم توبہ واستغفار کے بعد بچ گئی''۔۱۱۱

## بت پرستی کے مجرمین کو سزا:

ارشاد خداوندی ہے:

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۱۱۲

[اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم یقیناً تم لوگوں نے اپنے اوپر ظلم کیا اپنی گوسالہ گیری سے، سو اب اپنے خدا سے توبہ کرو، پھر اپنے اشخاص کو قتل کرو، یہی بہتر ہے تمہارے حق میں تمہارے خدا کے نزدیک، پھر اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔]

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''توریت میں اس موقع پر ہے، اور موسیٰ نے کہا آج خداوند کے لئے اپنے تئیں مخصوص کرو، ہر ایک مرد اپنے بیٹے اور بھائی پر حملہ کرے، وہ تمہیں برکت دے''۔ (خروج ۳۲:۲۹) ۱۱۳

## صحرائے سینا میں اسرائیلیوں پر اللہ کے احسانات وانتظامات:

## بادل کی نعمت:

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر شام و فلسطین کی سرزمین میں آباد کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس سرسبز و شاداب علاقہ کا انتخاب اسی لئے کیا گیا تھا کہ بنی اسرائیل کو معیشت اور رزق کی طرف سے کسی قسم کی پریشانی لاحق نہ ہو۔ مگر جب بنی اسرائیل اس سرزمین میں داخل ہوئے تو وہ نہایت ہی بودے پن اور ڈرے سہمے انداز میں داخل ہوئے کہ کہیں وہاں کی قومیں ان کو ہڑپ نہ کر جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بے آب و گیاہ صحرائے سینا میں دھوپ، فاقہ، اور پیاس کی تکلیفوں سے بچانے کے لئے بہترین انعامات کا انتظام فرمایا تھا جبکہ بنی اسرائیل آفتاب کی تپش سے بچنے کے لئے صحرائے

سینا میں ادھر ادھر بھٹک رہے تھے، ایسے پریشان کن حالات میں بھی اللہ تعالیٰ نے بادل کی نعمت اور سایۂ رحمت مہیا کر دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس سایہ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

وَ ظَلَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡغَمَامَ ۱۱۴

[اور ہم نے تمہارے اوپر ابر کا سایہ کر دیا۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس نعمت خداوندی اور سایۂ رحمت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ:

''جزیرہ نمائے سینا جیسے ریگستانی ملک اور چٹیل میدان کی دھوپ میں سایہ میسر آ جانا واقعی سایۂ رحمت سے کم نہیں، توریت میں ستون ابر، اور ستون آتش دونوں کا ذکر بطور معجزہ کے ہے۔ سیاق قرآنی سے معجزہ کا پہلو لازم نہیں آتا، ذکر عام نعمتوں کا ہو رہا، جو بنی اسرائیل پر ان کی تاریخ کی اہم ترین دور میں برابر نازل ہوتیں رہیں، اور قرآن مجید نے عام مستقل اور بہ ظاہر طبیعی اسباب سے پیدا شدہ نعمتوں کو کہیں بھی معجزانہ اور خارقانہ نعمتوں سے کم اہمیت نہیں دی ہے''۔

توریت میں ہے:

''اور خداوندی دن کو بدلی کے ستون میں رہا، تاکہ انہیں راہ بتائے، اور رات کو آگ کے ستون میں ہوئے تاکہ انہیں روشنی بخشے، ان کے آگے چلا جاتا تھا، تاکہ دن رات چلے جائیں اور بدلی کا ستون دن کو اور آگ کا ستون رات کو ان کے آگے سے ہرگز نہ اٹھاتا تھا''۔ (خروج ۱۳:۲۱،۲۲۲)

روایات یہود میں حسب بیان جیوش انسائیکلوپیڈیا (جلد۴،ص۱۲۳) یہ تصریح بھی موجود ہے کہ بنی اسرائیل جب کثرت معاصی میں مبتلا ہو جاتے تھے تو یہ ابر ان پر سایہ کرنا چھوڑ دیتا تھا''۔۱۱۵

## پانی کی نعمت اور بارہ چشموں کا غیر معمولی انتظام:

جب بنی اسرائیل صحرائے سینا کے مقام رقیدیم پہنچے تو وہاں پانی نایاب پایا، اور سفر کی طوالت اور پیاس کی شدت سے بے حال اور پریشان تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنی جھنجھلاہٹ اور غصہ اتارنے لگے اور کہنے لگے کہ اے موسیٰ اس سے تو ہم مصر ہی میں اچھے تھے کہ وہاں کم از کم بنیادی ضروریات تو مل جایا کرتی تھیں یہاں تو ہم پانی کے ایک ایک قطرہ کے لئے سخت پریشان اور بیدم ہیں۔

ارشادِ ربانی ہے:

وَإِذِ اسۡتَسۡقَى مُوسَى لِقَوۡمِهِ فَقُلۡنَا اضۡرِب بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ فَانفَجَرَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡناً قَدۡ

عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ٦ ١١٦

[اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی کی دعا مانگی سو ہم نے کہا (اے موسیٰ) اپنا عصا (فلاں) پتھر پر مارو تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر لیا کھاؤ پیو، اللہ کے (دیے ہوئے) رزق میں سے، اور زمین پر شرارتی بن کر مت پھرو۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''پہاڑی چشمہ پہاڑیوں کے اندر سے ابلتے ہوئے پانی کے دھارے ہر ایک کے مشاہدہ میں آچکے ہیں، حضرت موسیٰ نے جب پانی کیلئے بارگاہ الٰہی میں عرض کی تو انہیں ہدایت ہوئی کہ فلاں پہاڑی تک چلے جاؤ، وہاں چٹان پر اپنا عصا مارو۔ پانی ابلنے لگے گا۔توریت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہاڑی جس سے چشمہ ابلا حورب یا حرب میں واقع تھی''۔

خدا نے موسیٰ کو فرمایا کہ لوگوں کے آگے جا اور بنی اسرائیل کے بزرگوں کو اپنے ساتھ لے اور اپنا عصا جو تو نے دریا میں مارا تھا، اپنے ہاتھ میں لے اور جا اور دیکھ کہ میں وہاں حرب کے چٹان پر تیرے آگے کھڑا ہوں گا، تو اس چٹان کو ماریو، اس سے پانی نکلے گا، تا کہ لوگ پیویں، چنانچہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کے بزرگوں کے سامنے یہی کیا۔ (خروج ١٧:٥،٦)۔ ١١٧

مولانا دریابادیؒ مزید اس پہاڑی چشمے کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ:

''اس پہاڑی چشمے سے بارہ دھارے یا بارہ ٹوٹیاں الگ الگ جاری ہو گئیں، بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی تعداد کے عین مطابق، بعض نادان مسیحیوں نے اس تعداد پر اعتراض کر دیا کہ یہ تو بائبل میں موجود نہیں، قرآن نے کہاں سے گڑھ کر کہہ دیا، قدرت نے سوال کا جواب بھی مسیحیوں کی زبان سے دلوا دیا۔ جارج سیل انگریزی میں قرآن کریم کا قدیم ترین مترجم ہے۔ آیت کے حاشیہ پر لکھتا ہے:

''ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے، بتصریح بیان کرتا ہے کہ چٹان سے پانی بارہ مقامات سے نکلتا تھا''۔

پادری ڈین اسٹینلی (Dean Stanley) نے جو انیسویں صدی میں مسیحیت کے ایک ممتاز رکن ہوئے ہیں صدی کے وسط میں بائبل کے مقامات مقدسہ کی جغرافی تحقیق کے لئے بہ نفس نفیس فلسطین اور اس کے ملحقات کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات و تحقیقات پر ایک مستقل تصنیف (Sinai And Palestine) کے نام سے شائع کی اس میں اس چٹان کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

''یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے، آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور اس سفسفہ کے قریب لیجا کی وسیع وادی میں واقع ہے، شگاف اور دراز جابجا پڑے ہوئے ہیں، کچھ مٹے ہوئے ہیں، کچھ بڑے ہیں، کچھ چھوٹے، گنتی میں اگر سب کو لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں۔ اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس۔ سب سے پہلے قرآن ہی نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لئے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے۔ یہ اشارہ انہیں شگافوں کی طرف ہے''۔ (۳۷۔۳۶)۔۱۸

## منّ:

اسی طرح بنی اسرائیل کو بغیر محنت ومشقت جو غذارات کے اندھیرے میں درختوں کے پتوں پر مل جایا کرتی تھی وہ ''من'' تھی۔ قرآن کریم میں ہے:

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَى كُلُواْ مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَـكِن كَانُواْ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۱۹

[اور ہم نے تمہارے اوپر منّ وسلویٰ اتارا، کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دے رکھی ہیں اور انہوں نے زیادتی ہم پر نہیں کی بلکہ زیادتی اپنی ہی جانوں پر کرتے رہے۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ توریت کی تصریحات کے حوالے سے اس آیت کی تشریح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ کوئی لذیذ قدرتی غذا تھی جو بنی اسرائیل کو مسلسل مسافرت کے زمانے میں بلا مشقت وتعب مل جاتی تھی، توریت کی تصریحات اس بارے میں حسب ذیل ہیں، صبح کو لشکر کے پاس اوس پڑی، اور جب اوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا زمین پر پڑی ہے، اور بنی اسرائیل نے دیکھ کر آپس میں کہا کہ من ہے، کیونکہ انہوں نے نہ جانا کہ وہ کیا ہے تب موسیٰ نے انہیں کہا کہ یہ روٹی ہے، جو خداوند نے کھانے کو تمہیں دی ہے۔ (خروج ۱۶:۱۴، ۱۵)

''اسرائیل کے گھرانے نے اس کا نام من رکھا، اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید تھی، اور مزہ اس کا شہد میں ملی ہوئی پھلواری کا تھا''۔ (خروج ۱۶:۳۱)

''اور من سوکھے دھنیے کے مانند تھا، اور اس کا رنگ موتی کے دانہ کا سا تھا لوگ ادھر ادھر جا کر اسے جمع کرتے تھے اور پھلکیاں بناتے تھے، اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا، اور رات کو جب خیموں پر اوس پڑتی تھی، تو ''من'' بھی ان پر پڑتا تھا''۔ (گنتی ۱۱، ۸، ۱۱)۔۲۰

## سلویٰ:

اسی طرح مولانا دریابادیؒ سلویٰ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''یہ ایک قسم کا بیٹر ہے، بٹیر جزیرہ نمائے سینا کا خاص جانور ہے، بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے، گرمی میں شمال کی جانب چلا جاتا ہے، جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آجاتا ہے، اڑتا اونچا نہیں، بہت نیچے رہتا ہے، تھک بہت جلد جاتا ہے، شکاری بڑی آسانی سے ہوجاتا ہے''۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا، جلد۱۰، ص ۲۸۵)

''اس کا شمالی سفر مصر سے فلسطین کی جانب عموماً مارچ میں ہوتا ہے، اور جنوبی سفر فلسطین سے مصر کی طرف عموماً نومبر میں، یہ اسرائیلی بیٹر وہ تھے جو مارچ اپریل میں رات کے وقت اپنے شمالی پرواز میں ہوتے ہیں''۔[۱۲۱]

ان تمام نافرمانیوں کے باوجود بنی اسرائیل پر برابر من جانب اللہ آسمانی نعمتوں کا نزول ہو رہا تھا، ان نعمتوں کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بے آب و گیاہ لق و دق ریگستان میں جہاں رزق اور غذا کے بہ ظاہر طبیعی اسباب و وسائل مفقود تھے، لیکن وہ بنی اسرائیل کو تخم ریزی اور آب پاشی کی محنت و مشقت کے بغیر صرف اللہ کے فضل و کرم سے میسر آگئے تھے۔

بنی اسرائیل مصر سے بے سروسامانی اور خانہ بدوشی کی حالت میں نکلے تھے، اگر ان پر بادل کا سایہ نہ کردیا گیا ہوتا تو وہ دھوپ کی شدت اور آفتاب کی تمازت سے ہلاک ہوجاتے، اسی طرح جزیزہ نمائے سینا کے بیابانی علاقہ میں پیاس کی شدت رفع کرنے کے لئے ایک پہاڑی سے بارہ چشمے جاری کردیئے گئے تاکہ ہر ہر قبیلہ اپنے اپنے پانی کے گھاٹ متعین کرلے اور ان کے درمیان پانی لینے پر کوئی جھگڑا نہ ہو۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے لئے اللہ کی طرف سے ایک انعام یہ تھا کہ من وسلویٰ آسمان سے اترتا اور وہ ان کو رات کے اندھیرے میں پکڑتے اور ان کا گوشت پکا کر کھاجاتے اور روٹی کی جگہ منّ (سفید رطوبت) عطا کی گئی تھی جو درختوں پر گرا کرتی تھی۔

ان تمام انعامات واحسانات کے باوجود مسلسل اللہ کی نافرمانیوں میں لگے رہے اور اس کی نعمتوں کی ناقدری اور ناشکری کرتے رہے۔ اور اس کے پیغمبروں اور اس کی آیتوں کی تکذیب واستہزاء کرتے رہے۔

## فصل سوم:

# یہود کے ایمانی واخلاقی بگاڑ اور بعض عقائد باطلہ

### یہود کا حب دنیا وزر پرستی:

یہود کی ساری تگ ودو اور ہر قسم کی سرگرمیاں صرف دنیا و مال کی حصولیابی کے لئے وقف ہوگئی تھیں۔ وہ اس کے پیچھے ایسے دیوانے ہوگئے تھے کہ ان کی نظروں میں آخرت کی کوئی وقعت اور قدر و قیمت نہ رہ گئی تھی۔اسی لئے ان کو زندگی سے محبت اور موت سے سخت وحشت اور گھبراہٹ ہوتی تھی، حالانکہ اگر موت سے طبعی حدود میں رہتے ہوئے وحشت ہوتی تو اسلام میں اس پر کوئی ملامت نہیں ہے لیکن یہود کا دل جذبۂ حب دنیا اور مال میں غرق ہو چکا تھا اور روحانیت کا ذوق بالکل مردہ ہو چکا تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ۔[۱۲۲]

[اور آپ انہیں زندگی پر حریص سب لوگوں سے بڑھ کر پائیں گے، یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی بڑھ کر، ان میں سے ایک ایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار (ہزار) برس کی عمر پائے، حالانکہ اتنی عمر وہ پا بھی جائے تو یہ امر اسے عذاب سے تو نہیں بچا سکتا، اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کی تشریح میں یہود کی حب دنیا و مال کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''اور یہود کی حب دنیا، حب مال آج بھی ضرب المثل ہے، جیوش انسائیکلوپیڈیا میں تالمود وغیرہ کے حوالے سے اس مضمون کے متعدد قول نقل ہوئے ہیں کہ دنیوی زندگی بجائے خود ایک بڑی نعمت ہے، معصیت گوارہ کر لینا چاہئے، لیکن موت نہ گوارا کرنا چاہئے، مشرکین تو سرے سے اخروی نعمتوں کے لذت شناس ہی نہیں، وہ اگر ادھر سے غیر ملتفت ہو کر اپنا مرکز توجہ ومحور زندگی اسی مادی زندگی کو بنائے

رکھیں تو کچھ ایسا حیرت انگیز نہیں، غضب تو یہ یہود کر رہے ہیں جو اپنے آسمانی صحیفوں اور پیمبرانہ ہدایتوں کے باوجود بھی مشرکوں سے بڑھ کر دنیا سے لپٹے ہوئے ہیں''۔۱۲۳

قرآن کریم نے ان کی بزدلی اور خوف وہراس اور جہاد فی سبیل اللہ سے فرار اختیار کرنے کے جو واقعات بیان کئے ہیں ان سے بھی ان کی یہی مکروہ تصویر سامنے آتی ہے۔

یہود میں حب دنیا و مال کے ساتھ اور بھی بہت سی ایمانی واخلاقی برائیاں سرایت کر چکی تھیں مثلاً انہوں نے آیات الٰہی کو ذریعۂ معاش وتجارت بنالیا تھا، اور کتاب الٰہی میں خودساختہ احکام وقوانین اور من گھڑت فتوے شامل کر کے ان کو خدا کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے، اور اس پر لوگوں سے معاوضہ لے لیا کرتے تھے، دنیا کے چند سکّوں کی خاطر اللہ کے عہد و پیمان کو توڑ کر رکھ دیا تھا، ان کو ان معاصی کے کرنے میں ذرہ برابر قباحت وعار محسوس نہ ہوتی تھی اور اگر کبھی اس زر پرستی وحب دنیا پر ان کا ضمیر ملامت کرتا تو اسے جھوٹی تاویلوں اور موہوم تمناؤں کے ذریعہ تسکین دے لیتے کہ ہم خدا کے محبوب ومقرب بندے ہیں ہماری ساری خطائیں معاف ہیں۔

قرآن کریم نے ان کی اس ذہنیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۱۲۴

[اور کہتے ہیں ہمارے لئے سب معاف کر دیا جائے گا۔]

اس کے اندر وہ تمام اموال جو جھوٹ، فریب، رشوت، خیانت، چوری، سود، غصب، جوئے بٹہ وغیرہ ناجائز طریقوں سے حاصل کئے گئے ہوں وہ سب شامل ہیں۔

## اہل کتاب کے علماء ومشائخ بھی مال کے سخت حریص ہو گئے تھے:

یہود ونصاریٰ کے علماء ومشائخ جو ''احبار'' اور ''رھبان'' کہلاتے ہیں یہ لوگ بھی مال کے سخت حریص ہو گئے تھے اور انہوں نے حق پرستی کا راستہ چھوڑ کر دنیا پرستی کا طریقہ اپنا لیا تھا، قرآن کریم نے اکل اموال بالباطل کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں ان کو ایک ہی لفظ میں سمیٹ دیا ہے، سورہ توبہ کی درج ذیل آیت میں ان کے علماء ومشائخ کا کردار بیان کیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيراً مِّنَ الأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ

عَن سَبِيْلِ اللّٰهِ ۱۲۵؎

[اے ایمان والو! اہل کتاب کے اکثر علماء ومشائخ لوگوں کے مال باطل طریقوں پر کھاتے رہتے ہیں، اورلوگوں کواللہ کی راہ سے روکتے رہتے ہیں۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ یہود کے علماء ومشائخ کا کردار نہایت ہی مختصر الفاظ میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''یہ علماء اور مشائخ لوگوں کو ٹھگتے رہتے ہیں، مثلاً یہ کہ معتقدین کی مرضی دیکھ کر انہیں اس کے موافق فتویٰ دیدیا اوران سے نذرانہ وصول کرلیا۔ عوام ان کے جھوٹے سچے فتووں میں آکر عمر بھر گمراہی میں بھٹکتے رہتے ہیں''۔ ۱۲۶؎

## یہود کا جھوٹ:

یہود کے اخلاقی انحطاط کے اسباب میں ایک سبب یہ تھا کہ ان میں جھوٹ کا خوب زور تھا:

وَمِنَ الَّذِيْنَ هادُوا سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ ۱۲۷؎

[اوران لوگوں میں سے جنہوں نے یہودیت اختیار کی جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں۔]

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''منافقین اور یہود دونوں قسم کے لوگوں میں وصف مشترک یہ ہے کہ یہ لوگ جھوٹ اور باطل کے بڑے سننے اور قبول کرنے والے ہیں''۔ ۱۲۸؎

سمّاع مبالغہ کا صیغہ ہے مطلب یہ ہے کہ یہ بہت زیادہ جھوٹ بولتے ہیں گویا کہ وصف کذب ان کے خمیر میں داخل ہوگیا تھا اورانہوں نے جھوٹ کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ جھوٹی گواہی، جھوٹا بیان اور جھوٹا اشتہار ان کا معمول ہوگیا تھا۔ کذب بیان میں یہود کے عوام ہی نہیں، ان کے علماء بھی اس میں ملوث تھے۔

## یہود کی خیانت:

یہودیوں میں منجملہ اخلاقی برائیوں میں ایک بڑی خرابی خیانت کی بھی تھی، خیانت امانت کی ضد ہے، خیانت کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان کا حق جو دوسرے انسان کے ذمہ واجب ہو اس کے ادا کرنے میں ایمانداری نہ برتنا ''خیانت'' اور ''بد دیانتی'' ہے۔ عام طور سے خیانت کا دائرہ صرف روپئے پیسے، جائداد اور مالی اشیاء تک محدود سمجھا جاتا ہے، مگر درحقیقت اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہود ہر قسم کی خیانت اور بد دیانتی میں مبتلا تھے۔

انہوں نے سب سے بڑی خیانت آسمانی صحیفوں اور پیمبرانہ ہدایتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے احکام وقوانین اوراس کی شریعت میں کی تھی۔

قرآن کریم نے ان کی خیانت اور بددیانتی کا حال اس طرح بیان کیا ہے کہ:

وَمِنْهُم مَّنْ إِن تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِماً ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُواْ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ[۱۲۹]

[اوران میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اگرتو اس کے پاس ایک دینار امانت رکھا دے تو وہ تجھے اس کو واپس نہ کرے بجزاس صورت کے کہ تو اس (کے سر) پر کھڑا رہے یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر امّیوں کے باب میں کوئی ذمہ داری ہی نہیں، یہ لوگ اللہ کے اوپر جھوٹ گڑھ رہے ہیں درآنحالیکہ خوب جان رہے ہیں۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ یہود کی ادائے امانت میں حیلہ سازی اور تجارت میں بدمعاملگی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''وہ ادائے امانت میں برابر حیلہ وحوالہ کرتا رہے گا اوراس سے تقاضا برابر جاری رکھنا پڑے گا'' قیام'' کے لفظی معنی مراد نہیں کہ واقعتاً کھڑا ہی رہنا پڑے اور چلنے یا بیٹھنے یا لیٹنے کی نوبت نہ آئے، یہود، غیر یہود یا (Gentiles) کے ساتھ کاروباری تعلق کے سلسلہ میں بدمعاملگی کے لئے برابر بدنام رہے ہیں، قومی مفاخرت اور نسلی نخوت کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا ہے، گوروں کا برتاؤ کالوں کے ساتھ آج دنیا کے ہر علاقہ میں کیا ہے؟''۔ [۱۳۰]

یہودی اپنی قوم کا تو کچھ پاس ولحاظ کرتے تھے مگر غیر یہودی کے ساتھ معاملات میں کسی بھی ضابطۂ اخلاق کے پابند نہ تھے، ان کے نزدیک غیر یہودی کے مال کو ہڑپ کر جانا اور ان کی امانتوں میں خیانت کرنا اوران کے اموال میں دستبرد کرنا کارِثواب سمجھا جاتا تھا۔ یہود کی دینی ودنیوی خیانتوں کا ذکر قرآن کریم میں جابجا مذکورہ ہے جیسے ان کا اخفاءِ احکام توریت، اوران احکامِ تورات کی جھوٹی اور من گھڑت شہادتیں پیش کرنا وغیرہ۔

## یہود کی سودخوری:

یہود میں سودخوری کا بھی عام رواج پڑ گیا تھا:

قرآن کریم نے یہود کی اخلاقی پستی اور غضب الٰہی کے مورد ہونے کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ:

وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ ۱۳۱

[اور اس وجہ سے کہ وہ سود لیتے ہیں حالانکہ اس سے ان کو روکا گیا ہے۔]

قرآن کریم نے اس بات کی صاف صراحت کردی ہے کہ کتاب توریت میں ممانعت سود کے باوجود یہ قوم سودخوری کی لعنت میں گرفتار ہوگئی تھی، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس کی توثیق توراۃ کے حوالے سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

توریت میں ممانعت سود کے اس طرح کے احکام آج تک لکھے چلے آرہے ہیں:

اگر تو میرے لوگوں میں سے جس کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دیوے، تو اس سے بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر و اور سود مت لے۔(خروج ۲۲:۲۵)

تو اس سے سود اور نفع مت لے، اپنے خدا سے ڈرتا کہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگی بسر کرے تو اسے سود پر روپیہ قرض مت دے، اور اسے نفع کے لئے کھانا کھلا۔(احبار ۳۵:۳۶،۳۷)

''یہ اور بات ہے کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ سودخور قوم یہی یہود ہو، اور ان کے ''شایلاک'' دنیا کے ادبیات میں ضرب المثل بن گئے ہوں''۔۱۳۲

## یہود کی رشوت خوری:

یہود میں رشوت خوری بھی پھیل گئی تھی اور اس زور وشور سے رواج پڑ گیا تھا کہ قرآن مجید کو کہنا پڑا:

أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ ۱۳۳

[حرام کے بڑے کھانے والے ہیں۔]

دوسری جگہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَتَرَى كَثِيراً مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ ۱۳۴

[اور تم ان (اہل کتاب) میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ گناہ، زیادتی اور رشوت کھانے میں گرم رو ہیں۔]

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

أَكَّالُونَ لِلسُّحُت ۔سحت۔ ہر حرام خوری کے لئے عام ہے، یہاں مراد رشوت ہے اور یہی معنی اب اس کے خاص ہو گئے ہیں۔

''یہود کے خواص و اکابر رشوت اور نذرانے لے لے کر غلط سلط احکام بتانے اور مسائل کو مسخ کر ڈالنے کے عادی ہو گئے تھے، خود ان کی کتاب آسمانی میں ان کو عدل پر قائم رہنے اور رشوت نہ لینے کے باب میں یہ حکم ملا تھا کہ:

اپنے سارے فرقوں میں قاضی اور حکم مقرر کیجیو، وہ انصاف سے لوگوں کی عدالت کریں، تو عدالت میں مقدمہ نہ بگاڑیو، تو طرفداری نہ کیجیو، اور نہ رشوت لیجیو کہ رشوت دانشمند کی آنکھ کو اندھا کر دیتی ہے، اور صادق کی باتوں کو پھیرتی ہے۔(استثناء:۱۶:۱۸،۱۹)

لیکن انہی کے بزرگوں نے تالمود میں احکام یہ جاری کر دئے تھے کہ جب کسی مقدمہ میں ایک فریق اسرائیلی ہو اور دوسرا غیر اسرائیلی، تو اگر اسرائیلی کے موافق فیصلہ یہودی شریعت کے مطابق ہو سکتا ہے تو وہی کر دو، اور کہہ دو کہ یہی ہمارا قانون ہے، اور اس کے موافق فیصلہ غیر اسرائیلی قانون کے مطابق ہو سکتا ہو تو یہی کر دو، اور غیر اسرائیلی سے کہہ دو کہ تمہارے ہاں کا ضابطہ یہی ہے، اور اگر ایسا فیصلہ دونوں ضابطوں میں سے کسی ضابطہ سے بھی نہ ہو رہا ہو تو کسی حیلہ سے کام لو''۔[۱۳۵]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخلاقی بیماری ان کے اندر وبا کی طرح پھیل گئی تھی اور ان کی سرشت میں سرایت کر گئی تھی۔اس بارے میں ان کے علماء و مشائخ تو اور بھی آگے تھے، وہ مال و زر کے اتنے حریص تھے کہ رشوتیں لے کر خدا کے احکام و قوانین تک کو مسخ کر کے فروخت کر دیتے اور عوام کو حسب خواہش احکام بتاتے تھے۔حالانکہ اس سلسلہ میں ان کی شریعت میں اتنی سخت ہدایات تھیں کہ رشوت و خیانت تو الگ رہی ہدیہ و تحفہ تک لینے کی ممانعت تھی۔

**ازاغت قلوب:**

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم مجھے جانتے بھی ہو اور تم معجزات بھی دیکھ چکے ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ اللہ نے مجھے تمہارے درمیان پیغمبر بنا کر بھیجا ہے پھر تم مجھے کیوں تکلیفیں پہنچاتے ہو مگر ان کی قوم سرکشی، عصیان و طغیان میں آگے بڑھتی چلی گئی آخر کار اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا اور راہِ راست سے محروم کر دیا اور انہیں ہر بات الٹی نظر آنے لگی۔

فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ[۱۳۶]

[پھر جب ان لوگوں نے کجی اختیار کی تو اللہ نے ان کو کج کر دیا اور اللہ (ایسے ) نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔]

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''جو دانستہ غلط راہ پر چلنے پر مصر ہیں، اور اپنے قصدِ صحیح سے کام لے کر راہِ حق میں غور و تامل نہیں کرتے ، انہیں حق تعالیٰ ہدایت کی توفیق بھی نہیں دیتا کہ ایسے ضدی کج رووں کو ہدایت بخشنے کے معنی تو انہیں ہدایت پر مجبور کر دینے کے ہوئے ، اور یہ نظامِ تکوینی کی حکمتوں ہی کے سرے سے منافی ہے۔ یہاں سے اور قرآن مجید کی اور بھی دوسری آیات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جب ضد اور عناد کسی قوم میں اس قدر راسخ ہو جائے اور اس کی اصلاح کی امید باقی نہ رہ جائے تو پھر دفع مضرت کے لئے آخری تدبیر قتال کی ہے''۔[۱۳۷]

## طبع قلوب:

یہود کی سرکشی وطغیان اور کج روی کی بنا پر ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، قرآن کریم صراحت سے کہتا ہے کہ:

فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِم بَآيَاتِ اللّهِ وَقَتْلِهِمُ الأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقًّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلاَ يُؤْمِنُونَ إِلاَّ قَلِيلاً[۱۳۸]

[سو ہم نے بہ سبب ان کی عہد شکنی کے اور بہ سبب نشانات الٰہی سے ان کے کفر کے، اور بہ سبب ان کے قتل ناحق انبیاء کے، اور بہ سبب ان کے اس قول کے کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں (ہم نے انہیں سزا میں مبتلا کیا) نہیں، بلکہ (ہے یہ کہ ) اللہ نے ان پر مہر لگا دی، بہ سبب ان کے کفر کے سو وہ ایمان نہیں لاتے مگر (بہت ) تھوڑا سا۔]

## یہود کی قساوت قلبی:

قساوت قلبی سے مراد دلوں کا سخت ہو جانا ہے، یہود کی اخلاقی بیماریوں سے ایک بیماری یہ بھی تھی کہ ان کے دل سخت ہو گئے تھے جس طرح پتھروں کی سختی مشہور ہے بلکہ یہ لوگ پتھروں سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں کیوں کہ بعض پتھر ایسے بھی ہیں جن سے چشمے جاری ہوتے ہیں اور نہریں بہتی ہیں اور پہاڑ بھی خدا کے خوف وہیبت سے چور چور ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ خود بنی اسرائیل مقام صحرائے سینا میں ایک چٹان سے بارہ چشمے

پھوٹتے ہوئے اور تجلی ربانی سے کوہِ طور کا پاش پاش ہونا اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے قلوب پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے تھے، نیکی اور تقویٰ کی طرف کبھی مائل نہیں ہوئے بلکہ حق و ہدایت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی تھی ہمیشہ انہوں نے سنگ دلی کا مظاہرہ کیا۔

قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ثُمَّ قَسَتُ قُلُوبُكُم مِّن بَعُدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالُحِجَارَةِ أَوُ أَشَدُّ قَسُوَةً وَإِنَّ مِنَ الُحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنُهُ الأَنُهَارُ وَإِنَّ مِنُهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخُرُجُ مِنُهُ الُمَاء وَإِنَّ مِنُهَا لَمَا يَهُبِطُ مِنُ خَشُيَةِ اللّهِ وَمَا اللّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعُمَلُون ١٣٩

[اس پر بھی تمہارے دل اور اس کے بعد بھی سخت ہی رہے چنانچہ وہ مثل پتھر کے ہیں بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ کر اور پتھر تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس سے ندیاں بھی پھوٹ نکلتی ہیں اور کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کی ہیبت سے نیچے آ گرتا ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ خود یہود کے مذہبی صحیفوں سے ان کی قساوت قلبی نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اسرائیلی صحیفوں میں یہ مضمون بار بار آیا ہے، مثلاً:

''وہ تربیت پذیر نہ ہوئے، انہوں نے اپنے چہرے کو چٹان سے سخت تر بنایا، انہوں نے پھرنے سے انکار کیا ہے''۔ (یرمیاہ۔۵:۳)

''سارے اہل اسرائیل بے حیائی کی پیشانی رکھتے اور سنگدل ہیں''۔ (حزقلیل۔۱۳:۷)۔

یہود کی قساوت قلب کا ذکر انجیل میں بھی بار بار آیا ہے:

''اس نے اس کی سخت دلی کے سبب غمگین ہو کر اور چاروں طرف ان پر غصہ سے نظر کر کے اس آدمی سے کہا''۔ (مرقس ۳:۵)

''ان کی بے اعتقادی اور سخت دلی پر ملامت کی''۔ (مرقس ۱۶:۱۴)

''تو اپنی سختی اور غیر تائب دل کے مطابق اس قہر کے دن کے لئے اپنے واسطہ غضب کما رہا ہے''۔ (رومیون۔۳:۵) ١٤٠

### ہدایت الٰہی سے محرومی اور لعنت خداوندی:

عہدِ رسالت میں عرب کے یہودی علماء نے اپنی بدبختی سے ایمان و ہدایت پر ضلالت کو ترجیح دی اور

ان کو کتب سابقہ سے معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ ہی وہ نبی برحق ہیں جن کی بعثت ہمارے مذہبی صحیفوں اور شریعت موسوی کے مجدد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارتوں کے عین مطابق ہوئی ہے اور جو تعلیمات آپؐ لائے ہیں یہ وہی تعلیمات ہیں جو گذشتہ انبیاء کرام علیہم السلام لاتے رہے ہیں اس کے باوجود انہوں نے محض تعصب، ضد اور حسد کی بنیاد پر آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا اور آپؐ کے خلاف الزام تراشیوں اور مخالفتوں کا بیڑا اٹھالیا، اس لئے وہ اس کے مستحق تھے کہ ان کو ہدایت الٰہی سے محروم کر دیا جائے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْماً كَفَرُواْ بَعْدَ إِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُواْ أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظَّالِمِيْنَ ۱۴۱

[اللہ کیسے ایسے لوگوں کو ہدایت دے گا جنہوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر (اختیار) کر لیا اور (بعد اس کے کہ) شہادت دے چکے تھے کہ رسول برحق ہیں اور (بعد اس کے کہ) ان کے پاس نشانیاں آچکی تھیں اور اللہ (ایسے) ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔]

چنانچہ جب یہود رسول اکرم ﷺ کی رسالت پر ایمان نہیں لائے تو ذلت وخواری ان کی زندگی کا حصہ بن گئی تو ان پر اللہ کی لعنت کی گئی۔ لعنت اللہ کی رحمت سے دوری کا نام ہے، کسی قوم پر اللہ کی لعنت اس عذاب سے بھی زیادہ سخت ہے، جو اسے فنا اور تباہ و برباد کرے۔ لعنت کے بعد وہ قوم زندہ تو رہ سکتی ہے مگر اس کی زندگی صرف ذلت وخواری کا نمونۂ عبرت بن جاتی ہے۔

ارشادِ ربّانی ہے:

بَل لَّعَنَهُمُ اللَّه بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلاً مَّا يُؤْمِنُونَ ۱۴۲

[بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کر رکھی ہے، ان کے کفر کے باعث اور وہ ایمان بہت ہی تھوڑا رکھتے ہیں۔]

لعنت کا محاورہ توریت میں بہت عام ہے، صرف ایک مقام کا اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

یہ ساری لعنتیں تجھ پر اتریں گی، اور تجھ تک پہنچیں گی، تو شہر میں لعنتی ہوگا۔ تو کھیت میں بھی لعنتی ہوگا۔ تیرا ٹوکرا اور تیرا ٹوکرا اور تیرا کٹھرا لعنتی ہوگا۔ تیرے بدن کا پھل اور تیری زمین کا پھل، تیری گائے بیل کی بڑھتی، اور تیرے بھیڑ بکری کے گلے لعنتی ہو جائیں گے۔

تو بھیتر آنے کے وقت لعنتی ہوگا اور تو باہر جانے کے وقت لعنتی ہوگا۔ خداوند ان سارے کاموں میں

جن میں تو کرنے کے لئے ہاتھ لگا دے تجھ پر لعنت اور حیرت اور ملامت نازل کرے گا۔ (استثناء۔ ۲۸: ۱۵۔ ۲۰)

لعنت انجیل میں بھی منقول ہے، حضرت مسیح کی زبان سے:

نہ صرف کاہنوں اور فریسیوں کے لئے، بلکہ انجیر کے خشک درخت کے لئے بھی۔[۱۴۳]

## حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰ کی زبان سے بنی اسرائیل پر لعنت:

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِيٓ إِسۡرَآءِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُۥدَ وَعِيسَى ٱبۡنِ مَرۡيَمَ [۱۴۴]

[بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر اختیار کیا، ان پر لعنت ہوئی داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ان لعنتوں کا ذکر عہد نامۂ قدیم و جدید کے حوالہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ان دونوں لعنتوں کا ذکر عہد عتیق کے صحیفہ زبور اور عہد جدید کے صحیفہ متی میں علی الترتیب موجود ہے، چنانچہ حضرت داؤد کی زبان سے''۔

خداوند نے سنا اور نہایت غصہ ہوا، اس لئے (قوم) یعقوب میں ایک آگ بھڑ کائی گئی، اور اسرائیل پر قہر بھی اٹھا، کیونکہ انہوں نے خدا پر اعتماد نہ کیا، اور اس کی قیامت پر اعتماد نہ رکھا۔ (زبور ۷۸: ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳)

اور حضرت مسیح کی زبان سے:

غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو، اے سانپو، اے افعیٰ کے بچو، تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے (متیٰ۔ ۲۳: ۳۱۔ ۳۲)

اسرائیلیوں کا یہ کفر اپنے اپنے پیغمبروں کے مقابلہ میں تھا، چنانچہ داؤد کے زمانہ میں قانون سبت کو توڑا، اور حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں تو خود ان کی نبوت ہی کا شدت سے انکار کر دیا۔[۱۴۵]

## نجات توراث کا عقیدہ:

تِلۡكَ أُمَّةٞ قَدۡ خَلَتۡ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُم مَّا كَسَبۡتُمۡ وَلَا تُسۡـَٔلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعۡمَلُونَ [۱۴۶]

[یہ ایک جماعت ہے جو گزر چکی، اُن کے آگے اُن کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارے آگے تمہارا کیا ہوا اور وہ جو کچھ کرتے رہے اس کی پوچھ تم سے نہ ہوگی۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے اس احمقانہ عقیدہ کی وضاحت ان ہی کی انسائیکلوپیڈیاز کے حوالے سے لکھتے

ہیں کہ:

''یہود اہل توحید اس سفاہت میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ذاتی عمل کی ضرورت کیا ہے۔ مقبولان الٰہی کی جانب انتساب نسلی، اور بزرگوں کی طرف نسبت نسبی بالکل کافی ہے۔ مسیحیوں کا گھڑا ہوا مسئلہ ''معصیت متوراث'' سب کو معلوم ہے، یعنی جو معصیت ابوالبشر (حضرت آدمؑ) سے سرزد ہو گئی تھی، وہ ہر نسل آدم میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے، یہود نے اس کے مقابلہ ایک عقیدہ ''نجات توارث'' کا وضع کر لیا تھا، اور یہ سمجھ لیا تھا کہ:

''خدائے تعالیٰ اپنے اسم پاک کے طفیل میں اور بطور اپنے افضال کے باپ کے حسنات، اولاد کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے''۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۱۲، ص ۴۴۷)

توریت مروجہ میں ایک آیت اس مضمون کی ملتی ہے: میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں، جو باپ دادوں کی بدکاری کا بدلہ، ان کی اولاد سے تیسری اور چوتھی پشت تک جو میرا کینہ رکھنے والے ہیں، لیتا ہوں۔ (استثناء: ۵۔۹)

بسن تنکے کی اوٹ پہاڑ، یہ کھڑا کر لیا گیا کہ ہر نسل کو انتقال ثواب اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی، یعنی اسلاف و اخلاف دونوں کی طرف سے ہوتا رہے گا، اور پھر اولاد ابراہیم کو تو کوئی ڈر ہی نہیں۔

بعض کو ثواب اپنے اسلاف کے اعمال کا ملے گا اور بعض کو اپنے اخلاف کے اعمال کا (جیوش انسائیکلو پیڈیا، جلد۔۶، ص ۶۰)

افراد یہود کی امید سب اسلاف کے تقدس پر قائم ہو گئیں تھیں۔ (یعنی اس پر کہ) ہم ابراہیم کی اولاد ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۳ طبع یازدہم، ص ۱۸۴)۔ ۱۴۷ھ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو تمام اقوام عالم پر دینی فضیلت بخشی تھی، چنانچہ وہ اس کو خدا کا فضل و انعام سمجھنے کے بجائے اپنی ذاتی محنت و کوشش کا ثمرہ سمجھتے تھے، اور اسی غرور و گھمنڈ کے نشہ میں مست رہتے تھے، اور اپنے علاوہ تمام دنیا والوں کو حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔ یہود کی تمام اعتقادی و عملی گمراہیوں کا اصل سبب یہی تھا کہ وہ ایک معزز اور برگزیدہ خاندان کے لوگ ہیں، انبیاء کی اولاد اور خدا کے لاڈلے اور چہیتے ہیں، اس لئے ان کے لئے ہر چیز جائز ہے۔ قرآن کریم نے ان کی اسی اعتقادی و عملی گمراہی کا سدّ باب کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاء اللّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ۱۴۸؎

[اور یہود ونصاریٰ نے کہا کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔]

## یہودیوں کا عقیدہ کہ موت گناہ کا نتیجہ ہوتی ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۱۴۹؎

[ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے، اور تم کو تمہاری پوری مزدوری تو بس قیامت ہی کے دن ملے گی۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ موت کے متعلق اسلام کی تعلیم اور عقیدۂ یہود کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''گویا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ موت ایک طبعی تتمّہ اور تکملہ ہے حیات ناسوتی کا، اسے نکوکاری اور بدکاری سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ انسان کے لئے بہ طور سزا کے مقرر ہوئی ہے، اس میں مسیحیوں اور یہودیوں کا رد آ گیا جن کے عقیدہ میں موت نام ہے گناہ کی سزا یا نتیجہ کا، انجیل کے صحیفوں میں ہے: ''جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دنیا میں آیا اور گناہ کے سبب سے موت ہوئی اور موت سب آدمیوں میں پھیل گئی''۔ (رومیون ۵:۱۲)

''گناہ کی مزدور موت ہے''۔ (رومیون ۶۰:۱۳) ''خواہش حاملہ ہو کر گناہ کو جنتی ہے اور گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے''۔ (یعقوب ۷:۱۵)

یہود کا عقیدہ ہے کہ موت نتیجہ ہوتی ہے شخصی گناہ کا اُن کی معتبر و مستند جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۴، ص ۴۸۳ میں اُن کی رِبّیون کے حوالہ سے درج ہے۔ ۱۵۰؎

## یہودیوں کا خیال کہ نجات اخروی ان کا مخصوص حق ہے:

دنیا پرست یہودی جہاں ایک طرف اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور محبوب سمجھتے تھے تو وہیں دوسری طرف اخروی زندگی اور وہاں کے فضل و انعام کے خود کو تنہا مستحق سمجھتے تھے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ اسی زعم باطل میں مبتلا ہو کر وہ فکر آخرت اور جزا و سزا سے باطل غافل ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے یہ باطل عقیدہ ایجاد کر لیا تھا کہ اخروی زندگی ہمارے لئے مخصوص ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جنت کا لائسنس دے رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الآخِرَةُ عِندَ اللّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُاْ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ٥ وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَداً بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمينَ ۱۵۱؎

وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُوداً أَوْ نَصَارَى ۱۵۲؎

''آپ کہہ دیجئے کہ اگر عالم آخرت خاص تمہارے ہی لئے ہے دوسروں کے لئے نہیں تو موت کی آرزو کر دیکھو، اگر تم سچے ہو، لیکن وہ اس کی آرزو ہرگز کبھی بھی نہ کریں گے، بہ سبب ان اعمال کے جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں، اور جنت میں کوئی نہ داخل ہوگا مگر ہاں وہی جو یہودی یا نصرانی ہوں''۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''بنی اسرائیل کے اس بنیادی عقیدہ کا خاکہ تو خود موجودہ توریت میں موجود ہے، مثلاً:

''تو خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو''۔(استثناء۔۱۴:۱)

تو خداوند اپنے خدا کے لئے مقدس قوم ہے، اور خداوند نے تجھ کو چن لیا تاکہ سب قوموں کی بہ نسبت جو زمین پر ہیں تو اس کے لئے خاص قوم ہو۔(استثناء۔۱۴:۲)

''رفتہ رفتہ یہ عقیدہ ترقی کر کے اس درجہ تک پہنچ گیا کہ یہود اپنے سوا کسی اور کو الطاف خداوندی کا مستحق ہی نہیں سمجھتے تھے، نجات اخروی کو اپنا مخصوص حق سمجھنے لگے تھے، اپنے کو خدا کا محبوب اور خدا کا لاڈلا اور چہیتا فرزند قرار دینے لگے تھے، اور خیال یہ جمالیا تھا کہ خداوند خدا کا جو معاملہ ہماری قوم و نسل کے ساتھ ایک ناقابل تبدیل طور پر ہے وہ دنیا جہاں میں کسی اور کے ساتھ نہیں، نسلی تقدیس کی یہی وبا ہے جو ہندوستان میں برہمنیت کے نام سے جلوہ گر ہے''۔۱۵۳؎

یہود کا یہ عقیدہ شروع سے چلا آرہا ہے کہ نجات انہیں کی قوم اور وابستگان کے ساتھ مخصوص ہے، چنانچہ انجیل میں بھی ان کا یہ مقولہ نقل ہوا ہے کہ:

''نجات یہود میں ہے''۔(یوحنا۴:۲۲)

ظہور اسلام کے وقت یہود و نصاریٰ کا کہنا یہ تھا کہ اس نئے دین کے قبول کرنے کی ضرورت کیا، نجات تو ہمارے دینوں کے ساتھ وابستہ ہے۔۱۵۴؎

## یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ان پر دوزخ کی آگ حرام ہے:

یہودیوں کا نجات اخروی کے معاملہ میں سارا اعتماد اعمال کے بجائے بزرگوں کی نسبت و شفاعت پر تھا ان کا خیال تھا کہ ان کو عذاب آخرت سرے سے لاحق ہی نہیں ہوسکتا اور اگر لاحق بھی ہوا تو بجز اُس قلیل مدت کے جو ہمارے اسلاف نے گئو سالہ پرستی کے شریک میں زندگی گزاری تھی۔

اللہ کا ارشاد ہے:

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُواْ لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلاَّ أَيَّاماً مَّعْدُودَاتٍ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُواْ يَفْتَرُونَ ۱۵۵

[یہ اس سبب سے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو آگ چھوئے گی بھی نہیں بجز (چند) گنے ہوئے دنوں کے اور جو کچھ یہ تراشتے رہتے ہیں اس نے انہیں ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ان کے اس باطل عقیدہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''یہود کے پیشواؤں اور سرداروں نے اس طرح قسم قسم کے عقائد کا ایک طوفان گڑھ رکھا تھا، اور انہیں میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ یہودی پر آتش دوزخ (برائے نام مدت کے علاوہ) حرام ہے، ان کے لئے ان کے بزرگوں کی نسبت وشفاعت کافی ہے، اور ان کی نجات ومغفرت بلا ایمان صحیح وعمل صحیح خود بخود محض نسلاً اسرائیل ہونے کی بناء پر ہو جائے گی''۔۱۵۶

## عقیدۂ تشبیہ وتجسیم:

ارشادِ ربانی ہے:

هَلْ يَنظُرُونَ إِلاَّ أَن يَأْتِيَهُمُ اللّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ ۱۵۷

[(یہ لوگ) تو بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس خدا بادل کے سائبانوں میں آجائے۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ یہود کے عقیدۂ تشبیہ وتجسیم کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

''یہود کا مذہب تشبیہ وتجسیم کا تھا، یہ لوگ خدا کی جسمانیت کے پوری طرح قائل تھے، اور جلوۂ حق کو بادلوں سے خاص طور پہ متعلق سمجھتے تھے، بلکہ بادلوں کو گویا حق تعالیٰ کی سواری سمجھے ہوئے تھے، ان کے مقدس صحیفوں اور نوشتوں میں اب تک اس قسم کی تعلیمات محفوظ ہیں''۔

''وہ نور کو پوشاک کی مانند پہنتا ہے، اور آسمانوں کو پردہ کی مانند پھیلاتا اپنے بالا خانوں کو پانیوں میں بناتا ہے، اور بدلیوں کو اپنی رتھ ٹھہراتا ہے، بازوؤں پر سیر کرتا ہے''۔(زبور۔۱۰۴:۳)

غرض خدائے تعالیٰ کا بادلوں سے بطور مرکب یا سواری کے قریب ترین تعلق یہود کے تخیّل میں رچ گیا تھا، یہاں تک کہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے آخری مکمل ایڈیشن (طبع چہاردہم) میں حق تعالیٰ کی جو تصویر نیم یہودی نیم مسیحی تخیل کی مطابق دی ہے جلد۲۔ص۱۰۲ اس میں (معاذ اللہ) حق تعالیٰ کو صاف صاف بدلیوں پر سوار دکھایا ہے!

''تو قرآن مجید نے آیت میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی ہے صرف یہود کے خیال کی ترجمانی، اس کی صحت وغلطی سے بحث کئے بغیر کردی ہے کہ یہ بنی اسرائیل اسی خیال میں پڑے ہوئے ہیں کہ خداوند خدا مع فرشتوں کے بدلیوں پر سوار ہو کر ان کے سامنے آجائے گا''۔۱۵۸

# مراجع ومصادر


۱۔ احمد بن فارس، ابوالحسینؒ "معجم مقاییس اللغۃ"، مطبعہ عیسیٰ البابی الحلبی القاہرہ، وشرکاۃ مصر، ۱۳۸۹ھ، جلد ۱۸ص: ۶

۲۔ الاعراف: ۱۵۶

۳۔ جمال الدین محمد بن مکرم، ابن منظور الانصاریؒ، لسان العرب، ابرار المصر للتالیف والترجمۃ، بدون تاریخ، جلد ۳، ص: ۴۵۱

۴۔ البقرۃ: ۵۴

۵۔ البقرۃ: ۶۲

۶۔ مسلم بن الحجاج القشیری، ابوالحسین، الامام، صحیح مسلم، کتاب القدر، باب معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ وحکم موتی اطفال الکفار واطفال المسلمین، کتب خانہ رشیدیہ دہلی، بدون تاریخ، ج ۲، ص: ۳۳۶

۷۔ راغب اصفہانیؒ، امام، مفردات فی غریب القرآن، الناشر نور محمد اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب اردو بازار کراچی، بدون تاریخ، ص: ۵۴۶

۸۔ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، باراول ۲۰۰۳ء، جلد: ۸، ص: ۴۷۴

۹۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مطبع شعبۂ اردو، دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور باراول ستمبر ۱۹۸۹ء جلد ۲۳، ص: ۳۵۵

10- International Encyclopediya of the social science, Vol: 7/272

11- The Encyclopediya Americal International Edition, 16/194

۱۲۔ ابن کثیر، عمادالدینؒ، حافظ "تفسیر القرآن العظیم"، دارالمعرفۃ، بیروت۔ لبنان ۱۹۸۶ء، جلد اول، ص: ۱۰۷

۱۳۔ امین احسن اصلاحیؒ مولانا "تدبر قرآن"، تاج کمپنی، ترکمان گیٹ دیلی، بدون تاریخ، جلد اول، ص: ۲۲۷

۱۴۔ عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا "تفسیر ماجدی"، مطبع مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۲۰۱۴ء جلد اول، ص: ۱۵

۱۵۔ عبداللہ احمد مسدوسی، "مذاہب عالم کا ایک معاشرتی وسیاسی جائزہ"، مکتبہ خدام ملت کراچی، پاکستان، ۱۹۵۸ء، ص: ۳۷۸

۱۶۔ رابرٹ وین ڈیئر یہودیت، مترجم، ملک اشفاق، بک ہوم لاہور ۲۰۰۴ء، ص: ۱۱

۱۷ ابوالاعلیٰ مودودیؒ، سید، یہودیت ونصرانیت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز دہلی، بدون تاریخ، ص:۱۹

۱۸ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲۳، ص:۲۵۵

۱۹ ابوالاعلیٰ، مودودیؒ، سید، یہودیت قرآن کی روشنی میں، ص:۲۳

۲۰ عبدالکریم پاریکھ، قوم یہود اور ہم قرآن کی روشنی میں، مکتبہ الحسنات رام پور (یوپی) باردوم ۱۹۷۵ء، ص:۳۳

۲۱ یہودیت قرآن کی روشنی میں، ص ۲۳

۲۲ محمد، شریف ہزاروی، اسرائیل کیوں تسلیم کیا جائے، اشتیاق اے مشتاق پرنٹنگ پریس لاہور، ۲۰۰۴ء ص:۱۴-۱۵

۲۳ ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا، یو، ایس، اے، جلد ۲، ص:۱۴۶

۲۴ ''مذاہب عالم کا ایک معاشرتی وسیاسی جائزہ'' ص:۳۸۸

۲۵ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۲۱، ص:۷۹۵

۲۶ حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا محمد، قصص القرآن، ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی، ۱۹۸۷ء، جلد اول ص:۵۳۷

۲۷ عبدالرحمٰن ابن خلدون، علامہ ولی الدین ابوزید، تاریخ ابن خلدون، مترجم حکیم احمد حسین الہ آبادی ۱۴۴ انفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۸۶ء، جلد اول، ص:۱۳۵

۲۸ احمد دیداتؒ، شیخ، یہودیت، عیسائیت اور اسلام، مترجم مصباحی اکرم اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء ص:۸۱،

۲۹ ایضاً، ص:۸۱تا۸۳

۳۰ ایس، ایم ناز، مسلم شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا، ص:۸۵

۳۱ یوسف خاں، پروفیسر محمد، تقابل ادیان، بیت العلوم، بدون تاریخ، ص:۱۷۷تا۱۸۱

۳۲ اٰل عمران:۶۴

۳۳ الحج:۱۷

۳۴ عبداللہ، ڈاکٹر سید، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ، ص:۴۷

۳۵ تفسیر ماجدی افتتاحیہ، ص ۳۲

۳۶ مظفر حسین، غزالی، لاہور ''مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اردو اور انگریزی کی تفسیری خدمات'' تحقیقات اسلامی: ۱۰، شمارہ ۲، ۱۹۹۹ء

۳۷ محمد طیبؒ، حکیم الاسلام، تفسیر ماجدی: ''عزت افزائی'' صدق جدید لکھنؤ، جلد نمبر ۲۳، شمارہ نمبر ۶۔ مورخہ ۵/

جنوری، ۱۹۷۳ء

۳۸ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص ۲۵۴
۳۹ ایضاً، ص ۲۵۴
۴۰ الانعام: ۷۴
۴۱ تفسیر ماجدی، جلد دوم، ص: ۲۱۳/ جلد اول: ص ۲۵۴
۴۲ تفسیر ماجدی جلد اول، ۲۵۴
۴۳ ایضاً، ص ۲۵۴
۴۴ الانعام: ۷۸۔۷۹
۴۵ تفسیر ماجدی جلد دوم، ص: ۲۱۶
۴۶ الانعام: ۸۰
۴۷ تفسیر ماجدی، جلد دوم، ص: ۲۱۷
۴۸ البقرۃ: ۲۵۸
۴۹ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص: ۴۹۶ تا ۴۹۷
۵۰ البقرۃ: ۲۵۸
۵۱ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص: ۴۹۸
۵۲ ایضاً، ص: ۴۹۸ تا ۴۹۹
۵۳ الانبیاء: ۵۷
۵۴ الانبیاء: ۵۸
۵۵ تفسیر ماجدی، جلد چہارم، ص: ۳۰۹
۵۶ الانبیاء: ۵۹
۵۷ ایضاً، ۳۱۰
۵۸ تفسیر ماجدی، جلد چہارم، ص: ۳۱۱
۵۹ ایضاً، ص: ۳۱۱

۶۰ الانبیاء:۶۹

۶۱ تفسیر ماجدی، جلد چہارم، ص:۳۱۲

۶۲ الصفّٰت:۱۰۰

۶۳ تفسیر ماجدی جلد ششم، ص:۳۳

۶۴ ایضاً، ص:۳۴

۶۵ المریم:۴۹

۶۶ تفسیر ماجدی، جلد چہارم، ص:۱۹۸

۶۷ البقرۃ:۱۲۴

۶۸ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۲۵۶

۶۹ ایضاً، ص:۲۷۱

۷۰ البقرۃ:۱۳۲

۷۱ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۲۷۳

۷۲ ایضاً، ص:۲۶۰ تا۲۶۱

۷۳ ایضاً، ص:۲۶۵

۷۴ ایضاً، ص:۲۶۵

۷۵ البقرۃ:۱۲۸

۷۶ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۲۶۶

۷۷ ایضاً، ۲۷۶

۷۸ ایضاً، جلداول، ص:۲۷۳

۷۹ ایضاً، ص:۲۵۴

۸۰ البقرۃ:۴۰

۸۱ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۱۳۲

۸۲ البقرۃ:۴۷

۸۳ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص: ۱۳۹۔۱۴۰
۸۴ القصص: ۴
۸۵ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص: ۱۴۲ تا ۱۴۳
۸۶ ایضاً، ۱۴۲۔۱۴۳
۸۷ طٰہٰ: ۳۸۔۳۹
۸۸ تفسیر ماجدی، جلد چہارم، ص: ۲۳۴
۸۹ طٰہٰ: ۴۰
۹۰ تفسیر ماجدی، جلد چہارم، ص: ۲۳۵۔۲۳۶
۹۱ القصص: ۱۵
۹۲ تفسیر ماجدی، جلد پنجم، ص ۱۳۴
۹۳ ایضاً، ص: ۱۴۴
۹۴ القصص: ۲۶
۹۵ تفسیر ماجدی، جلد پنجم، ص: ۱۴۵
۹۶ القصص: ۲۷
۹۷ تفسیر ماجدی، جلد پنجم، ص ۱۴۶۔۱۴۷
۹۸ طٰہٰ: ۱۰
۹۹ تفسیر ماجدی، جلد چہارم، ص ۲۲۵۔۲۲۶
۱۰۰ ایضاً، ص: ۲۲۶
۱۰۱ الدخان: ۲۳۔۲۴
۱۰۲ الشعراء: ۶۱۔۶۲
۱۰۳ تفسیر ماجدی، جلد پنجم، ص: ۲۸
۱۰۴ البقرۃ: ۵۳
۱۰۵ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص: ۱۴۷

۱۰۶۔ آل عمران:۳

۱۰۷۔ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۵۵۲۔۵۵۳

۱۰۸۔ البقرۃ:۶۳

۱۰۹۔ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۱۷۲

۱۱۰۔ البقرۃ:۵۱

۱۱۱۔ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۱۴۶۔۱۴۷

۱۱۲۔ البقرۃ:۵۴

۱۱۳۔ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۱۴۸

۱۱۴۔ البقرۃ:۵۷

۱۱۵۔ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۱۵۳

۱۱۶۔ البقرۃ:۶۰

۱۱۷۔ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۱۶۰

۱۱۸۔ ایضاً، ص:۱۶۰۔۱۶۱

۱۱۹۔ البقرۃ:۵۷

۱۲۰۔ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۱۵۴

۱۲۱۔ ایضاً، ص:۱۵۴

۱۲۲۔ البقرۃ:۹۶

۱۲۳۔ تفسیر ماجدی، جلداول، ص:۲۰۹

۱۲۴۔ الاعراف:۱۶۹

۱۲۵۔ التوبۃ:۳۴

۱۲۶۔ تفسیر ماجدی، جلددوم، ص:۵۰۶

۱۲۷۔ المائدۃ:۴۱

۱۲۸۔ تفسیر ماجدی، جلددوم، ص:۶۷

۱۲۹۔ آل عمران:۷۵

۱۳۰۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص:۶۱۴۔۶۱۵

۱۳۱۔ النساء:۱۶۱

۱۳۲۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص:۸۵۰

۱۳۳۔ المائدۃ:۴۲

۱۳۴۔ المائدۃ:۶۲

۱۳۵۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص:۸۰۷

۱۳۶۔ الصّف:۵

۱۳۷۔ تفسیر ماجدی، جلد ہفتم، ص:۲۱۴

۱۳۸۔ النساء:۱۵۵

۱۳۹۔ البقرۃ:۷۴

۱۴۰۔ تفسیر ماجدی، جلد دوم، ص:۳۸

۱۴۱۔ آل عمران:۸۶

۱۴۲۔ البقرۃ:۸۸

۱۴۳۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص:۱۹۹

۱۴۴۔ المائدۃ:۸۷

۱۴۵۔ تفسیر ماجدی، جلد دوم، ص:۱۱۶

۱۴۶۔ البقرۃ:۱۳۴

۱۴۷۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص:۲۷۶

۱۴۸۔ المائدۃ:۱۸

۱۴۹۔ آل عمران:۱۸۵

۱۵۰۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص:۲۶۸

۱۵۱۔ البقرۃ:۹۴تا۹۵

۱۵۲۔ البقرۃ:۱۱۱
۱۵۳۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص:۲۰۶
۱۵۴۔ ایضاً، ص:۲۳۷
۱۵۵۔ آل عمران:۱۵۲
۱۵۶۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص:۵۷۱
۱۵۷۔ البقرۃ:۲۱۰
۱۵۸۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص:۴۱۲

# باب پنجم

## نصرانیت ''تفسیر ماجدی'' کی روشنی میں

**فصل اول:** نصرانیت: آغاز وارتقاء اور مختصر تاریخی پس منظر،
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت قرآن وانا جیل میں،
اور تعلیمات مسیح علیہ السلام کا ایک علمی جائزہ

**فصل دوم:** مسیحیوں کے بعض ایمانی واخلاق بگاڑ اور عقائد باطلہ

**فصل سوم:** محمد ﷺ کی بشارت انا جیل مروجہ میں

## فصل اول:

## نصرانیت: آغاز وارتقاء اور مختصر تاریخی پس منظر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت قرآن وانا جیل میں، اور تعلیمات مسیح علیہ السلام کا ایک علمی جائزہ:

### عیسائیت یا نصرانیت کے لغوی معنی ومفہوم:

لغوی اعتبار سے نصاریٰ یا نصرانیت "نَصَر یَنْصُر "نصراً" سے مشتق ہے جس کے معنی مددگار کے ہیں۔[1]

لیکن اصطلاحی اعتبار سے نصرانیت نصاریٰ کا دین ہے۔[2]

### عیسائیت کا مفہوم:

Encyclopeadia of Britanica میں عیسائیت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''یہ وہ مذہب ہے جو اپنی اصلیت کو ناصرہ کے باشندے یسوع کی طرف منسوب کرتا ہے اور اسے خدا کا منتخب (مسیح) مانتا ہے''۔[3]

عیسائیت کی اس تعریف میں اجمال ہے الفریڈ گاروے نے اسی تعریف کو مزید پھیلا کر ذرا واضح کر دیا ہے انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتھکس کے مقالے ''عیسائیت'' میں وہ لکھتا ہے:

''عیسائیت کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ اخلاقی، تاریخی، کائناتی، موحدانہ اور کفارے پر ایمان رکھنے والا مذہب ہے جس میں خدا اور انسان کے تعلق کو خداوند یسوع مسیح کی شخصیت کو کردار کے ذریعے پختہ کر دیا گیا ہے''۔[4]

عیسائیت کی اس تعریف کو بیان کر کے مسٹر گاروے نے اس کے ایک ایک جز کی تشریح وتوضیح کی ہے، مسٹر گاروے کے نزدیک ''اخلاقی مذہب'' سے وہ مذہب مراد ہے جس میں عبادتوں کے ذریعے کوئی دنیوی مقصد حاصل کرنے کی تلقین نہ دی گئی ہو بلکہ اس کا تمام تر مقصد کامل روحانیت کا حصول اور خدا کی رضا و خوشنودی ہے۔ ''تاریخی مذہب'' کا مطلب وہ بیان کرتا ہے کہ اس مذہب کا محور فکر وعمل ایک تاریخی شخصیت،

یعنی حضرت عیسیٰ، انہی کے قول وعمل کو اس مذہب میں آخری اتھارٹی حاصل ہے۔

''کائناتی'' ہونے کا اس کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ یہ مذہب کسی خاص رنگ ونسل کے لئے نہیں، بلکہ اس کی دعوت عالمگیر ہے۔عیسائی مذہب کو ''موحد'' وہ اس لئے قرار دیتا ہے کہ اس مذہب میں تین اقنیم تسلیم کئے جانے کے باوجود خدا کو ایک کہا گیا ہے۔وہ لکھتا ہے:

> ''اگرچہ عام طور پر سے عیسائیت کے عقیدۂ تثلیث یا زیادہ صحیح لفظوں میں توحید فی التثلیث کے بارے میں یہ سمجھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ خطرناک حد تک تین خداؤں کے عقیدے کے قریب آ گیا ہے، لیکن عیسائیت اپنی روح کے اعتبار سے موحد ہے، اور خدا کو کلیسائی عقیدت کے طور پر ایک سمجھتی ہے''۔

اس تعریف میں مسٹر گاروے عیسائیت کے عقیدۂ کفارہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''خدا اور بندے کے درمیان جو تعلق ہونا چاہئے اس کے بارے میں عیسائیت کا یہ خیال ہے کہ وہ گناہ کے ذریعے خلل پذیر ہو گیا ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ اسے پھر قائم کیا جائے اور یہ کام صرف مسیح کو بیچ میں ڈالنے سے ہوتا ہے''۔۵

## لفظ نصاریٰ کا انتساب:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لفظ ''نصاریٰ'' کی لغوی اور جغرافیائی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''نصاریٰ جمع ہے نصرانی کی، ملک شام (حال فلسطین) میں ایک قصبہ ہے ناصرہ (Nazareth) علاقہ گلیلی میں بیت المقدس سے ستر میل شمال میں، اور بحر روم سے مشرق میں بیس میل کے فاصلہ پر، حضرت عیسیٰ کا آبائی وطن یہی قصبہ ہے اور آپؑ یسوع ناصری اسی مناسبت سے کہلاتے ہیں، ناصرہ ہی کو عربی تلفظ میں نصران بھی کہتے ہیں۔نصرانی کا انتساب اسی قصبہ کی جانب ہے''۔٦

اکثر انگریز مترجمین قرآن لفظ نصاریٰ کا ترجمہ انگریزی میں Christion سے کر دیا ہے اور اردو میں بھی نصرانی کو مسیحی کا مترادف سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ قرآن کریم ذکر مسیحیوں کا نہیں نصاریٰ کا کر رہا ہے۔قرآن کریم کا ہر لفظ پر حکمت ہے، مسیحی وہ لوگ ہیں جو اناجیل اربعہ پر ایمان رکھتے ہیں، مسیح کو خدا کا نبی نہیں، خدا کا بیٹا مانتے ہیں اور یہ لوگ حقیقت میں عیسیٰ کی اتباع نہیں کرتے اس لئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں انہیں مسیحیین کے نام سے موسوم نہیں کیا گیا۔اصل یہ ہے کہ جس مذہب یا مسلک کا نام مسیحیت چل پڑا ہے وہ مذہب حضرت مسیح کا تو کیا کسی نبی برحق کا بھی نہیں چہ جائیکہ اس کی نسبت حضرت مسیح کی طرف کی

جائے۔موجودہ مسیحیت سرتاپا پولوسیت اور تمام تر پولوس (Paul) طرسوس کی تعلیمات پر مبنی ہے، چنانچہ آج کی شریعت عیسوی اسی کی بگاڑی ہوئی شکل ہے۔

## عیسائیت کی مختصر تاریخ اوراس کا پس منظر:

### عیسائیت کا ظہور وابتداء:

عیسائیت کی جو شکل آج دنیا میں معروف ہے اس کی ابتداء کیسے ہوئی؟ اس کا تفصیلی جواب بڑی حد تک تاریکی میں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عروجِ آسمانی کے بعد آپ کے حواریوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہودی حضرات مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں پر انتہادرجہ کے مظالم اور ظلم وتشدد کے پہاڑ ڈھاتے رہے، وہ یہود کے ظلم وستم کو برداشت کرتے رہے اور ان کے پایۂ استقلال میں ذرہ برابر جنبش نہ آسکی، آپ کے حواری مخالفتوں کے طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمہ تن دین عیسوی کی تبلیغ واشاعت میں مصروف رہے، اور پے بہ پے آنے والی رکاوٹوں کے باوجود انہیں خاصی کامیابی حاصل ہوتی گئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو مشن اور دعوت تھی، اُس دعوت ومشن کو ان حواریوں نے آگے بڑھایا۔لیکن اسی دوران ایک واقعہ پیش آیا جس نے حالات کا رخ ہی موڑ دیا واقعہ یہ تھا کہ ایک مشہور یہودی عالم ساؤل جواب تک دین عیسوی کے متبعین پر ظلم وستم ڈھا رہا تھا، اچانک اس نے عیسائی تعلیمات کو مسخ کرنے کے لئے اپنی جانشینی کی کہانی گھڑی، اور یکا یک یہ ڈرامائی فریب دیا، اس نے دعویٰ کیا کہ دمشق کے راستہ میں مجھ پر ایک نور چمکا اور آسمان سے حضرت مسیحؑ کی آواز سنائی دی کہ:

> ''تو مجھے کیوں ستاتا ہے؟''میں نے جواب دیا کہ اے خداوند تو کون ہے؟ اس نے مجھ سے کہا: میں یسوع ناصری ہوں جسے تو ستاتا ہے اور میرے ساتھیوں نے نور تو دیکھا لیکن جو مجھ سے بولتا تھا اس کی آواز نہ سنی۔ کہ بولنے والے یسوع نے ساؤل سے اس موقعہ پر کہا کہ ''مگر اٹھ شہر میں جا اور جو تجھے کرنا چاہئے وہ تجھ سے کہا جائیگا''۔ے

اس واقعہ سے متاثر ومرعوب ہوکر میرا دل دینِ عیسوی پر مطمئن ہو چکا ہے۔ساؤل نے جب حواریوں کے درمیان پہنچ کر اپنی نبوت کا اعلان کیا تو اکثر حواری اس کی تصدیق وتوثیق کرنے کے لئے تیار نہ تھے، لیکن سب سے پہلے برناباس حواری نے اس کی تصدیق کی اور ان کی تصدیق سے مطمئن ہوکر تمام حواریوں

نے اسے اپنی برادری میں شامل کرلیا، ساؤل نے اپنا نام بدل کر پولس رکھ لیا تھا۔اس واقعے کے بعد وہ حواریوں کے دوش بدوش دین عیسوی کی تبلیغ میں مشغول ہوگیا، یہاں تک کہ اس کی انتھک جدوجہد سے بہت سے وہ لوگ بھی دینِ عیسائیت میں مشغول ہوگئے جو یہودی نہ تھے،ان خدمات کی وجہ سے اس دین کے پیروکاروں میں پولس کا اثر ورسوخ بڑھتا گیا۔اس کے بعد اس نے رفتہ رفتہ شریعت عیسوی میں تحریف شروع کردی، اورعقیدے تک بدل ڈالے، سب سے پہلے مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا، کفارہ اور حلول وتجسّم کے عقائد کی کھل کر تبلیغ شروع کردی۔

## قدیم اور جدید عیسائیت میں فرق:

قدیم عیسائیت اور جدید عیسائیت میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد مذہبی پادریوں وپیشواؤں نے اپنے اپنے مزاج، خواہشات اورضروریات کے مطابق مذہب کے نام پر ہر دور میں عیسائیت کا نیا ایڈیشن تیار کرتے رہے جوکسی بھی معاشرے میں نافذالعمل نہیں ہوسکا۔

موجودہ انجیل توریت سے بھی محرّف تر، اورتحریف درتحریف نے مجموعے کا مزید حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

حقیقت میں انجیل مافوق الفطرف قصے کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ڈاکٹر نادررضا صدیقی انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مقالہ نگار کے حوالہ سے جدید عیسائیت کا بانی ساؤل کو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ان ابتدائی مصنفوں (پولس اور مسیحی پادریوں) نے مسیحیت کو یونانیت کا پروانہ دے کر اسے عالمگیر اشاعت کے قابل بنادیا''۔[۸]

اسی طرح پولس نے اصل مسیحی تعلیمات کو کھوکھلا کرکے جڑ سے اکھاڑ پھینک دیا، اوران تعلیمات میں یونانی فلسفے اورقدیم مذاہب کے مختلف نکتوں کی آمیزش کردی۔اصل میں پولس کی چاہت تھی کہ پیغام مسیحؑ کو ختم اورآپ کے پیروکاروں کو بت پرست قوموں کی طرف راغب کیا جائے، اور یہودیت کی طرح ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈالی جائے۔

ڈاکٹر نادررضا صدیقی ارنسٹ اوھاوسر (Earnest O Houser) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ارنسٹ اوھاوسر نے ''دین عیسوی'' کی اصل تعلیمات کو مسخ کرنے پر ساؤل کو دانشمند قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اگرا تنے دانشمند اوردوراندیش انسان کا ساتھ نہ ہوتا تو عیسائی عقیدہ ایک چھوٹے عبرانی فرقہ میں محدود رہتا''۔۹

گویا اصل تعلیمات کا مسخ کرنا کوئی اہم بات نہیں بلکہ اہم بات یہ ہے کہ اصلی عیسائی تعلیمات پر یونانیت کا رنگ چڑھا کر یسوع مسیح کو عالم گیر نجات دہندہ بنا کر پیش کیا جائے۔

**ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام:**

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کے سلسلہ میں مرقس اور یوحنا (اناجیل میں) کچھ نہیں ملتا جبکہ متی اور لوقا مسیح علیہ السلام کی پیدائش اور عہدِ طفل کے بارے میں متضاد ہیں۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں لکھا ہے کہ:

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن سے لے کر عہد نبوت کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ پیدائش کے بعد سے لے کر نبوت تک آپؑ کہاں رہے یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے قرآن وحدیث اس سلسلہ میں خاموش ہیں''۔۱۰

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخ پیدائش معلوم کرنا نہ ہی اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لانے کا جزو اور اس کا حصہ ہے، البتہ قرآن کریم نے جس چیز کی تصدیق کی ہے وہ ان کی پیدائش کی پاکبازی اور تعلیمات کی صحت ہے۔قرآن کریم عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور آپؑ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کی کیفیات کو بیان کیا ہے جس کا تفصیلی ذکر سورۂ مریم آیات نمبر ۱۶ تا ۳۶ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''مسیحیوں میں ایک قدیم فرقہ ارین (Arians) ہوا ہے، اس کا بانی Arius چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں اسکندریہ کا لاٹ پادری تھا۔اس کی تعلیم یہی تھی کہ مسیحؑ قدیم و غیر مخصوص نہیں، مخلوق وحادث ہیں''۔(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد اول، ص ۵۰۸، طبع چہارم دہم)

اس سے قبل انطیوخ (انطاکیہ) کے بطریق پال سموسطوی (مشہور و معروف پولوس طرسوسی سے اسے خلط نہ کیجئے) کی تعلیم تیسری صدی عیسوی میں یہی تھی کہ عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی پیدائش ایک دوشیزہ کے بطن سے ہوئی تھی، بہ واسطۂ روح القدس، اس لئے وہ بشر محض تھے، روح القدس کے توسّط نے انہیں بھی مقدس بنا دیا تھا، اور اس لئے وہ مسیحؑ تھے لیکن شریک الوہیت بہرحال نہ تھے۔۱۱

مسیحیوں کے صاحبِ فہم طبقہ میں برابر اس طرح کی تحریکیں صحیح عقیدہ کی اٹھتی رہی ہیں، لیکن کلیسا کے عام جمود و تصلّب نے بھی ان اصلاحی تحریکوں کو عام اور سر سبز نہ ہونے دیا۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَى عِندَ اللّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثِمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُون ۱۲؎

[بے شک حضرت عیسیٰ کا حال اللہ کے نزدیک مثل آدم کے حال کے ہے، اللہ نے ان کو مٹی سے بنایا، پھر اُن سے کہا وجود میں آجاؤ چنانچہ وہ وجود میں آ گئے۔]

یہ مثلیث، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آدم علیہما السلام کے درمیان کس حیثیت سے ہے؟ عبد الماجد دریابادیؒ اس مشہور مسیحی شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جب مسیحؑ کی پیدائش ساری دنیا کے عام ضابطہ کے خلاف بغیر باپ کے توسط کے ہوئی، تو انہیں بجائے فوق البشر کے محض پیشتر کیسے تسلیم کیا جائے؛ جواب یہ ہے کہ آدمؑ کو بشر تو تم خود تسلیم کرتے ہو درآنحالیکہ اُن کی پیدائش تو عجیب تر طور پر واقع ہوئی تھی، یعنی ماں اور باپ دونوں میں سے کسی کا بھی توسط نہ تھا مخلوق ہونے اور حادث ہونے کا دار و مدار کسی خاص و متعین طرزِ ظہور وجود پر نہیں، مطلق حدوث پر ہے، اور وہ آفرینشِ عیسیٰ میں پوری طرح موجود تھا''۔۱۳؎

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سلسلۂ بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں، آپ کی ولادت و وفات اور تعلیم و تربیت کے مستند حالات کہیں نہیں ملتے، نہ عہد نامۂ جدید آپ کی پاکیزہ زندگی پر واضح روشنی ڈال سکی، اس صورت حال میں صرف ایک ہی مستند ماخذ ہے جو ہمیں صحیح معلومات فراہم کرتا ہے، وہ قرآن کریم ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت سے لے کر عروج آسمانی تک کے تمام حالات قرآن وحدیث میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

## حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت قرآن کی روشنی میں:

### عیسیٰؑ کا اسم مبارک ولقب :

قرآنی آیات کے حوالہ سے آپؑ کا اسم مبارک عیسیٰؑ ہے۔ اہل تحقیق حضرات لکھتے ہیں کہ لفظ ''عیسیٰ'' ایشوع کا معرب ہے۔ یعنی عبرانی زبان میں عیسیٰ کا نام ایشوع تھا''۱۴؎ عربی میں آ کر عیسیٰؑ بنا۔

مولانا سرفراز خاں صفدر حضرت عیسیٰ، مسیح (علیہ السلام) اور مسیح دجال میں فرق بیان کرتے ہوئے

لکھتے ہیں کہ:

''مسیح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی کہتے ہیں اور دجال کو بھی لیکن محققین نے اس میں دوطرح سے فرق بیان فرمایا ہے۔ ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو جو مسیح کہا جاتا ہے وہ ''مسح یمسح'' سے ہاتھ پھیرنے کے معنی میں ہے اور اسی سے ہے وامسحوا برء و سکم اور مسح کروا اپنے سروں کا یعنی اپنے سروں پر ہاتھ پھیرو تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نابینے کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے، وہ رب حکم سے بینا ہو جاتا تھا برص والے کے جسم پر ہاتھ پھیرتے تھے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ٹھیک ہو جاتا تھا اس واسطے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مسیح کہا جاتا ہے اور دجال کا نام جو مسیح ہے وہ ساح، یسیح، سیاحۃ سے ہے جس کا معنیٰ سیر وسیاحت کرنا اور دجال ساری زمین پر پھرے گا سوائے چار جگہوں کے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بیت المقدس کا شہر اور طور کا پہاڑ ان چار جگہوں کے علاوہ ساری زمین پر اس کے ناپاک قدم پڑیں گے اس واسطے اس کو مسیح کہتے ہیں۔ مذکورہ چار جگہوں میں بھی داخل ہونے کی بڑی کوشش کرے گا مگر اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کا منہ پھیر دیں گے۔

اور دوسرا فرق مسیح (علیہ السلام) اور مسیح دجال میں یہ ہے کہ اگر اس کو دونوں جگہ مسح سے ہی لیا جائے تو فعیل کا وزن فاعل کے معنیٰ میں بھی آتا ہے اور مفعول کے معنیٰ میں بھی آتا ہے تو عیسیٰ (علیہ السلام) کے نام کے ساتھ مسیح کا لفظ فاعل کے معنی میں ہے مسح کرنے والے اور دجال کے ساتھ مسیح کا لفظ مفعول کے معنیٰ میں ہے یعنی ممسوح عینہ اس کی ایک آنکھ کا نور مٹا ہوا ہوگا دائیں آنکھ سے کانا ہوگا اس کی آنکھ جو کانی ہے وہ باہر نکلی ہوگی اور بڑی بڑی نظر آئے گی۔'' [15]

## بشارت ولادت :

قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت کے واقعات وحالات کہیں اجمال تو کہیں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں لیکن مفصل تذکرہ سورۃ آل عمران اور سورۃ مریم میں ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت سے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے :

إِذْ قَالَتِ الْمَلآئِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهاً فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ O وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلاً وَمِنَ الصَّالِحِينَ O قَالَتْ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ قَالَ كَذَلِكِ اللّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ إِذَا قَضَى أَمْراً فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُون. [16]

''(وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریمؑ ! اللہ آپ کو خوشخبری دے رہا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی ان کا نام (ولقب) مسیح عیسیٰ ابن مریمؑ ہوگا دنیا اور آخرت (دونوں) میں معزز اور مقربوں میں سے اور وہ لوگوں سے گفتگو کریں گے گہوارہ میں بھی اور پختہ عمر میں بھی اور صالحین میں سے ہوں گے وہ بولیں اے میرے پروردگار میرے لڑکا کس طرح ہوگا درانحالیکہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے ارشاد ہوا ایسے ہی اللہ پیدا کر دیتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے جب وہ کسی بات کو پورا کرنا چاہتا ہے بس اس سے کہتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتی ہے۔''

ان آیات کریمہ میں حضرت مریم علیہا السلام کو فرشتہ نے ایک ایسے نیک وصالح بیٹے کی خوش خبری سنادی جن کا نام عیسیٰ ابن مریمؑ ہوگا تو وہ انتہائی حیرت واستعجاب میں پڑ گئیں کہ بغیر کسی مرد کے ہاتھ لگائے بچہ کی پیدائش کیسے ہوسکتی ہے؟ یعنی نہ تو میری ابھی رخصتی ہوئی ہے اور نہ میں نے بدفعلی کی ہے؟ تو فرشتے نے جواب دیا کذالک (ایسا ہی ہوگا)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کے متعلق رقم طراز ہیں کہ :

''بشارت یہاں مریمؑ کو بیٹے کی مل رہی ہے وہ بیٹا جسے بن باپ کے ہونے کی بناء پر کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔ حضرت مریمؑ اس وقت تک یہودی رسم ورواج کے لحاظ سے نا کتخدا اور کنواری تھیں، البتہ آپ کی منگنی آپ ہی کے کفو وقبیلہ آلِ داؤدؑ کے ایک نوجوان یوسف نامی سے ہو چکی تھی جن کے ہاں کاروبار لکڑی کا ہوتا تھا۔''

''جبریلؑ فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا، جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی، اور اُس کنواری کا نام مریم تھا۔'' (لوقا۔۱:۲۶۔۲۷)

یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب آپ کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی۔'' (متی ۱:۱۸) ۱۷؎

قرآن مجید کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انتساب حضرت مریمؑ کی طرف کرنا (عیسی ابن مریم) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت دنیا کے عام قاعدہ کے خلاف بغیر باپ کے اور خارقِ عادت ہوئی ہے جس سے یہودیت ومسیحیت دونوں کی تردید ہوتی ہے۔

حضرت مریمؑ بغیر کسی بشری مس کے حاملہ ہوگئیں، وہ اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں کہ جب تک اللہ کی مرضی پوری نہ ہو اس وقت تک قوم کی لعنت و ملامت سے بچی رہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

فَحَمَلَتۡهُ فَانتَبَذَتۡ بِهِ مَكَاناً قَصِيّاً ﴿١٨﴾

[پھر ان کے حمل قرار دیا گیا، پھر وہ اسے لئے ہوئے ایک دور جگہ چلی گئیں۔]

جب حضرت مریم علیہا السلام کو زچگی کا شدید درد محسوس ہوا تو آپ بے تابانہ لوگوں سے دور اور جنگل کی طرف نکل گئیں۔ بائبل کے مطابق یہ جگہ ''بیت اللحم'' کی پہاڑی تھی جو ناصرہ سے ۷۱ میل کے فاصلہ پر ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ''تفسیر ماجدی'' کے حاشیہ میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''انجیل میں ہے کہ: ان دنوں میں ایسا ہوا کہ قیصر اوگوستس کی طرف سے یہ حکم جاری ہوا کہ ساری دنیا کے لوگوں کے نام لکھے جائیں۔ یہ پہلی اسم نویسی سوریہ کے حاکم کورنیس کے عہد میں ہوئی۔ اور سب لوگ نام لکھوانے کے لئے اپنے اپنے شہر کو گئے، پس یوسف بھی گلیل کے شہر ناصرہ سے داؤد کے شہر بیت لحم کو گیا جو یہودیہ میں ہے، اس لئے کہ وہ داؤد کے گھرانے اور اولاد سے تھا، تاکہ اپنی منگیتر مریم کے ساتھ جو حاملہ تھی نام لکھوائے، جب وہ وہاں تھے تو ایسا ہوا کہ اس کے جننے کا وقت آ پہنچا''۔ (لوقا۔۲:۱۔۶)۔[۱۹]

آپ اسی حالت اور کشمکش میں تھیں کہ ٹیلے کے نیچے سے حضرت جبرئیل کی آواز آئی کہ غم نہ کرو، اللہ نے آپ کے لئے راحت و آرام کے تمام اسباب کا انتظام فرما دیا ہے، مزید یہ حکم ملا کہ تم صوم سکوت کی نذر مان لو، اور کسی کے اعتراض کرنے پر سوال و جواب میں نہ پڑو۔

عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''روزہ بہت سی اگلی شریعتوں میں سکوت کے ساتھ ہوتا تھا شریعت اسلامی میں سکوت جائز نہیں۔ ایک شریف خاتون کے لئے، جب خود اس کی عصمت زیر بحث آنے لگے، اپنی برأت و صفائی میں تقریر کرنا جتنا دشوار ہوتا ہے، اس کا اندازہ ہر صاحب فہم و صاحب تجربہ رکھتا ہے۔ قرآن مجید نے حضرت

مریمؑ کی نزاکت جذبات کالحاظ فرما کر کتنا اچھا نسخہ انہیں بتا دیا کہ تم اس سوال وجواب ہی میں نہ پڑنا، بلکہ جواب اپنے اس بچہ ہی سے دلوانا، ہم اسے بطور خارق عادت تمہاری صفائی میں گویا کر دیں گے''۔[20]

بہرحال زچگی کی تکلیف اور درد نے آپؑ کو کھجور کے ایک درخت کے نیچے پہونچا دیا جہاں آپؑ فرط غیرت اور بدنامی کے خوف سے تمنائے موت کرنے لگیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَأَجَاءهَا الْمَخَاضُ إِلَى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا وَكُنتُ نَسْياً مَّنسِيّاً [21]

[سو انہیں دردِ زہ ایک کھجور کے درخت کی طرف لے گیا (اور) وہ بولیں کاش میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بھولی بسری ہوگئی ہوتی۔]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد جب حضرت مریم اپنے بچے کو گود میں لئے ہوئے بیت المقدس کی طرف آتی ہیں تو قوم کہنے لگی کہ اے مریم یہ تم نے کیا غضب کیا نہ تمہارا باپ بدکار تھا اور نہ تمہاری ماں بدکارہ تھی۔ تم جیسی نیک خاندان کی لڑکی سے اس طرح کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

حضرت مریم نے اللہ کے حکم سے اس بچے حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر تمہیں میری پاکدامنی پر شبہ ہے تو تم خود اس بچہ سے پوچھ لو، حضرت مریم جیسی سنجیدہ اور باوقار خاتون سے یہ جملہ سن کر سب کی زبان سے نکلا کہ بھلا جو بچہ اپنے گہوارے میں پڑا ہو وہ ہم سے کیسے بات کرے گا؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معجزاتی طور پر قوتِ گویائی عطا فرمائی، اور آپ نے بولنا شروع کیا قرآن کریم نے اس واقعے کی ان الفاظ میں منظر کشی کی ہے:

ارشاد ربانی ہے:

فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَن كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيّاً ○قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيّاً [22]

[اس پر مریم نے اس (بچہ) کی طرف اشارہ کیا وہ بولے ہم اس سے کیسے بات چیت کریں یہ ابھی گہوارہ میں (پڑا ہوا) بچہ ہی ہے۔ وہ (بچہ) بول اٹھا میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی اور اس نے مجھے نبی بنایا۔]

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''نہ خدا، نہ فرزند خدا، نہ مثیل خدا، نہ بروز خدا، نہ خدا کا منہ بولا بیٹا بلکہ محض بندۂ خدا۔ گفتگو چونکہ رد نصرانیت میں چل رہی ہے اس لئے تردید ان تمام صورتوں کی ہو رہی ہے جن سے شرک نصرانیت میں کوئی بھی صورت پیدا ہو۔ اس خرق عادت کا ظہور خود یہود کے مسلّمات کے لحاظ سے آپ کی اعلیٰ مقبولیت کا ثبوت تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کا بندہ بھی کیسا؟ مقرب و برگزیدہ۔ اُس کی عنایت بے غایت یہ ہوئی کہ اُس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور اس نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے۔ یہ بھی عجیب لطیفہ ہے کہ قرآن کو تو عیسیٰ مسیحؑ کے صاحب کتاب ہونے پر اصرار ہے اور مسیحیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کتاب سے محروم تھے، البتہ چار مختلف شخصوں نے آپ کے کچھ زمانہ کے بعد مختلف مقامات میں چار کتابیں آپؑ سے تعلق بتا کر دے دیں!''۔ ۲۳؎

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے شیر خوارگی کے زمانہ میں اس طرح کا کلام خلاف عادت اور معجزہ تھا، قوم کے لوگوں نے جب چھوٹے بچّے کی زبان سے یہ بلیغانہ کلام سنا تو وہ حیران اور ششدر رہ گئے اور اب انہیں یقین ہو گیا کہ مریم علیہا السلام کی عزت و عصمت بغیر کسی شک وشبہ کے پاک وصاف ہے اور اس بچہ کی ولادت باسعادت یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ چاروں طرف تمام علاقوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش اور شیر خوار بچّے کے بلیغانہ کلام کے چرچے ہونے لگے چنانچہ بدبخت لوگوں نے اس عظیم اور مقدس ہستی کے وجود کو اپنے لیے قابلِ نفرت جانا تو نیک لوگوں نے اس مقدس ہستی کے وجود مسعود کو کامیابی و نیک بختی کا چاند سمجھا۔

بہرکیف ان سخت حالات اور آزمائشوں میں اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں اس عظیم بچہ کی پرورش وتربیت ہوتی رہی۔ تاکہ اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کے مردہ دلوں کو روحانیت بخشی جائے۔

**منصبِ نبوّت :** اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سادہ لوح زندگی تاریخ ارض مقدسہ اور یروشلم کے برعکس ایک نئی تاریخی اہمیت کی حامل ہے جس میں آپؑ نے اپنی تعلیمات اور افکار کی اشاعت کی۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی رشد وہدایت کے لئے آپ علیہ السلام کا انتخاب کیا اور آپؑ کو منصب نبوت سے نوازا۔ آپؑ نے اعلائے کلمۃ الحق کیا۔ بنی اسرائیل کو توحید کی طرف بلایا نیز انہیں خلافت الٰہیہ قائم کرنے کی وعظ ونصیحت کی لیکن ہر وہ بات جو آپؑ ان کی اصلاح کی غرض سے کہتے وہ اسے الٹا سمجھتے اور اپنے مفاد کے خلاف جانتے۔

گویانافرمانی اورناشکری ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔

اللہ کی طرف سے منصب نبوت اوردعوت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک کامیاب مبلغ اور مصلح کی حیثیت سے بارہ افراد پر مشتمل ایک جماعت تیار کی جس نے آپؑ کے بعد نہ صرف آپؑ کے مشن کو جاری رکھا بلکہ اسے پروان چڑھایا۔

## قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت ورفعت:

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ ۲۴

[اللہ اسے سکھادے گا کتاب اورحکمت اورتورات وانجیل۔]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جومقام ومرتبہ ہے، وہ تو ظاہر ہی ہے، مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''لیکن خود حضرت مریمؑ کی بھی تشفی خاطر کا کتنا سامان ضمناً ہوا جارہا ہے، ارشاد گویا یہ ہورہا ہے، کہ تم غم نہ کرو اور پریشان نہ ہو، بے شوہری اولاد کی بنا پر خلق تمہیں جتنا بھی بدنام اورمطعون کرے گی، اس کی تلافی کے لئے اولاد بھی تمہیں کس پایہ کی مرحمت کی جارہی ہے''۔

وَرَسُولاً إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ ۲۵

[اوروہ پیغمبر ہوگا بنی اسرائیل کے لئے۔]

مولانا دریابادی لکھتے ہیں کہ:

''آپ کا مرتبہ پیمبری کا ہوگا نہ کہ آپ معاذ اللہ ساحروشعبدہ باز ہوں گے جیسا کہ بدتمیز یہود نے آپ کو سمجھا ہے اورنہ (نعوذ باللہ) آپ خودخدا یا فرزند خدا ہوں گے، جیسا کہ نصرانیوں نے گھڑ لیا''۔۲۶

اس گفتگو میں مولانا دریابادیؒ نے یہودیوں اورعیسائیوں کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں گستاخانہ باتوں اورافراط وتفریط کا نہایت عمدہ انداز میں جواب دیا۔

## اہل کتاب نصرانیوں کودعوت توحید:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اورآپ کی تعلیمات کے مناسبت سے اگر سب سے مستند ومعتبر ذریعہ ہوسکتا ہے تو وہ عہد نامہ جدید کے پہلے تین اناجیل ہیں جوحضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق کافی مواد فراہم کرتے ہیں یہاں تک کہ اکثر محققین ومصنفین ان کو (Synoptical Gospal) کہتے ہیں۔

اس کے بعد انجیل یوحنا، اوراعمال رسل کافی اہمیت اورمقبولیت رکھتے ہیں۔اس کے بعد سینٹ پال

کے وہ لمبے مراسلات جوانہوں نے مختلف اقوام کے لیے لکھتے تھے، یہ بھی حضرت عیسیٰؑ سے متعلق وافر مواد فراہم کرتے ہیں۔ لیکن ان سب سے مستند و معتبر ذریعہ قرآن کریم ہے جو ہمیں آپؑ کے خاندان کے متعلق سورہ آل عمران، النساء، المائدہ، مریم، انبیاء، المؤمنون، الحدید میں کہیں تفصیلی تو کہیں اجمالی ذکر ملتا ہے۔

قرآنی آیات میں اگر غور وخوض کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی تعلیم دی ہے اور اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ تم اس ایک وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور جو کوئی خدا تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرائے گا اس کا ابدی ٹھکانہ جہنم ہے۔ نیز یہود و نصاریٰ دونوں توحید خالص پر چلنے کے مدّعی تھے، وہ محض زبانی دعوے کرتے تھے کہ ہم صرف ایک اللہ ہی کو مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود طرح طرح کے کفر و شرک میں مبتلا تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُواْ إِنَّ اللّهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يَا بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ اعْبُدُواْ اللّهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِيْنَ مِنْ أَنصَارٍ ۲۷

[جن لوگوں نے کہا: مسیح ابن مریمؑ ہی خدا ہیں، انہوں نے کفر کیا، حالانکہ (خود) مسیح نے کہا تھا: اے بنی اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو، جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے، اللہ نے اس پر جنت حرام کردی ہے، اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ایسے ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔]

مندرجہ ذیل آیت میں بھی اہل کتاب یہود و نصاریٰ سے خطاب دعوت توحید پر زوردار انداز سے ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۲۸

[آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! ایسے قول کی طرف آجاؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہم بجز اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا پروردگار ٹھہرائے پھر اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہنا ہم تو فرمانبردار ہیں۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''یعنی وہ اصل جو ہم کو تم کو دونوں کو مسلم ہے، جس کی قدر و قیمت وافادیت پر ہم سب کو اتفاق ہے، جس کی تعلیم تمہارے ہاں کے پیمبران برحق دیتے آئے ہیں، اور یہودیت و نصرانیت دونوں دینوں کی بنیاد ہی اسی اصل پر ہے، توریت تو خیر تاکید توحید و ممانعت شرک سے لبریز ہی ہے، انجیل تک میں بھی یہی تعلیم موجود ہے: ''تو خداوند خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر''۔(متیٰ۔۴:۱۰)

انجیل میں یہ کہیں بھی نہیں ہے، نہ صراحتاً نہ اشارتاً کہ کچھ پرستش صرف خدا کی کرو اور بعض پرستشوں میں خدا کے ساتھ فرزندِ خدا اور روح القدس کو بھی شامل کرلیا کرو' ۔ مخلوق پرستی اور مخلوق کی اُلوہیت کی تردید تو اوپر ہوچکی، اب تردید مخلوق کی ربوبیت کی ہورہی ہے۔

پاپا کی عصمت کیتھولک مسیحیوں کا اور پادریوں کے اجماع یعنی کلیسا (CHURCH) کی عصمت کُل مسیحیوں کا متّفقہ عقیدہ ہے: ''ایک محسوس کلیسا کے بغیر نجات ممکن نہیں، اس پر ہمیشہ روح القدس کا سایہ رہتا ہے، اس لئے مسائل میں کلیسا سے امکان خطا ہی نہیں''۔(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۶، ص ۹۴۰)

''قرآن مجید نے انسان کی ان ساری خود ساختہ عصمتوں پر ضرب لگادی''۔۲۹

اس روئے زمین پر خدائے وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کوئی معبود والٰہ نہیں، اسی طرح مخلوق میں سے کوئی رب و مُطاع مطلق بھی نہیں، نصرانیوں نے طرح طرح کے شرک ایجاد کر لئے تھے، اور مختلف طرح کی عصمتیں گڑھ رکھی تھیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ جو آج بھی مسلمانوں کی توحید خالص کی شہادت دے رہے ہیں کہ اگر یہ واقعتاً اپنی نجات چاہتے ہیں تو ان مسلّمہ اصولوں کی طرف آجائیں جو آسمانی کتابوں سے ثابت ہیں۔

دوسری جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۳۰

[بے شک اللہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہاری بھی پروردگار ہے، سو اس کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔]

مفسرِ قرآن مولانا دریابادیؒ اس آیت کی توضیح وتشریح میں لکھتے ہیں کہ:

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم اسی عبدیت اور اسی توحید کی تھی، ظالموں نے اسے مسخ کر کے

تثلیث بنادیا جوشرک ہی کی ایک کھلی ہوئی شکل ہے۔یعنی صرف اسی کی پرستش کرو، بغیر کسی کی شرکت وآمیزش کے،آج انجیلیں دنیا کے پردہ پر موجود ہیں،اُن میں سے ایک انجیل برنابا بھی ہے،اس کے انگریزی،عربی،اردو ترجمے موجود ہیں،اوروہ حضرت برنابا سانامی حضرتؑ کے ایک حواری کی جانب منسوب ہے،اس میں ظہور اسلام کی خبریں اور حضرت ختم رُسُل کی بابت پیش گوئیاں ایسے صاف وصریح لفظوں میں موجود ہیں کہ مسیحیوں کو مفر اسی میں نظر آیا کہ اسی جعلی کہہ کر الگ کردیں خیر وہ تو ہر سچے سفیر الٰہی کے کلام کی طرح توحید کی تعلیم وتاکید سے لبریز ہی ہے،لیکن دوسری انجیلیں بھی خود کلیسا کے نزدیک مستند ہیں، وہ بھی اس تعلیم سے خالی نہیں۔مثلاً:

''یسوع نے اس سے کہا،اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر''۔(متیٰ،۴:۱۰)

''تثلیث کا شرک جن ظالموں کی بھی ایجاد ہو بہر حال حضرت مسیحؑ کا دامنِ اقدس اس کی آلودگی سے بالکل پاک ومنزّہ ہے''۔۳۱

انا جیل مروجہ کے اندر بھی بعض آیات اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے۔

انجیل مرقس میں اس طرح مذکور ہے :

''ایک فقیہہ نے یسوع سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کون سا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے اے اسرائیل سن: خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل سے اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔'' ۳۲

اسی طرح عیسائیوں کی کتاب متی میں بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی تعلیم دی گئی ہے:

''پھر ابلیس (یسوع کو) ایک اور اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی سب سلطنتیں اور ان کی شان و شوکت دکھائی اور اس سے کہا کہ اگر تو جھک کر مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دوں گا۔ یسوع نے اس سے کہا اے شیطان دور ہو کیوں کہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔''

۳۳

## اللہ کے نزدیک دین مقبول فقط اسلام ہی ہے:

یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ اس روئے زمین پر دین مقبول اللہ

کے یہاں صرف اسلام ہی ہے۔ یہ سب سے آخری اور دین برحق ہے اور اپنے سے پہلے تمام دینوں ملتوں، اور شریعتوں کا ناسخ ہے۔ لہٰذا اس روئے زمین پر اسلام کے سوا کوئی ایسا جامع اور مکمل دین باقی نہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جا سکے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِيناً فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۳۴

[جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائیگا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کریمہ کی توضیح و تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

''سچا اور مقبول دین صرف یہی دین ہے، جس کی کتاب قرآن ہے، اور جس کے لانے والے اور سکھانے والے محمد ﷺ ہیں، اس ایک دین کے علاوہ اور جتنے بھی دین و مذہب اپنی موجودہ صورت میں موجود ہیں، اُن کی مثال فرسودہ ٹکسال باہر سکّوں کی سی ہے کہ کہنے کو سکّے وہ بھی ہیں لیکن جب چل نہ سکے تو اُن کا سکّہ ہونا نہ ہونا برابر، یہ آیت اس حقیقت کو اور زیادہ موکّد و آشکار کر رہی ہے۔ دوسرے ادیان و مذاہب کو بھی (گو وہ اصلاً کیسے ہی ہوں) اُن کی موجودہ صورت میں اسی دین حق کی طرح سچا سمجھنا، ہر دین و مذہب کو نجات کے لئے کافی سمجھنا سب مذہبوں کو ملا جُلا اُن کا ایک ملغوبہ تیار کرنا، یا یہ کہنا کہ دیر و حرم کعبہ و کلیسا سب یکساں ہیں، ضلالت و بے دینی ہی کی شکلیں ہیں، اکبر داراشکوہ وغیرہ اِن ناکام کوششوں کے لئے بجا طور پر بدنام ہو چکے ہیں اور بڑے قلق کا مقام ہے کہ ہمارے زمانے میں بھی بعض اہل قلم ایسی ہی نامراد کوششیں کر چکے اور کر رہے ہیں''۔ ۳۵

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے زمانے میں بھی اسی طرح کی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ دین اسلام اور یہودیت و نصرانیت میں اتحاد پیدا کیا جائے حالانکہ محمد ﷺ کی بعثت کے بعد اسلام ہی وہ دین برحق ہے جسے نبی آخر الزماں اور انبیاء و ہادیانِ حق لے کر آئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مجموعی تعلیمات میں اخلاقی تعلیمات کو بنیادی مقام حاصل ہے اور اناجیل مروجہ میں بھی یہ تعلیمات جگہ جگہ موجود ہیں۔ آپ علیہ السلام نے اپنے مذہب کی نشر و اشاعت میں ان بنیادی تعلیمات پر بہت زور دیا۔ آپ نے فرمایا کہ حکومت تو خدا کی ہے مگر انہیں گناہوں کو معاف کرنے کی قوّت عطا

کی۔آپ علیہ السلام کی یہ اخلاقی تعلیمات ہمیں عفو و درگزر، پیار و محبت،توکل، زنا کی ممانعت وغیرہ کی شکل میں نظر آتی ہیں۔

**عفودرگزر :**

یوں تو دُنیا کے سارے ہی مذاہب میں عفو و درگزر کی تعلیم دی گئی ہے لیکن عیسائیت میں عفو و درگزر کی تعلیم اور انسانی تربیت سازی کی بہت ہی اہمیت ہے بلکہ اناجیل مروجہ میں اس صفت کو اپنانے پر بہت زور دیا گیا ہے اور اس کو خدائی بخشش کا ذریعہ بتلایا گیا ہے جیسا کہ عہد نامہ جدید میں مذکور ہے۔

> ''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے............اور جو تجھ سے قرض چاہے اُسے منہ نہ موڑ۔'' ۳۶

> ''اس وقت پطرس نے پاس آ کر اس سے کہا اے خداوند! اگر میرا بھائی گناہ کرتا رہے تو میں کتنی دفعہ اسے معاف کروں؟ کیا سات بار تک؟ یسوع نے اس سے کہا میں تجھ سے یہ نہیں کہتا کہ سات بار تک بلکہ سات دفعہ کے ستّر بار تک۔'' ۳۷

**دُشمنوں سے پیار ومحبت :**

مذہب عیسائیت میں دشمنوں سے نفرت کے بجائے پیار و محبت کی تعلیم دی گئی ہے، ظلم وستم اور تکلیف دینے والوں کے لیے دُعا کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ کتاب مقدس کے باب متی میں مذکور ہے:

> ''تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت۔لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دُعا کرو۔'' ۳۸

**غصّہ سے اجتناب :**

حضرت مسیح علیہ السلام نے غصہ سے اجتناب کی بھی لوگوں کو تعلیم دی ہے کہ غصہ کرنے والا اصلاً سزا کا مستحق ہے جیسا کہ کتاب مقدس کے باب متی میں مذکور ہے:

> ''تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ خون نہ کرنا اور جو کوئی خون کرے گا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا۔لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل کہے گا وہ صدرِ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا اور جو اُس کو احمق کہے گا وہ آتش جہنم کا سزاوار ہوگا۔'' ۳۹

## توکّل :

اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام نے توکل پر مکمل اعتماد کرنے کی تعلیم دی ہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ :

''پس کل کے لیے فکر نہ کرو کیوں کہ کل کا دن اپنے لیے آپ فکر کرے گا آج کے لیے آج ہی کا دُکھ کافی ہے۔'' [۴۰]

## پہاڑی پر وعظ و نصیحت اور اخلاقی تعلیمات :

ایک مرتبہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی قوم کو دیکھ کر پہاڑی پر چڑھ گئے آپ علیہ السلام کے شاگرد حضرات آپ کے پاس آئے آپ علیہ السلام نے اپنی قوم کو ایک خطبہ دیا جو حلم و بردباری، رحم دلی، تزکیۂ نفس، صلح و راست بازی اور لعن طعن کی تکالیف پر مشتمل ہے جو شخص بھی ان اخلاقی صفات کا حامل ہوگا وہ آسمان کی بادشاہت اور زمین کی وراثت کا حق دار ہوگا جیسا کہ انجیل متی میں مذکور ہے :

''مبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں کیونکہ وہ تسلّی پائیں گے۔ مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں کیونکہ وہ زمین کے وارث ہوں گے۔ مبارک ہیں وہ جو راست بازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں کیونکہ وہ آسودہ ہوں گے۔ مبارک ہیں جو رحم دل ہیں کیونکہ اُن پر رحم کیا جائے گا۔ تو تم آسمان کی بادشاہی میں ہرگز داخل نہ ہوگے۔'' [۴۱]

قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معاشرتی، اخلاقی یا سماجی تعلیمات کا تفصیلی ذکر نہیں کرتا ہے البتہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے جن ہدایات کی تعلیم دی گئی ہے، ان میں ایک یہ بھی ہے میں اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ حسن سلوک کروں اور فرمانبردار رہوں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

''وَبَرّاً بِوَالِدَتِی'' [۴۲]

[اور مجھے میری والدہ سے نیکی کرنے والا بنایا۔]

والدین کے ساتھ حُسن سلوک کی تعلیم تقریباً تمام مذاہب عالم نے دی ہے لیکن ذخیرۂ احادیث میں نبی اکرمؐ کے ارشادات والدین کے ساتھ حُسن سُلوک پر بے شمار ہیں۔ قرآن نے اس بات کی بھی تردید کر دی

کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا برتاؤ اپنی والدہ کے ساتھ اچھا نہ تھا۔

چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ انجیل مروجہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ :

''اس میں تردید ہے انجیل مروجہ کی پیدا کی ہوئی اس غلط فہمی کی کہ آپ کا برتاؤ اپنی والدہ کے ساتھ اچھا نہ تھا، آپ ان سے بے رُخی، بے التفاتی، بے اعتنائی برت جاتے۔'' (ملاحظہ ہو متی ۱۲ : ۴۶۔۵۰ مرقس ۳: ۳۱۔۳۵ لوقا ۸: ۱۹۔۲۱) ۴۳؎

## سماجی تعلیمات :

اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سماجی تعلیمات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ حقوق کے اعتبار سے تمام انسان برابر ہیں۔ ان کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے اس لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودیوں کی تمام تر مخالفتوں کے باوجود غیر یہودیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی سماجی تعلیمات میں حقوق نسواں سے متعلق بہت زیادہ تاکید و تلقین ہے، کیوں کہ اس سے پہلے یہودی سماج میں عورتوں کو بے حیثیت اور شیطان کا آلۂ کار سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عیسی علیہ السلام نے عورتوں کے حقوق، طلاق کا طریقۂ کار، بچّوں کے حقوق اور ان کے ساتھ پیار و محبت و الفت کی تعلیمات پر کافی زور دیا ہے۔

## فصل دوم:

# مسیحیوں کے بعض ایمانی واخلاقی بگاڑ اور عقائد باطلہ

### مقدس عشائے ربانی (EHCHARIST) کا تہوار:

قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَتَّخِذُ وَلِيّاً فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ [۴۴]

[آپ کہئے کہ کیا میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ (سب کو) کھلاتا ہے (خود) اس کو کھلایا نہیں جاتا کسی (اور) کو کارساز قرار دے لوں۔]

اس آیت کے مدنظر رقمطراز ہیں کہ:

''مشرک قوموں کے عقیدہ میں بڑے بڑے دیوتا بھی کھانے پینے کے محتاج ہیں، ان کے نام پر جو چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، انہیں کھا پی کر وہ زندگی بسر کرتے ہیں اور مسیحیوں نے تو اس سے بھی بڑھ کر کمال ہی کر دیا کہ نعوذ باللہ اپنے معبود، ابن اللہ کا گوشت اور خون خود کھانا پینا شروع کر دیا! چنانچہ مقدس عشائے ربانی (EHCHARIST) کے تہوار کے موقع پر ہر سال ایک بار یا تین بار اس رسم کو تازہ کرتے رہتے ہیں''۔[۴۵]

### مسیحیوں کی گمراہی:

مسیح کی ولدیت الٰہی کی تردید

عقیدہ ولدیت وابنیتِ مسیح کی تردید

مسیحیت کی دو گمراہیاں ہیں ایک بنیادی اور اہم ترین ضلالت ہے، تو دوسری شدید تر ضلالت ہے۔ بنیادی گمراہی یہ ہے کہ عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ کا ولد (Son of God) مانتے ہیں اور ان کو خدائی صفات کا حامل قرار دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس عقیدے کی شدت سے تردید کی ہے۔ دوسری گمراہی حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا فرزند مجازی (Child of God) اور آپؑ کو بشریت کے ساتھ ساتھ نبی و رسول قرار دینا ہے جو بنی اسرائیل کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عیسائیوں کے اس

عقیدے کی کھل کر مذمت فرمائی ہے اور اس کو عیسائیوں کی طرف سے افتراء پردازی اور ظلم عظیم قرار دیا ہے۔
اللہ تعالیٰ اس عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے چنانچہ آیاتِ خداوندی ہیں:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَداً Oلَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئاً إِدّاً Oتَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدّاًOأَن دَعَوْا لِلرَّحْمَنِ وَلَداًOوَمَا يَنبَغِي لِلرَّحْمَنِ أَن يَتَّخِذَ وَلَداً ۴۶

[اور (یہ لوگ) کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن نے اولاد اختیار کر رکھی ہے۔تم نے یہ حرکت ایسی سخت کی ہے کہ کچھ بعید نہیں جو اس کے باعث آسمان ٹوٹ پڑیں اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ کانپ کر گر پڑیں۔ اس بات سے کہ یہ لوگ خدائے رحمٰن کی طرف بیٹے کی نسبت کرتے ہیں اور خدائے رحمٰن کے لائق یہ (کسی طرح) نہیں کہ وہ بیٹا اختیار کرے۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے منفرد اسلوب نگارش اور فلسفیانہ انداز سے نظریہ ولدیت کو غلط ثابت کیا ہے۔جیسا اسلوب مولانا دریابادیؒ کا ہے اسطرح کا اسلوب کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔مزید یہ کہ مولانا دریابادیؒ نے اس نظریۂ ولدیت کے حامی افراد میں اشارۃً اور مذہب کے لوگوں کو بھی شامل کیا ہے۔
مفسر دریابادیؒ ان آیات کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''مشرکوں کے عقیدہ میں تو خدا کے لئے اولاد کا اثبات ایک معمولی بات تھی ہی، مسیحیوں کے یہاں بھی ظہور اسلام کے قبل ہی مسیحؑ کی ولدیت الٰہی کا عقیدہ ایک مسلم حقیقت بن چکا تھا۔حد یہ ہے کہ یہودی جیسی موحّد قوم بھی یونان اور رومہ کے مشرک حکیموں فلسفیوں کے اثر کے ماتحت اس عقیدہ سے بالکل بیگانہ و نامانوس نہیں رہ گئی تھی۔

یہاں یہ حقیقت خوب ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ابنیتِ الٰہی (اللہ کے ''ابن'' ہونا) اور چیز ہے اور ولدیت الٰہی (اللہ کے ''ولد'' ہونا) اور ہے۔دونوں ہی عقیدے سرتا سر غلط، باطل و نامعقول، لیکن یہ دوسرا عقیدہ اپنی بے ہودگی میں پہلے سے کہیں بڑھ کر ہے۔پہلے کو تو پھر بھی مجازی معنی میں لیا جاسکتا ہے، اور تاویل کی جاسکتی ہے کہ ابنیت سے مراد محض محبوبیت اور تعلق تخصیصی ہے، لیکن یہ دوسرا عقیدہ تو کھلا ہوا گستاخانہ ہے، اور خدا کی خدائی ہی کو باطل کر دینے والا''۔ ۴۷

اللہ تعالیٰ نے ان گمراہوں کے اس تصور کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا یہ قول اس قدر سنگین اور احمقانہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی صفت حلم وتحمل اور صفت رحمت نہ ہوتی تو اس گستاخی پر زمین

ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی، آسمان پھٹ پڑتے، اور پہاڑ ریت کے ذروں کی طرح بکھر جاتے۔

## مسیحیوں کے عقیدۂ شفاعت کی تردید:

نبی اکرم ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم السلام اس لئے نہیں آئے تھے کہ لوگوں کو شفاعت یا ان کے نام کے انتساب کی بنیاد پر نجات دلائیں بلکہ ایمان و عمل صالح کی بنیاد پر نجات کی دعوت دیتے تھے۔ اسلامی شفاعت کوئی مستقل شفاعت نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے مقبولین خدا کی دعا ہے۔ مقبولینِ خدا اللہ تعالیٰ ہی کی اجازت سے سفارش کریں گے لہٰذا انبیاء کرام اور اللہ کے ہر صاحب ایمان نیک بندے گناہ گاروں کے قصوروں کو نظر انداز کرنے کی سفارش کریں گے، لیکن کفار و مشرکین اس دن ہر طرح کی سفارش سے محروم رہیں گے۔

قرآن کے اولین مخاطب یعنی مشرکین عرب کی پوری مذہبیت اسی شفاعت کے عقیدے پر قائم تھی۔ ان کے نزدیک دیوی دیوتا خدا کے حضور ان کے حمایتی اور سفارشی تھے، اسی طرح مسیح کی شفاعت کبریٰ مسیحیوں کا خصوصی عقیدہ ہے، نصاریٰ کا گمان تھا کہ مسیح موعود آخرت میں اُن کی سفارش ضرور کریں گے اور ان کے وسیلے سے ہم بخشے جائیں گے۔ خود جنت کا حقدار تصور کئے بیٹھے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بات کی یوں تردید فرمائی کہ:

> يَـا أَيُّهَـا الَّذِينَ آمَنُواْ أَنفِقُواْ مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ [۴۸]
>
> [اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ تجارت کام آئے گی اور نہ دوستی اور نہ سفارش اور کافر ہی تو ظالم ہیں۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ مطلق شفاعت کی تردید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

> "مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ ابن اللہ کی حیثیت شافع مطلق کی ہے، انسان کے قالب میں انہوں نے اسی لئے تو جنم لیا تھا کہ اپنی جان کا فدیہ سب گنہگاروں کی طرف سے دے کر اور سب کی طرف سے صلیب پر اپنے خون کا چڑھاوا چڑھا کر قیامت میں شافع مطلق کی حیثیت سے ظاہر و نمودار ہوں، اور ان کی شفاعت سب کے حق میں نجات کا حکم قطعی رکھے گی، ہمارے ہاں کے عام واعظوں اور نعت گو شاعروں نے شفاعتِ مصطفوی پر حد سے زیادہ زور دینا شروع کیا ہے، یہ صاف مسیحیت سے تاثر کا نتیجہ ہے"۔ [۴۹]

قرآن نے جگہ جگہ ان کے اس عقیدۂ شفاعت کی بھرپور تردید کی ہے۔

## عقیدۂ کفارہ:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہٗ مسٹر ڈینیل وِلسن کے حوالے سے مسیحیوں کے نزدیک عقیدۂ شفاعت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہی عقیدہ عیسائی مذہب کی جان ہے، اور فی نفسہٖ زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اس سے پہلے جتنے عیسائی عقائد ہم نے بیان کئے ہیں اُن کو درحقیقت اسی عقیدے کی تمہید سمجھنا چاہئے، دوسرے اس لئے کہ یہی وہ عقیدہ ہے جو اپنی پیچیدگی کے سبب خاص طور سے غیر عیسائی دنیا میں بہت کم سمجھا گیا ہے، تیسرے اس لئے کہ اس کو پورے طور پر نہیں سمجھا گیا۔

آگے عقیدۂ کفارہ کی مختصر تشریح انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے حوالے سے کرتے ہیں کہ:

''عیسائی علم عقائد میں ''کفارہ'' سے مراد یسوع مسیح کی وہ قربانی ہے جس کے ذریعہ ایک گناہگار انسان یک لخت خدا کی رحمت کے قریب ہو جاتا ہے، اس عقیدے کی پست پر دو مفروضے کارفرما ہیں، ایک تو یہ کہ آدمؑ کے گناہ کے وجہ سے انسان خدا کی رحمت سے دور ہو گیا تھا، دوسرے یہ کہ خدا کی صفت کلام (بیٹا) اس لئے انسانی جسم میں آئی تھی کہ وہ انسان کو دوبارہ خدا کی رحمت سے قریب کر دے''۔۵۰

وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۵۱

[اور اللہ تم سے تمہارے کچھ گناہ بھی دور کر دے گا اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔]

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ اس آیت کے ضمن میں عقیدۂ کفارہ کی مختصر تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

''قرآن مجید نے ازالۂ سیّأت کی جہاں اور صورتیں رکھی ہیں وہاں ایک صورت یہ بھی ہے کہ نیکیاں بدیوں کا کفارہ ہوتی رہتی ہیں اور حسنات سیّأت کو محو کرتی رہتی ہیں، یہ چیز محض عقیدہ کی نہیں مشاہدہ اور تجربہ کی بھی ہے''۔

آگے فرماتے ہیں کہ:

''یہاں پہنچ کر مسیحیوں کے اس بنیادی عقیدہ کو ایک بار پھر یاد کر لیا جائے کہ گنہگاروں کی نجات اور گناہوں کے دُھلنے کی کوئی صورت بجز اس کے نہیں کہ ''خداوند خدا کا اکلوتا بیٹا'' انسان کے قالب میں دنیا میں آئے اور اپنی جان کو صلیب پر دے کر سب کی طرف سے کفارہ ادا کرے''۔۵۲

عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام نے صلیب پر جان دے کر ان کے گناہوں کا

کفارہ ادا کر دیا، حالانکہ اسلام خدا کو غفور و رحیم قرار دیتا ہے اس کی رحمت بہت وسیع ہے جو سب چیزوں پر حاوی ہے، اسلام میں کفارہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ خدا عادل و منصف ہے ہر شخص اپنے افعال و اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ عیسائیوں نے کفارہ کے عقیدہ کی آڑ میں اپنے معاصی کا بوجھ مسیح علیہ السلام پر ڈال دیا حالانکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کی کوئی تعلیم نہیں دی، بلکہ یہ سب سینٹ پال نے موہوم مصلوبیت بنا کر ''عقیدۂ کفارہ'' ایجاد کیا۔

## مسیحی تثلیث کا عقیدہ اور اس کی تردید:

### روح القدس:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۵۳

[اور عیسیٰ ابن مریمؑ کو ہم نے روشن نشانات عطا کئے اور ہم نے روح القدس کے (ذریعہ) سے ان کی تائید کی۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ روح القدس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''روح القدس۔ اسلامی اصطلاح میں مشہور، ممتاز و مقرب فرشتہ حضرت جبرئیل کو کہتے ہیں۔ مسیحی اصطلاح میں روح القدس ''تثلیث مقدس'' کے اقنوم ثالث کو کہتے ہیں اس سے یہاں کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں، اصطلاح کے مشترک ہونے سے بعض دفعہ بڑے بڑے مغالطے اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں''۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش چونکہ خداوندی مَصالح کے مطابق عام بشری طریق سے الگ ایک نئے قانون کے ماتحت مَسّ ملکوتی سے ہوئی تھی، اس لئے عجب کیا جو بعد میں بھی آپ کو مناسبت عالم ملائکہ سے زیادہ رہی ہو، اور اسی مناسبت سے استفاضہ بھی ملائکہ سے زیادہ ہوتا رہتا ہو''۔۵۴

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ باپ بیٹا اور روح القدس تین اقانیم ہیں لیکن یہ تین اقانیم ایک بھی ہیں ہر اقنوم باپ (خدا)، بیٹا (حضرت مسیحؑ) اور روح القدس الگ الگ خدائی صفات کا حامل ہے۔ اسلام خالص توحید اور خدا کی وحدانیت پر زور دیتا ہے۔ قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے اس کے ساتھ ہی خدا نے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا ہے۔ یہی تعلیم قدیم انبیاء بنی اسرائیل نے دی تھی لیکن عیسائیوں نے اس تعلیم کو یکسر بدل دیا۔

عقیدۂ تثلیث صرف عیسائیوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ بعض قدیم ادیان اور دنیا کے اکثر ملکوں یونان، ایران، مصر، ہند، چین، عراق وغیرہ میں بھی ایک خاص قسم کا تثلیث پایا جاتا ہے، جیسا کہ قدیم اہل مصر کے مذہب میں اپنے معبودوں کے بارے میں یہی عقیدہ تھا جو گردشِ ایام سے ختم ہوا۔ مگر مسیحیوں نے تثلیث یونانی فلسفے اور ہندومت کی تثلیث (تری مورتی) سے متأثر ہو کر اپنے پیمبر برحق کے بارے میں از خود گھڑا ہے۔

محمد فرید وجدی دائرۃ المعارف القرآن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''عیسائیت کے عقیدۂ تثلیث کا تصور دراصل ہندوؤں کے عقیدہ سے ماخوذ ہے کیونکہ وہ بھی ایک ہی معبود کے بارے میں اس بات کے قائل ہیں کہ وہ تین اجزاء سے مرکب ہے اور ان کے ہاں تین تین اجزا سے مراد برہما وشنو اور شیوا ہے''۔۵۵

اللہ تعالیٰ نے عقیدہ تثلیث اور اس کے ابطال کی واضح دلیل دی ہے کہ:

لَّقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُواْ إِنَّ اللّهَ ثَالِثُ ثَلاَثَةٍ وَمَا مِنْ إِلَـهٍ إِلاَّ إِلَـهٌ وَاحِدٌ وَإِن لَّمْ يَنتَهُواْ عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُواْ مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۵۶

[یقیناً وہ (بھی) کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ خدا تین میں سے تیسرا ہے حالانکہ کوئی معبود نہیں بجز ایک معبود کے اور اگر یہ لوگ اپنے (ان) اقوال سے باز نہ آئے تو ان میں سے جو لوگ کافر رہیں گے ان پر عذاب دردناک واقع ہو کر رہے گا۔]

مندرجہ بالا آیت سے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی تحریر فرماتے ہیں کہ:

''موجودہ مسیحیوں کے کافر بلکہ مشرک ہونے پر یہ صاف نصوص موجود ہیں، مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ باپ، بیٹا، روح القدس، یہ تین اقنوم (اصل) منفرداً بھی خدا ہیں، اور مجتمعاً بھی، تینوں الگ الگ بھی خدا ہیں، اور تینوں مل کر بھی، صفات کی یکتائی وغیرہ کے علاوہ عدد کے لحاظ سے بھی ایک، یہ وہ ذات ہے جو بے مثل و بے نظیر ہونے میں منفرد اور ناقابلِ تقسیم و تجزّی ہونے اور بے مثل و نظیر ہونے کے اوصاف بس ذات باری ہی میں جمع ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف یہ گورکھ دھندا، اور دوسری طرف اسلام کا صاف وسادہ کلمہ لاالـہ الّا الـلـه۔ کوئی مناسبت بھی دونوں میں ہے؟ واحد ہر اعتبار سے اور اپنے ہر معنی میں، نہ وہ ایک تین میں تقسیم ہے، نہ وہ ایک اپنے کو تین شکلوں میں ظاہر کرنے والا ہے، نہ تریمورتی کی کوئی قسم بھی صحیح ہے۔ نہ کوئی اس کا اوتار نہ کوئی اس کا اقنوم''۔۵۷

☆ تثلیث کا عقیدہ عیسائیوں نے خود اپنی جانب سے گھڑ لیا ہے جس کی نہ اللہ نے کوئی دلیل اتاری، اور نہ موجودہ انجیل محرّف میں ایسی کوئی دلیل ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام نے عقیدۂ تثلیث کی تعلیم دی ہو، بلکہ اس طرح کے عقائد باطلہ سے حضرت مسیح علیہ السلام کو کوئی نسبت ہی نہیں چہ جائیکہ آپ کی طرف منسوب کیا جائے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ وہ توحید کو تثلیث میں اور تثلیث کو توحید میں کچھ ایسے انداز سے گڈمڈ کرتے ہیں، کہ انسان اپنا سر پیٹ کر رہ جائیگا پھر بھی اس کو اطمینان حاصل نہ ہوگا۔

## عیسائیت کی مذہبی دنیا میں عورت کا مقام ومرتبہ:

عیسائیت مذہب یہودیت کا ہی تسلسل ہے کہ جس طرح یہودیوں کے نظام فکر وعمل میں عورت کی کوئی حیثیت اور مقام ومرتبہ نہیں اسی طرح عیسائیت اور اس کے اکابرین عورت کو مقام ومرتبہ دینے سے قاصر ہیں، بلکہ عیسائیت کا رویہ عورت کے ساتھ اور بھی زیادہ سنگدلانہ اور ناپسندیدہ رہا ہے۔ اس مظلوم صنف کو جس قدر قعرِ مذلّت میں پھینکا جا سکتا تھا پھینک دیا، عورت کے متعلق عیسائیت کے جذبات اور طرزِ عمل کا اندازہ تالمود میں طرطولین کی اس عبارت سے لگایا جاسکتا ہے:

''عورتوں! تم نہیں جانتیں کہ تم میں سے ہر ایک حوّا ہے، خدا کا قانون ہے جو تمہاری جنس تھا وہ اب بھی تم میں موجود ہو پھر جرم بھی تم میں موجود ہوگا تم شیطان کا دروازہ ہو۔ تم ہی نے آسانی سے خدا کی تصویر یعنی مرد کو ضائع کیا''۔ ۵۸؎

ارشادِ خداوندی ہے کہ:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىُ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۵۹؎

[اور عورتوں کا (بھی حق) ہے جیسا کہ عورتوں پر (حق) ہے۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کے تحت رقمطراز ہیں کہ:

یہودیت ونصرانیت کی مذہبی دنیا میں تو عورت گویا ہر برائی کا سرچشمہ تھی، اور ذلت وحقارت کا ایک مرقّع یہود کی معتبر ومستند جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ہے:

''معصیت اول چونکہ بیوی ہی کی تحریک پر سرزد ہوئی تھی، اس لئے اس کو شوہر کا محکوم کر کے رکھا گیا اور شوہر اس کا حاکم ہے، شوہر اس کا مالک وآقا ہے اور وہ اس کی مملوکہ ہے''۔ ۶۰؎

اور مسیحی سے متعلق مسٹر لیکی Lecky فرنگی مسیحی اپنی تاریخ اخلاقِ یورپ History of

European Morals میں لکھتے ہیں:

''عقیدہ یہ تھا کہ عورت جہنم کا دروازہ ہے اور تمام آفاتِ بشری کا باعث ہے، اسے اپنے کو ذلیل سمجھتے رہنے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ عورت ہے''۔ (جلد۳، ص۱۴۲)

یہ حال وقت کے اونچے اونچے مذہبوں کا تھا، شرک و جاہلیت کے پست مذہبوں کا ذکر ہی بیکار ہے۔[۶۱]

**عیسائیت میں عورتوں کے مقام و مرتبہ کے حوالے سے انجیل مقدس اور تفسیر ماجدی کے حاشیہ کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ عورت تمام آفات بشری اور بدی کی جڑ ہے اور اس پر لعنت اور ملامت کی گئی ہے۔**

**ڈاکٹر حافظ ثانی اپنی تصنیف ''تجلیات سیرت'' میں عورت کے متعلق مسیحی اکابر کلیساء کی آراء و اقوال نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:**

''سینٹ انتھونی! عورت شیاطین کے ہتھیاروں کی کان ہے، سینٹ بوناونیٹر! عورت ایک بچھو ہے جو ڈسنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے، وہ شیطان کا نیزہ ہے۔

سینٹ گریگری! عورت سانپ کا زہر القی ہے اور اژدھے کا کینہ''۔[۶۲]

**مسیحی اکابرین کے اقوال سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عیسائیت کی نظر میں عورت کا کیا مقام اور حیثیت ہے۔ اس طرح کے نظریئے کی اساس پر نہ عورت کو عزت اور مقام و مرتبہ مل سکتا ہے اور نہ ایک صحت مند معاشرہ میں سماجی زندگی کی تشکیل ہو سکتی ہے۔**

## مسیحیت میں خنزیر کے گوشت کا جواز:

**فقہی احکام اور شرعی حرمت کے اعتبار سے خنزیر اپنے پورے وجود کے ساتھ حرام اور ناپاک ہے۔**

**مولانا عبدالماجد دریابادیؒ خنزیر کی حرمت سے متعلق لکھتے ہیں کہ:**

''خنزیر ہے ہی ایسی نجس چیز کہ خود فطرتِ سلیم اُسے گندہ سمجھتی ہے، اور نظافتِ طبع کو اُس کی جانب رغبت کرنے سے کراہت آتی ہے۔ آج مسیحی قومیں جس ذوق و شوق سے یہ گندہ گوشت تازہ اور خشک، دونوں صورتوں میں کھایا کرتی ہیں، اور اس کی چربی سے جو طرح طرح کے کام لیتی رہتی ہیں، بلکہ اس کی نسل کی پرورش کا انتظام جس بڑے پیمانہ پر جا بجا کئے ہوئے ہیں اُسے دیکھ کر تو قیاس یہی ہوتا ہے کہ کراہت کیسی؟ عجب نہیں کہ کچھ فضائل اس جانور کے مسیحیت میں وارد ہوئے ہوں! حالانکہ اس کی حرمت اور نجاست دونوں، صراحت کے ساتھ بائبل میں موجود ہیں:

''اور سُور کا کھر اُس کا دوحصہ ہوتا ہے، اور اس کا پاؤں چرا ہے، پر وہ جُگالی نہیں کرتا، وہ بھی تمہارے لئے ناپاک ہے''۔(احبار،۱۱:۷)

اور سُور کہ کُھر اُس کے چرے ہوئے ہیں، یہ جُکالی نہیں کرتا، یہ بھی تمہارے لئے ناپاک ہے، تم اس کا گوشت نہ کھائیو، نہ اس کی لاش کو ہاتھ لگائیو''۔٦٣

فقہاء امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سُور کا صرف گوشت ہی نہیں بلکہ اس کے تمام اجزاء یعنی اس کی چربی، ہڈی، کھال اور بال حرام ہیں اور لحم کی تصریح اس لئے ہے کہ سور کا اصل مقصود اس کا گوشت ہے، اتفاقی قید کے تحت جانور کے دوسرے اجزاء بھی آ گئے۔

## علماء ومشائخ کو ''خدائی'' کا مقام ومرتبہ :

عیسائیوں نے اللہ کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اپنے درویشوں اور علماء ومشائخ کو خدائی کا مقام دیتے ہوئے ان کو تحلیل وتحریم کے سارے اختیارات دے رکھے ہیں، جس کا ذکر قرآن وحدیث میں آیا ہے۔ قرآن میں ارشاد باری ہے:

اتَّخَذُواْ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ ٦٤

[انہوں نے اللہ کے ہوتے ہوئے اپنے علماء اور مشائخ کو (بھی) اپنا پروردگار بنا رکھا ہے۔]

مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی مراد واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یعنی انھیں ایسا مستقلاً ایسا صاحبِ اختیار مان رکھا ہے کہ گویا وہی معبود اور رب ہیں، جو چاہیں جائز کردیں، جو چاہیں وہ حرام ٹھہرادیں، سارے اختیارات شریعت وقانون سازی کے گویا انہیں کو حاصل ہیں، مسیحیوں کے ہاں فرقۂ کیتھولک میں پوپ (پاپائے روم) بہ حیثیت نائب مسیحؑ آج بھی سارے اختیارات اعلانیہ رکھتا ہے اور فرقۂ پروٹسٹنٹ نے بھی عملاً سارے اختیارات کلیسا (Church) کو دے رکھے ہیں، یہود کے ہاں بھی ربّیوں کے احکام جو توریت کی تعلیمات پر غالب آ گئے تھے''۔٦٥

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی بجا آوری میں علماء ومشائخ کی رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے مقابلہ میں ان کے اقوال کی کوئی اہمیت نہیں۔

## موجودہ مسیحی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے دستبردار:

قرآن وحدیث میں پوری امتِ مسلمہ کا ایمان وعقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول اور نبی ہیں۔قرآن کریم میں تقریباً ۲۵ رمقامات پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام ذکر ہوا ہے۔

وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً ٦٦

[اوران کے بعد ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا،اور ہم نے انہیں انجیل دی،اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی،ان کے دلوں میں ہم نے شفقت ونرمی رکھ دی تھی۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کی توضیح وتشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ دعویٰ تو مسلمانوں کا ہے کہ قرآن مجید کی طرح انجیل نامی بھی ایک کتاب آسمانی نازل ہوچکی ہے، لیکن موجودہ مسیحیت صدیوں سے اس دعویٰ سے کلیۃً دستبردار ہوچکی ہے،وہ تو اس کی قائل ہے کہ مسیح سرے سے کوئی پیامبر ہی نہ تھے،جو کسی اور کا پیام یا کسی کی طرف سے کتاب لے کر آتا۔وہ تو (نعوذ باللہ) مظہر ذات باری تھے،اوران کی زبانی بعض بشارتیں سن کر اوران کے معجزات وخوارق دیکھ کر بعض لوگوں نے زبانی یا تحریری شکل میں دوسروں تک پہنچادیئے،اور ان دوسروں نے ان انسانی نوشتوں کے مختلف مجموعوں کو مختلف انجیلوں کے نام سے شائع کردیا''۔٦٧

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو انجیل عطا ہوئی تھی اس الہامی اور آسمانی کتاب کا ان انجیلوں سے کوئی تعلق ہی نہیں جس وحی شدہ انجیل کا یہاں ذکر ہے۔مسلمانوں کے نزدیک آج کل کوئی انجیل اپنی اصل شکل میں نہیں ہے۔جو کچھ ان میں ہے وہ من جانب اللہ نہیں بلکہ عیسائیوں کا خانہ ساز مواد ان میں پایا جاتا ہے۔

## عیسائیت کے قانون طلاق میں تفریط:

عیسائیت میں ابتدا ہی سے یہ جائز نہ تھا کہ کسی وجہ سے عورت کو طلاق دی جائے،رشتہ نکاح دوامی سمجھا جاتا تھا،موت کے سوا زن وشوہر میں علیحدگی کی کوئی اورصورت ممکن نہ تھی،یہ ساری سختی اور تنگی حضرت مسیح کے اس قول سے اخذ کی گئی تھی۔

''انجیل کے موجودہ الفاظ ہیں:

''جسے خدا نے جوڑا ہے،اسے آدمی جدا نہ کرے......جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ کرے،وہ اس پہلے کے خلاف زنا کرتا ہے،اور اگر عورت اپنے شوہر کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ

کرے تو زنا کرتی ہے''۔(مرقس(۱:۷:۱۰)

میں نہیں بلکہ خداوند حکم دیتا ہے کہ بیوی شوہر سے علیحدہ نہ ہو۔(ا۔کرنتھیوں۔۷:۱۰)

''چنانچہ مسیحی آبادی کے سواد اعظم یعنی فرقہ کیتھولک کے ہاں تو طلاق مطلقاً ناجائز ہے،اور بجز موت کے کوئی صورت میاں بیوی کے درمیان افتراق کی ممکن نہیں،اور یہی فرقہ اسلام سے قبل موجود تھا، پروٹسٹنٹ فرقہ ظہور اسلام سے صدیوں بعد پیدا ہوا،اس کے ہاں البتہ اجازت ہوئی ہے،لیکن اس صورت میں کہ پہلے عدالت میں گواہوں کے بیان سے کسی ایک فریق کا ارتکاب زنا یا ظلم و جور ثابت ہولے''۔۶۸

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ اخلاقی ہدایت تھی کہ لوگ بغیر کسی وجہ کے طلاق نہ دیں مگر مسیحی علماء نے اس کی خود ساختہ تشریح کر لی،کئی صدیوں بعد عیسائی عائلی قوانین میں اصلاحات کی گئیں اس کے تحت قانون طلاق کو آسان بنایا گیا،مگر ان تمام اصلاحات کے باوجود مسیحی حضرات سخت قوانین طلاق کی وجہ سے افراتفری کے شکار ہیں۔کروڑوں عیسائی جوڑے ازدواجی زندگی کے حدود و قیود، اصول و آداب سے برگشتہ ہو کر مفسدانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

## جنگ کے متعلق مسیحی اہل قلم کے نظریات:

حضرت مسیح کی تعلیمات میں اخلاقی فضائل اور نفسانی خواہشات کو دبانے پر جتنا زور دیا ہے اتنا کسی پیغمبر کی تعلیمات میں نہیں ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت دو ڈھائی سال کے عرصہ پر مشتمل تھی،لیکن اس مختصر سی مدت میں ان کے بعض اقوال میں جنگ و قتال کی تحریص و ترغیب ملتی ہے۔اگرچہ عیسائیت میں امن و عدل،حلم و بردباری، دیانت داری،عفو و درگزر،فروتنی و ایثار، زہد و تقویٰ وغیرہ کی تعلیمات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

**قتال:** دوسری امتوں سے نرالا کچھ امت محمدی کے ساتھ مخصوص نہیں بائبل میں اس کا ذکر ایک دو جگہ نہیں بیسیوں جگہ موجود ہے،اور محاربات یہود سے تو تاریخ کے دفتر کے دفتر رنگین ہیں، رہیں مسیحی قومیں اور ان کی خونریزیاں اور خوں آشامیاں،تو ان کی نظیر تو دنیا کے پردہ پر کہیں نہیں ملے گی،عیاں راچہ بیاں! اور عملاً جو نمایاں فرق اسلامی فاتحین کی رحم دلی اور مسیحی فاتحین کی سنگدلی کے درمیان رہا ہے،اس کا اعتراف تو خود مسیحی

اہل قلم کو ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو:

(ص،۵۳۳)FINLAYS,GREECE UNDER THE ROMANS

(۲۱۶و۲۷۱۔۲۱۸۔)BOSWORTH SMITH'S MOHAMMED AND

MOHAMMEDANISM ۲۹

انجیل کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مسیحیت جنگ کی مخالف تو ضرور ہے لیکن بہت ساری آیتوں سے دشمنوں سے جنگ وقتال کی تلقین بھی ملتی ہے۔ چنانچہ مسیحیت میں جنگ و جہاد کے تصور کو سرے سے خارج نہیں کیا بلکہ اسے جاری وساری رکھا، لہٰذا حضرت مسیح نے اپنے آخری زمانہ میں حواریوں کو جنگ وقتال اور دشمنوں سے بدلہ لینے کی تعلیمات دیں۔

زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب اپنی جہالت وشقاوت کے باوجود سال کے دوتہائی حصہ میں جنگ وقتال کرتے تھے اور باقی حصہ امن وآشتی ہی کے مشغلہ میں گزار دیتے تھے لیکن فرنگی قوموں کے سورمانہ سال کے کسی حصہ، نہ موسم، نہ تہوار کا خیال رکھتے ہیں، بلکہ ہر وقت ایک دوسرے کی جان لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور سیکنڈوں، منٹوں میں لاکھوں جانیں ضائع کر دیئے ہیں۔

## فصل سوم:

# محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اناجیل مروّجہ میں

رحمۃ للعالمین، خاتم النبین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شانِ اقدس وفضیلت تمام انبیاء علیہم الصلوٰات والسلام میں ایسی ہی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کو لاکھوں ستاروں پر، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کے نام پاک اور صفات مبارکہ کو تمام آسمانی کتابوں میں وضاحت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، اور خاص طور سے محمد ﷺ کی آمد سے متعلق بشارتیں عہد نامہ قدیم، عہد نامہ جدید اور انجیل برناباس میں سینکڑوں قسم کی تحریفات کے باوجود ابھی تک موجود ہیں۔

اناجیل مروجہ کی ان بشارتوں کے ساتھ ساتھ قرآن کریم نے اس بات کی وضاحت فرمادی ہے کہ سابقہ کتب سماویہ میں بھی آنحضرت ﷺ کی بعثت کی بشارت دی گئی تھی، اور سارا عالم آپ ﷺ کا منتظر تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَإِنَّهُ لَفِی زُبُرِ الْأَوَّلِینَ ٥ ے

[اور بلاشبہ آپ ﷺ کا ذکر پہلی کتابوں میں موجود ہے۔]

اسی طرح سورۃ الاعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے حق میں دنیا وآخرت کی بھلائی کی دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ نصیحت فرمائی کہ وہ تقویٰ اختیار کریں، زکوٰۃ ادا کریں، اور ہماری آیتوں پر ایمان لائیں، اور چوتھی نصیحت یہ فرمائی کہ اس سعادت کو وہ لوگ پائیں گے جو اس نبی امی ﷺ کی مکمل اطاعت وفرمانبرداری کریں گے جن کا ذکر توریت وانجیل میں موجود ہے، قرآن پاک کا بیان ہے:

الَّذِینَ یَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِیَّ الْأُمِّیَّ الَّذِی یَجِدُونَهُ مَكْتُوباً عِندَهُمْ فِی التَّوْرَاةِ وَالإِنْجِیلِ اے

[جولوگ اس امی رسول اور نبی کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔]

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ محمدﷺ کا ذکر مبارک توریت وانجیل میں موجود ہے، لیکن یہود ونصاریٰ ان بشارتوں کا یکسر انکسار کرتے ہیں ،اورتحریف وتبدل کرتے ہیں، بلکہ ان بشارتوں کو چھپاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی ان ناپاک حرکتوں کوقرآن کریم کی متعدد آیات میں بیان کیا ہے:

ارشادِ ربانی ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَ كُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيراً مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَاء كُم مِّنَ اللّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ ۲؎

[اے اہل کتاب ! تمہارے پاس ہمارے (یہ جو) رسول آئے ہیں، یہ تمہارے سامنے کتاب (الٰہی) کے وہ (مضامین) کثرت سے کھول دیتے ہیں، جنہیں تم چھپاتے رہے ہو اور بہت سے امور کونظرانداز بھی کر جاتے ہیں بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آچکی ہے۔]

آنحضرتﷺ کا ذکر مبارک کتب سابقہ میں بکثرت مذکور تھا اسی لئے علماء یہود ونصاریٰ کو محمدﷺ کی ذات وعظمت کو پہچاننے میں بالکل دیر نہ لگی ، بلکہ قرآن کریم نے اس بات کی وضاحت فرمادی کہ یہ لوگ آپﷺ کو اپنے بیٹوں کے احوال کی طرح جانتے اور پہچانتے تھے، قرآن کریم کی آیت شریفہ ہے:

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءهُمْ وَإِنَّ فَرِيقاً مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۳؎

[جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ ان کو یعنی نبی اکرمﷺ کو ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسے کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، اور بے شک اُن میں کے کچھ لوگ خوب چھپاتے ہیں حق کو، حالانکہ جانتے ہوتے ہیں۔]

مگر اپنے عنصر وعناد اور کتمان حق کے باعث نہ تو خود ایمان لائے اور نہ لوگوں کو ایمان لانے دیا، قرآن کریم کی دوسری آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی بشارت کا تذکرہ صراحت کے ساتھ موجود ہے:

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّراً بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ۴؎

[یاد کرو جب عیسیٰ ابن مریمؑ نے کہا! اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنیوالا ہوں اس تورات کی جو میرے سامنے موجود ہے اور خوش خبری دینے والا ہوں، ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام ''احمدؐ'' ہوگا۔]

بعض احادیث طیبہ میں بھی ان بشارتوں کا ذکر موجود ہے۔ جس کا ذکر ڈاکٹر مقصود احمد نے اپنی کتاب ''کتب سابقہ میں سیدالمرسلین ﷺ سے متعلق بشارتیں'' میں کیا ہے کہ:

چنانچہ انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا آپ ﷺ کی خدمت میں رہا کرتا تھا، اتفاق سے وہ بیمار پڑا، آنحضرت ﷺ اس کی عیادت کو گئے اور اس کے باپ سے پوچھا کہ کیا میرا ذکر تم تورات میں پاتے ہو؟ اس نے کہا نہیں''۔ لڑکے نے فوراً جواب دیا ''ہاں'' یارسول اللہؐ! آپ ﷺ کا ذکر ہم نے تورات میں پڑھا ہے، اور یہ کہ اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا، یا اپنے باپ کے مشورے سے مسلمان ہوگیا۔ اس کے بعد غالباً اسی مرض میں اس کا انتقال ہوگا اور اس کو وہ شرف حاصل ہوا جس کی آرزو ہر صحابی کو ہوا کرتی تھی، یعنی آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کے ساتھ اس کے جنازے کی نماز پڑھی۔ ۵ے

ترمذی شریف میں آپ ﷺ کی نبوت کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے:

قالوا یارسول اللہ ﷺ متیٰ و جبت لك النبوّۃ؟ قال وادم بین الروح والجسد۔ ۲ے

[صحابہؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ کے لئے نبوت کا فیصلہ کب ہوا؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت جبکہ آدمؑ کا ابھی صرف پتلا تیار ہوا تھا اور روح نہیں ڈالی گئی تھی۔]

حضرت عطاء بن یسارؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے ملا تو میں نے ان سے کہا کہ مجھے حضور ﷺ کی وہ صفات بتائیں جو تورات میں آئی ہیں، انہوں نے فرمایا بہت اچھا۔ خدا کی قسم! تورات میں بھی آپ ﷺ کی وہی صفات بیان ہوئی ہیں جو قرآن مجید میں ہیں (چنانچہ تورات میں ہے) اے نبی ﷺ! ہم نے آپ کو گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور امّیوں کی حفاظت کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، آپ میرے بندے اور میرے رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے، نہ آپ سخت گو ہیں نہ سخت دل، نہ بازاروں میں شور کرنے والے ہیں اور نہ آپ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے ہیں، بلکہ آپ عفوو درگزر سے کام لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس وقت دنیا سے اٹھائیں گے جبکہ لوگ لا الٰہ الا اللہ کہہ کر ٹیڑھے دین کو

سیدھا کرلیں گےان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اندھی آنکھوں کواور بہرے کانوں کواور پردہ پڑے ہوئے دلوں کوکھول دیں گے۔۷۷

اس ضمن میں جناب مقصود احمد نے اہل کتاب وصحابہؓ وتابعینؒ کے حوالہ سے یہود کے تین مخصوص طبقے بیان کئے ہیں کہ:

''یہود کے تین مخصوص طبقے تھے،جن کے بعثتِ نبوی سے متعلق تین مختلف نظریے تھے، ایک طبقے کا خیال یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اورتورات کے نزول کے بعد کسی نبی کی بعثت یا کسی اور کتابِ الٰہی کا نزول نہ ہوگا،لیکن یہ طبقہ بہت محدود تھااوراس خیال کے یہود عرب میں زیادہ نہ تھے۔ دوسرے طبقے کا نظریہ یہ تھا کہ ایک اور نبی کی بعثت تو ہونے والی ہے،مگر وہ بنی اسرائیل سے ہوگا، اور اگر بنی اسرائیل سے نہ بھی ہوا،تو ہر معاملے میں کم ازکم ان کی تائید ضرور کرے گا، چنانچہ،انھوں نے بار بار آپ ﷺ کے سامنےاس کا اظہار کیا۔اس خیال کے یہودی بہ کثرت تھے،اور یہی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

تیسرا گروہ وہ تھا جو نہ تو نبوت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پرختم سمجھتا تھااور نہ اس کو بنی اسرائیل میں محدود تصور کرتا تھا، بلکہ وہ انبیاء کی اصل پیشین گوئی اورتورات کے بیان کے مطابق، یہ سمجھتا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے،خواہ وہ عرب میں ہو یا عجم میں۔یہی یہود کا اعتدال پسند گروہ تھااور یہی آپ ﷺ کی بعثت کا منتظر تھا،اوراسی کے بعض افراد نے اسلام قبول کیا،مگر بعض ذاتی مصالح کے تحت بعض افراد نے دوسرے گروہ کا راستہ اختیار کیا،اوران کے ساتھ رہےاوردولتِ ایمان سے محروم رہے''۔۷۸

یہود کی طرح عیسائی حضرات بھی آپ ﷺ کی بشارت سے آگاہ اور باخبر تھے اوران کی مانند،وہ بھی آنحضرتؐ کی تشریف آوری کے منتظر تھے،اس بات کی تائید درجِ ذیل روایت سے ہوتی ہےاس روایت کوبھی ڈاکٹرمقصود احمد اہل کتاب صحابہؓ وتابعینؒ کےحوالے سےنقل کرتے ہیں کہ:

''سعد بن العاصؓ صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا،تو میرے چچا ابان بن سعید،رسول اللہ ﷺ کو ہمیشہ برا بھلا کہا کرتے تھے،ایک مرتبہ وہ (مکہ سے) بہ غرضِ تجارت شام گئے۔وہاں بکّاء الراہب سے،جو چالیس برس کے بعد عبادت گاہ سے نکلے تھے،ملاقات ہوئی،انھوں نے جا کر ان سے کہا کہ میری قوم کے ایک فرد نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔بکاء نے نام دریافت کیا۔کہا''محمد ﷺ''۔پھر پوچھا: ''کتنے زمانے سے وہ اپنے کو نبی کہتے ہیں''۔جواب دیا کہ بیس (؟) برس سے۔اس کے بعد،بکاء نے

کہا کہ کہو تو میں ان کی صفات بیان کروں۔ابان کہتے ہیں کہ انہوں نے ان کی تمام صفات بیان کیں اور ذرا غلطی نہیں کی۔اس کے بعد کہا کہ خدا کی قسم وہ نبی برحق ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کو ضرور غالب کرے گا۔میرا اسلام ان کو پہنچا دینا۔یہ کہہ کر وہ پھر گرجا میں چلے گئے''۔

''اس ملاقات کا یہ اثر ہوا کہ ابان جب مکہ واپس آئے،تو سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کے حالات دریافت کئے اور بکاء سے ملاقات کا سارا واقعہ بیان کیا۔اس کے بعد،ابان نے آنحضرت ﷺ کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیا اور پھر کچھ روز کے بعد مسلمان ہو گئے''۔۷۹

موجودہ وقت میں قرآن کریم کے علاوہ تمام کتب سابقہ محرّف ہیں،اوران میں اہل مذہب نے اپنی باطل خواہشات اور مکروہ عزائم کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے ردّوبدل سے کام لیا ہے،لیکن اس کے باوجود جب ہم ان صحائف وکتب میں غوروخوض کرتے ہیں تو خاتم الانبیاء ﷺ کی آمد سے متعلق بڑی کثرت سے بشارتیں ملتی ہیں۔ان بشارتوں میں سے بعض کا تذکرہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی اپنی ''تفسیر ماجدی''میں کیا ہے۔

قرآن کریم سے پہلے نازل شدہ آسمانی کتابوں کے مجموعے کو موجودہ اصطلاح میں بائبل (Bible) کہا جاتا ہے پھر اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔حضرت عیسیٰ سے قبل نازل ہونے والی کتابوں کو عہد نامہ عتیق (Old Testament) اور اناجیل اربعہ کو عہد نامۂ جدید (New Testament) کہتے ہیں۔پہلی بشارت عہد نامۂ قدیم کی کتاب پیدائش سے نقل کی جاتی ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے حضرت اسماعیلؑ کی نسبت جو وعدہ فرمایا وہ اس طرح ہے:

''اور اسمٰعیل کے حق میں بھی میں نے تیری دعا سنی۔دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کردوں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا''۔۸۰

دوسری بشارت ان الفاظ میں منقول ہے:

''اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ مجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے،جو کچھ سارا تجھ سے کہتی ہے،تو اس کی بات مان،کیوں کہ اضحاق سے تیری نسل کا نام چلے گا،اور لونڈی (حضرت ہاجرہ) کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کروں گا،اس لئے کہ وہ تیری نسل ہے''۔۸۱

آیاتِ بالا میں بڑی قوم اور قوم کے الفاظ محمد مصطفیٰ ﷺ کی جانب کر رہے ہیں کیوں کہ ملک عرب میں بنی اسماعیلؑ ہی کی قوم بڑی قوم تھی۔

تیسری بشارت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کتاب الاستثناء...... کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ:

''خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں ں ے جو کچھ کہا سو اچھا کہا، میں ان کے لئے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منھ میں ڈالوں گا''۔۸۲؎

اب دیکھئے کہ ''اپنا کلام اس کے منھ میں ڈالوں گا''، یعنی لفظی کلام الٰہی ہونے کا مصداق بجز قرآن کی ساری آسمانی کتابوں میں ہے اور ہے ہی کون؟ لفظی کلام الٰہی ہونے کا دعویٰ کس دوسری کتاب کا ہے؟ پھر دیکھئے کہ ''تجھ سا''، یعنی ''موسیٰ کا سا'' ہونے کا مصداق تاریخ کی دنیا میں بجز ذات محمدیؐ کے اور ہوا کون ہے؟ اور کہا اس سے بھی قطع نظر ممکن ہوگی کہ یہاں بھی بجائے ''ان میں سے'' کے یا ''اسرائیلیوں میں سے'' کے صراحت ''ان کے بھائیوں میں سے'' ہونے کی موجود ہے اور پھر یہی پیش گوئی انھیں لفظوں میں موسیٰ علیہ السلام نبی کی زبان سے نکلی ہوئی نصاریٰ کی انجیل میں دہرائی ہوئی موجود ہے:

''موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ خداوند خدا تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے مجھ سے نبی پیدا کرے گا، جو کچھ وہ تم سے کہے تم اس کی سننا''۔۸۳؎

اسی کتابِ استثناء کی ایک اہم بشارت ملاحظہ فرمایئے جو حسبِ ذیل ہے:

اپنی وفات سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

''خداوند سینا سے آیا، اور شعیر سے ان پر آشکارا ہو کر، وہ کوہِ فاران سے ان پر جلوہ گر ہوا، اور دس ہزار قدسیوں میں سے آیا، اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لئے آتشیں شریعت تھی''۔۸۴؎

اس بشارت میں تین مقامات قابل ذکر ہیں: (۱) سینا (۲) شعیر (۳) کوہِ فاران۔

خداوند سینا سے آیا یعنی یہ وہ مقام مبارک ہے جہاں خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت عطا فرمائی تھی، اور آپ علیہ السلام کو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تھا، سینا کا دوسرا نام جبل طور ہے جو وادیِ سینا میں واقع ہے۔ آیت بالا میں اس کی جانب اشارہ ہے۔

شعیر (سعیر، ساعیر یا سراۃ) بھی شام میں ایک پہاڑ ہے جسے آج کل جبل الخلیل کہا جاتا ہے اور

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ''بیت اللحم'' اسی پہاڑ پر واقع ہے، اور کوہِ شعیر سے آشکارا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اسی پہاڑ پر نبوت اور انجیل سے سرفراز کیا تھا اور آپ علیہ السلام عبادت وریاضت اسی مقام پر کیا کرتے تھے، اور کوہِ فاران سے جلوہ گر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کو اپنی آخری کتاب قرآن کریم فاران نامی پہاڑ کے حرا نامی غار میں عطا فرمائی تھی اور آپ ﷺ کی ولادت وبعثت مکۂ معظّمہ میں ہوئی تھی، جو آغوش فاران میں واقع ہے یہی مطلب ہے اس آیت کا کہ ''وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا''۔

فاران نامی پہاڑ کے غار حرا میں جو پہلی وحی اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۸۵ نازل ہوئی تھی، اس آیت کریمہ کے ذریعہ دنیائے انسانیت کو یہ پیغام دینا ہے کہ رشد وہدایت کا جو سامان یہود کے مقدس پہاڑ طور سینا سے چل کر نصاریٰ کے مقدس پہاڑ شعیر پر جلوہ نما ہوا تھا اور مسلمانوں کے مقدس پہاڑ فاران پر آکر مستقل طور ایک ابدی اور ناقابل تنسیخ شریعت کا ظہور قرآن کریم کی شکل میں ہوا، جو ایک طرف رسالت محمدی ﷺ کی دلیل ہے تو دوسری طرف آپ ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی لکھتے ہیں کہ:

> ''مذکورہ پیشین گوئی آپ ﷺ کی بعثت کے بارے میں نہایت واضح ہے جس سے یہود ونصاریٰ بوکھلا گئے اور انہوں نے فاران (Paran) لفظ کی بہت سی تاویلیں کر کے اسے دوسرے علاقوں میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ بعض نے فاران کو بیت المقدس ہی کا دوسرا نام گردانا ہے۔ بعض نے قادس اور کوہ سینا تک پھیلے ہوئے میدان کو فاران کہا ہے بعض نے نفس قادس کو فاران کہا ہے اور بعض نے کوہِ سینا کے مغربی نشیب پر واقع وادی کو فاران کہہ دیا ہے''۔۸۶

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کریم گذشتہ آسمانی کتابوں کے اہم مضامین کا جامع ہے۔ قرآن کریم کا اعجاز دیکھئے کہ مذکورہ بشارت اور درجِ ذیل آیات میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ سورۃ التین میں ارشاد ہے:

> وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ O وَطُورِ سِينِينَ O وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۸۷
>
> [قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور قسم ہے طورِ سینین کی اور اس امن والے شہر (مکہ) کی۔]

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی علامہ ابن قیم کی ھدایۃ الحیاریٰ فی اجوبۃ الیھود والنصاریٰ کے حوالے سے

رقمطراز ہیں کہ:

''علامہ ابن قیم نے توریت کی اس بشارت کی تصدیق کے لئے قرآن کریم کی سورۃ التین پیش کیا ہے جس میں تین زیتون، طورسینین، اور بلدامین کی قسم کھائی گئی ہے، ان آیات میں ان مقامات کا ذکر ہے، جہاں سے یہ انبیاء، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد ﷺ رونما ہوئے تھے۔ تین اور زیتون سے مراد سرزمین بیت المقدس ہے جہاں سے حضرت مسیح اٹھے، طورسینین وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ کو نبوت ملی اور ھٰذا البلدالامین مکہ مکرمہ ہے جہاں حضرت محمد ﷺ پیدا ہوئے''۔ ۸۸

اور مکۂ مکرمہ کو امن والا شہر اسلئے کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس شہر کے بارے میں دعا فرمائی تھی۔

سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہے:

رَبِّ اجْعَلْ هَـٰذَا الْبَلَدَ آمِناً ۸۹

[اے اللہ اس شہر کو امن والا بنادے۔]

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی اپنی کتاب ''مطالعۂ مذاہب'' میں علامہ ابن قیمؒ کی کتاب "ھدایة الحیاری فی اجوبة الیھود والنصاریٰ" کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

''اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے کہا کہ میں تمہارے بیٹے اسماعیلؑ کو بڑی امت بناؤں گا اس لئے کہ وہ تیری کھیتی ہے''۔

حضرت اسماعیل کی اولاد میں صرف محمد ﷺ ہیں جنہوں نے بڑی امت بنائی ہے جو شخص ان بشارتوں پر غور کرے گا وہ یقین کرے گا کہ اس سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ ۹۰

اس آیت میں واضح طور پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے آنے والے نبی کی طرف اشارہ ہے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے آنے والے واحد نبی حضرت محمد ﷺ ہی ہیں۔ اس بشارت کے آخر میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں کہ:

''(وہ) ہزاروں قدسیوں میں سے آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ ان کے لئے آتشیں شریعت تھی''۔ ۹۱

مولانا محمد تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ ''اظہار الحق میں لفظ ہزاروں ہی ہے، جو کیتھولک بائبل کے مطابق ہے''۔

لیکن بائبل کے عربی اور اردو تراجم میں بالترتیب ''ہزاروں''، ''دس ہزار'' اور لاکھوں قدسیوں میں

سے آنے کا'' ذکر ہے، اس کے برعکس انگریزی ترجمہ مطبوعہ ۱۹۷۹ء میں ''دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا'' تحریر ہے اور یہ آخری فقرہ زیادہ قرین صواب معلوم ہوتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پیشین گوئی کا حلیہ بگاڑنے کے لئے اس لفظ میں بار بار تبدیلی کی گئی ہے اور کتمانِ بشارت کی مذموم کوشش کی گئی ہے اور تحریف بائبل کی بدترین مثال قائم کی گئی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ آخری فقرہ محمد ﷺ پر پوری طرح صادق آتا ہے کیوں کہ فتح مکہ کے موقع پر حضور اکرم ﷺ دس ہزار فرشتہ صفت صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ مکے میں فاتحانہ طور پر داخل ہوئے تھے۔

آیت کے آخر جملے ''اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لئے آتشیں شریعت تھی'' کا مفہوم اکثر علماء نے یہ بیان کیا کہ یہ لوگ (مسلمان) کفار کے لئے بڑے سخت ہوں گے جیسے کہ قرآن پاک میں ہے:

وَالَّذِيْنَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ ۹۲

[اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ تیز ہیں کافروں کے مقابلے میں۔]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ آیت کے اس حصہ کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

''یعنی کافروں کے مقابلے میں ان کے کفر ہی کی بنا پر مضبوط و ثابت قدم ہیں، اُن کے مقابلے میں ڈھیلے نہیں لڑتے، کسی طرح پر ان سے مرعوب نہیں ہوتے بغض فی اللہ کے یہی معنی ہیں''۔ ۹۳

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کا مفہوم بیان کرتے ہیں کہ:

''وہ اپنے ایمان کی پختگی، اصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے کفار کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کا حکم رکھتے ہیں۔ وہ موم کی ناک نہیں ہیں کہ انہیں کافر جدھر چاہیں موڑ دیں، وہ نرم چارہ نہیں ہیں کہ کافر انہیں آسانی کے ساتھ چبا جائیں، انہیں کسی خوف سے دبایا نہیں جا سکتا، انہیں کسی ترغیب سے خریدا نہیں جا سکتا''۔ ۹۴

ڈاکٹر مقصود احمد کفار پر سخت ہونے کی وضاحت کرتے ہیں کہ:

''کفار پر سخت ہونے کا ہرگز مطلب نہیں ہے کہ مومنین، منکرین خدا کے ساتھ سختی اور بدسلوکی سے پیش آتے ہیں یا اسلام مسلمانوں کو روزمرہ کی زندگی میں غیر مسلموں کے ساتھ درشت بیزارانہ اور غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے کہ اس کی تائید نہ تو قرآن پاک کی کسی آیت سے ہوتی

ہے اور نہ رحمۃ للعالمین اور آپؐ کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرزِ عمل سے، بلکہ اس کے برعکس اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک ایفائے عہد، احترامِ جان ومال وعصمت اور پاسداری حقوق کی تعلیم دی گئی ہے''۔۹۵

مگر راقم کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ جیسے آتش (آگ) اپنے ماسوا کو جلا کر خاک کر دیتی ہے اسی طرح یہ آخری شریعت بھی گذشتہ تمام شریعتوں کو منسوخ کر دے گی اور تا قیامت باقی رہے گی۔

## انجیل متی باب ۱۳ر کی بشارت:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی تفسیر ماجدی میں اس بشارت کو نقل کرتے ہیں کہ:

''موجودہ محرف ومسخ شدہ انجیل میں یہ عبارتیں مل جاتی ہیں:'' آسمانی بادشاہت اس رائی کے دانے کے مانند ہے، جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا، وہ سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے، مگر جب بڑھ جاتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کر لیتے ہیں''۔(متی۔۱۳:۳۱۔۳۲)

تقریباً اس جیسی تمثیل باب،۴: آیت،۳۰،۳۲ میں اس طرح مذکور ہے:

''پھر اس نے کہا کہ ہم خدا کی بادشاہت کو کس سے تشبیہ دیں اور کس تمثیل میں اسے بیان کریں؟ وہ رائی کے دانے کے مانند ہے کہ جب زمین میں بویا جاتا ہے تو زمین کے سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے، مگر جب بو دیا گیا تو اُگ کر سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے، اور ایسی بڑی ڈالیاں نکالتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کے سائے میں بسیرا کرتے ہیں''۔۹۶

جس طرح رائی کا دانہ کمزور اور چھوٹا ہوتا ہے اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے جب دین حق کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تو آپؐ کے ساتھی بہت ہی تنگدست اور ناتواں تھے ان کو معاشرے میں ذلت وحقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ان کے بالمقابل یہود ونصاریٰ سیاسی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے متموّل، مضبوط اور طاقت ور تھے ان کو اونچی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، پھر رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر دیا، یہاں تک کہ دین اسلام دنیا کے تمام اطراف واکناف میں پھیل گیا۔

بڑی بڑی متمدن اور مضبوط قومیں اور تہذیبیں اس کے سامنے ہیچ ہو گئیں، دین اسلام ایک ایسا تناور درخت بن کر ابھرا جس کے سائے اور پھل سے پوری دنیا مستفید ہو رہی ہے۔

انجیل کی یہ وہی بشارت ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے سورۂ فتح، آیت نمبر ۲۹ میں کیا ہے:

وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيماً ۹۷

[اور انجیل میں ان کا وصف یہ ہے کہ وہ جیسے کھیتی میں کہ اس نے اپنی سوئی نکالی، پھر اس نے اپنی سوئی کو قوی کیا، پھر وہ اور موٹی ہوئی، پھر اپنے تنہ پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی، (یہ نشو ونما صحابہؓ کو اس لئے دیا) تا کہ کافروں کو ان سے جلائے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے جو ایمان لائے ہیں اور (جنہوں نے) نیک کام کئے، مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعوت وتبلیغ کے دوران جگہ جگہ گھوم کر یہ آواز بلند کی کہ آسمانی بادشاہت کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ مثلاً انجیل متی، باب ۴، آیت ۱۲/ میں اس طرح منقول ہے:

''جب اس نے سنا کہ یوحنا پکڑوا دیا گیا، تو گلیل کو روانہ ہوا''۔ ۹۸

اسی باب کی آیت ۱۷/ میں ہے:

''اس وقت سے یسوعؑ نے منادی کرنا اور کہنا شروع کیا کہ توبہ کر، کیوں کہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آ گئی ہے''۔ ۹۹

انجیل متی کے باب ۴/ آیت ۲۳/ میں یہی مضمون اس طرح درج ہے:

''اور یسوع تمام گلیوں میں پھرتا رہا اور ان کے عبادت خانوں میں تعلیم دیتا اور بادشاہی کی خوش خبری کی منادی کرتا اور لوگوں کی ہر طرح کی بیماری اور ہر طرح کی کمزوری کو دور کرتا رہا''۔ ۱۰۰

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو مختلف علاقوں اور اسرائیلیوں کے گھرانوں میں دعوت وتبلیغ لئے بھیجا، تو دوسری وصیتوں کے ساتھ ساتھ یہ وصیت بھی فرمائی کہ بنی اسرائیل کو آسمانی بادشاہت کی خوشخبری سنائیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

''چلتے چلتے یہ منادی کرنا آسمان کی بادشاہی نزدیک آ گئی ہے''۔ ۱۰۱

نیز انجیل متی باب ۶/ میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو نماز کا طریقہ بتاتے ہوئے یہ دعا سکھائی:

''پس تم اس طرح دعا کیا کرو کہ اے ہمارے باپ! تو جو آسمانوں پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو''۔۱۰۲؎

اب سوچنے کی بات ہے کہ ان آیات میں آسمانی بادشاہت سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے دین اسلام کا غلبہ اور استحکام مقصود ہے کیونکہ دنیا میں آسمانی بادشاہت اسی صورت میں قیام پذیر ہوسکتی ہے جہاں غیر اللہ کا حکم اور تسلط ختم ہو اور اس کے مقابلے میں خدائی نظام نافذ و غالب ہو اور یہ آسمانی بادشاہت نہ تو عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں ظاہر ہوئی اور نہ ہی حواریوں اور شاگردوں کے دور میں بلکہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواری بشارت دیتے گئے اور آپ ﷺ کی آمد کے متوقع رہے اور اگر یہ آسمانی بادشاہت شریعت عیسوی کی شکل میں ظاہر ہوتی تو آپ علیہ السلام اور ان کے حواری یہ نہ کہتے کہ ''وہ قریب آنے والا ہے'' اور نہ ان کو نمازوں میں پڑھنے کی تلقین کرتے کہ ''تیری بادشاہی آئے''۔

اور یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس وقت بادشاہت یہود کی تھی، بیت المقدس پر ان ہی کا قبضہ تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہود کی ظالم حکومت کے خوف سے چھپتے پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہود نے ان کو پھانسی پر چڑھانے کی تدابیر اختیار کیں اور وہ نصاریٰ کے عقیدہ کے مطابق ان کو پھانسی پر چڑھا بھی دیا، لہٰذا ثابت ہوا کہ آسمانی بادشاہت درحقیقت دین اسلام اور شریعت محمدی ﷺ کی صورت میں نمودار ہوئی۔

چنانچہ انجیل متی باب ۲۱، آیت ۴۳ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ الفاظ بھی نقل کئے گئے ہیں کہ:

''.................خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی''۔۱۰۳؎

اس بادشاہت اور سلطنت کا صحیح مصداق اسلام ہے جو اپنی صداقت وحقانیت کی بنیاد پر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گیا ہے اور دنیا کے تمام ادیان پر اپنا غلبہ اور استحکام حاصل کر لیا ہے۔

خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی آمد اور تشریف آوری سے متعلق انجیل یوحنا میں پیشین گوئیاں نقل کی گئیں ان میں اسے بعض پیشین گوئیاں بیان کی جاتی ہیں۔

انجیل میں جابجا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی یہ کہا گیا ہے کہ میں جاؤں گا، تو اللہ تعالیٰ میرے بعد تمہارے لئے ایک اور نبی بھیجے گا جسے روح حق کا نام دیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ میری تصدیق بھی کرے گا۔

انجیل یوحنا کی چند عبارتیں ملاحظہ ہوں:

انجیل یوحنا باب ۱۶/آیت ۷/میں مذکور ہے:

''میں اپنے اور تمہارے پروردگار کے پاس جارہا ہوں تاکہ تمہاری طرف فارقلیط بھیج دیا جائے، جو عنقریب تمہارے پاس تاویل لے کرآئے گا''۔۱۰۴

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ:

''اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو، تو میرے حکموں پر عمل کروگے، اور میں باپ سے درخواست کروں گا، تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے، یعنی روح حق جسے دنیا حاصل نہیں کرسکتی، کیوں کہ نہ اسے دیکھتی اور نہ جانتی ہے، تم اسے جانتے ہو کیوں کہ وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے اور تمہارے اندر ہوگا''۔۱۰۵

پہلی بشارت میں فارقلیط اور دوسری میں مددگار لفظ آیا ہے، انجیل کے قدیم عبرانی نسخوں میں فارقلیط ہے جدید اردو تراجم میں اس لفظ کی جگہ ''مددگار'' لکھ دیا گیا ہے انجیل کی اصل زبان عبرانی تھی پھر اس کا یونانی زبان میں ترجمہ ہوا۔ فارقلیط کا لفظ یونانی زبان میں ہونے والے تراجم میں موجود ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں تعریب ہوکر شامل ہوا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ بھی بعینہ یہی بات اپنی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ:

''میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار (یا وکیل یا شفیع) بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے''۔(یوحنا،۱۴:۱۶)

''جب وہ مددگار یا وکیل یا شفیع آئے گا جس کو میں تمہارے باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا۔(۱۵:۲۶)

مسیحی جس یونانی لفظ کے ترجمے سے خود مطمئن نہیں ہیں، اور اس کا ترجمہ کبھی ''تسلی دہندہ'' سے کرتے ہیں، کبھی ''مددگار'' سے کبھی ''وکیل''، کبھی ''شفیع'' سے وہ اصل میں (Periclutos) ہے، جو صحیح ترجمہ لفظ احمدؐ (بمعنی محمود وستودہ) ہی کا ہے۔۱۰۶

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''اصل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آنے والے نبی کا نام ''احمد'' ذکر کیا تھا، لیکن عہد نامۂ قدیم

وجدید کے مصنفوں نے یونانی زبان میں اس کا ترجمہ ''پیرکلوطوس'' (Priclytos) سے کردیا اور عربی مترجموں نے اس لفظ کو معرب کر کے ''فارقلیط'' بنادیا''۔۱۰۷

اور اب اردو مترجمین نے اس کا ترجمہ مددگار سے کردیا ہے تاکہ مسلمان اسے محمد ﷺ کی بشارت کے سلسلہ میں بطور دلیل نہ پیش کرسکیں۔

لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی روح حق جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا اور تم بھی گواہ ہو کیونکہ شروع سے میرے ساتھ ہو۔۱۰۸

ایک دوسری جگہ ہے:

''لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیج دوں گا''۔۱۰۹

نیز ایک اور جگہ ہے:

''لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا''۔۱۱۰

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ دوسرا نبی جو آئے گا وہ حضرت عیسیٰ کے بعد آئے گا ان کی موجودگی میں نہیں آئے گا اور انبیاءؑ کے باب میں یہ قاعدہ ہے کہ ایک ہی دین وشریعت کے سلسلے میں بیک وقت دو یا زیادہ انبیاء تو آسکتے ہیں مگر ایک مستقل شریعت والے نبی کی زندگی میں دوسری مستقل شریعت والا نبی نہیں آسکتا اور حضرت محمد ﷺ چونکہ مستقل شریعت والے نبی تھے، اس لئے ان کے آنے سے قبل حضرت عیسیٰ کا جانا ضروری تھا، اس لئے حضرت عیسیٰ نے فرمایا:

''اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیج دوں گا''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس کرۂ ارض پر رہتے ہوئے وہ رسول نہیں آئے گا، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان دنیا پر جانا ضروری ہے۔

وَمُبَشِّراً بِرَسُولٍ يَأْتِيْ مِن بَعْدِيْ اسْمُهُ أَحْمَد ۱۱۱

[اور حضرت عیسیٰ نے اس نبی کی خوشخبری سنائی جو میرے بعد آنے والے ہیں اور ان کا نام احمد ہے۔]

دوسری نشانی اس پیغمبر برحق کی یہ بتائی کہ وہ میری یعنی عیسیٰ کی بھی گواہی دے گا،قرآن پاک میں جا بجا حضرت عیسیٰ کی تصدیق وتائید کی گئی ہے مثلاً سورۃ البقرہ میں ہے:

وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۱۲؎

[اور دی ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح نشانیاں اور مدد دی اس کو روح القدس (جبرئیل امینؑ) کے ذریعے۔]

اگلی نشانی پیغمبر آخر کی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ سے حاصل کرے گا اُسے اپنی امت کے آگے بیان کرے گا۔قرآن پاک میں ارشاد ہے:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى ٥ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى ۱۳؎

[اور یہ نبی اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا بلکہ یہ تو وحی ہوتی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔]

چنانچہ حضرت عیسیٰ کی بیان کردہ نشانیاں سب کی سب خاتم النبین حضرت محمد ﷺ ہی میں موجود ہیں اور کوئی دوسرا شخص اس کا حامل اور مصداق نہیں ہوسکتا۔

## انجیل برناباس کی بشارتیں:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب انجیل میں تحریف وتبدل کا سلسلہ شروع ہوا تو بہت ساری اناجیل وجود میں آ گئیں۔ان اناجیل میں سے ایک انجیل برناباس بھی اس کے اصل مصنف کا نام Joses اور لقب برناباس Son of Censolation ہے اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری میں سے تھا اور اس کو آپؑ کی صحبت مبارکہ کا شرف حاصل رہا ہے،انہوں نے اپنی انجیل میں چشم دید واقعات اپنے کانوں سے سنے اور بشارات کو نقل کیا ہے،لیکن آگے چل کر اس انجیل کو غیر قانونی اور مشکوک الصحت قرار دے دیا گیا اور اس کے پڑھنے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

انجیل برناباس میں محمد ﷺ کی تشریف آوری سے متعلق بشارتیں موجود ہیں ۔ذیل میں ہم بعض بشارتیں نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

انجیل برناباس کے باب ۱۷ میں حضور اکرم ﷺ کو تمام نبیوں اور مقدس ہستیوں کا سرتاج اور خدا کا رسول قرار دیا گیا ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

''مگر میرے بعد تمام نبیوں اور قدوسوں کا سرتاج آئے گا اور تمام پردے کی باتوں کو، جو نبیوں نے کیں، واضح کرے گا، کیوں کہ وہ خدا کا رسول ہے''۔۱۱۴

انجیل برناباس میں بعض ایسے بھی فقرے ہیں جو خدا کی وحدانیت اور کلمۂ طیبہ کے ہم معنی اور تخلیق انسانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تخلیقِ انسانیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''تب خدا نے انسان کو روح بخشی، اس وقت تمام فرشتوں نے گایا: ''تیرا پاک نام مبارک ہو، اے ہمارے خداوند خدا''۔

''جب آدمؑ اٹھ کھڑا ہوا، تو اس نے ہوا میں ایک تحریر دیکھی جو سورج کی طرح چمکتی تھی کہ: ''خدا ایک ہی ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کا رسول ہے''۔ اس پر آدمؑ نے اپنا منہ کھولا اور کہا: ''اے خداوند میرے خدا، تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے میری تخلیق کی تقدیر فرمائی۔ مگر میں منت کرتا ہوں، مجھے بتا، ان الفاظ کا کیا مطلب ہے: ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کا رسول ہے۔ کیا مجھ سے پہلے اور انسان ہوئے ہیں؟''

''تب خدا نے کہا مرحبا، اے میرے بندے آدمؑ، میں تجھے بتاتا ہوں کہ تو پہلا انسان ہے جسے میں نے پیدا کیا۔ اور وہ جسے تو نے (مندرج) دیکھا ہے، تیرا بیٹا ہے، جو دنیا میں اب سے بہت سال بعد آئے گا اور میرا رسول ہوگا، جس کے لئے میں نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں۔ جو آئے گا، تو دنیا کو نور بخشے گا، جس کی روح میرے ہر چیز پیدا کرنے سے ساٹھ ہزار سال پہلے ملکوتی شان میں رکھی گئی تھی''۔۱۱۵

اس ضمن میں آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں:

''خدا نے اپنے تئیں پوشیدہ کیا اور فرشتے میکائیل نے انہیں (آدمؑ اور حواؑ کو) بہشت سے باہر کر دیا۔ اس پر آدمؑ نے گھوم کر پھاٹک پر لکھا دیکھا: ''خدا ایک ہی ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا رسول ہے''۔ اس پر اس نے رو کر کہا: ''خدا کی مرضی ہو۔ اے میرے بیٹے کہ تو جلد آئے اور ہمیں مصیبت سے چھٹکارا دے''۔۱۱۶

# کتابیات

☆☆☆

# کتابیات

## ﴿عربی کتب﴾


۱۔ القرآن الکریم

۲۔ آلوسی، محمود بن عبداللہ، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۵ھ

۳۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۰ء

۴۔ ابن العربی، محمد بن عبداللہ ابن العربی، احکام القرآن، دارالفکر، بیروت، بدون تاریخ

۵۔ ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی (م: ۷۷۴ھ) تفسیر القرآن العظیم، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۹ھ

۶۔ ابن منظور، جمال الدین بن محمد بن مکرم بن علی، لسان العرب، داراحیاء التراث، بیروت، ۱۴۰۸ھ

۷۔ ابن ماجہ، ابوعبداللہ، القزوینی، سنن ابن ماجہ، اشرفی بکڈپو، دیوبند، بدون تاریخ

۸۔ ابوحیان الاندلسی، البحر المحیط، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۹ھ

۹۔ ابوداؤد، سلیمان بن الاشعث السجستانی، سنن ابی داؤد، مطبع اشرفی بکڈپو دیوبند، بدون تاریخ

۱۰۔ ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، الجامع الترمذی، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، بدون تاریخ

۱۱۔ ابوعبداللہ حاکم، محمد بن عبداللہ، المستدرک علی الصحیحین، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۰ء

۱۲۔ ابوالبقاء ایوب، قاضی، کلیات ابی البقاء، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۱۹ھ

۱۳۔ البغوی، الحسین بن مسعود، معالم التنزیل فی تفسیر القرآن، دارطیبۃ للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۹۹۷ء

۱۴۔ الخلف، سعود بن عبدالعزیز، دراسات فی الأدیان الیہودیۃ والنصرانیۃ، مکتبہ اضواء السلف، الریاض،

۲۰۱۴ء
۱۵۔ ابوالحسین، احمد بن فارس، معجم مقاییس اللغۃ، مطبعہ عیسیٰ البابی مصر ۱۳۸۹ھ
۱۶۔ الاصفہانی، راغب، ابوالقاسم الحسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۲۰۰۲ء
۱۷۔ ابومحمد بن اسماعیل بن بردزبۃ البخاریؒ (م: ۲۲۶ھ) الصحیح البخاری، کتب خانہ رشیدیہ دہلی، بدون تاریخ
۱۸۔ ابونصر عبداللہ بن علی السراج، الطّوسی، کتاب اللمع فی التصوف، نیکلیسون ۱۹۱۴ء
۱۹۔ الزرقانی، محمد عبدالعظیم، مناھل العرفان فی علوم القرآن، داراحیاء التراث العربی، بیروت، بدون تاریخ
۲۰۔ الزرکشی، بدرالدین محمد بن عبداللہ، البرھان فی علوم القرآن، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۱ء
۲۱۔ السیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن، الاتقان فی علوم القرآن، دارالندوۃ الجدید، بیروت، بدون تاریخ
۲۲۔ السیوطی، جلال الدین، الدرالمنثور، دارالفکر، بیروت، بدون تاریخ
۲۳۔ فریدوجدی، دائرۃ المعارف القرآن العشر ون، دارالفکر، بیروت، بدون تاریخ
۲۴۔ محمد حسینی، جوامع الکلم، مرتب (محمد حسین اکبر) نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۵ء
۲۵۔ محمد حسین الذھبی، التفسیر والمفسر ون، دارالکتب الطبعۃ الثانیہ ۱۳۹۶ھ
۲۶۔ مرتضٰی الحسینی، تاج العروس، مطبع حکومت الکویت ۱۹۷۴ء
۲۷۔ مسلم بن الحجاج القشیری، الصحیح المسلم، مکتبہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی، بدون تاریخ

## ﴿اردو کتب﴾

۲۸۔ ابوالاعلیٰ مودودیؒ، یہودیت ونصرانیت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی، بدون تاریخ
۲۹۔ ابوالحسن علی ندویؒ، تزکیہ احسان وتصوف وسلوک، مکتبہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۹۸ء
۳۰۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری، خطوط ماجدی، مطبع المخزن پرنٹرز پاکستان چوک کراچی، فروری ۱۹۸۷ء
۳۱۔ ابوسفیان اصلاحی، مطالعات قرآنی، مطبع آرورا پرنٹرس اینڈ پبلشر دہلی، جولائی ۲۰۰۵ء

۳۲۔ آسی ضیائی، برنا باس کی انجیل (ترجمہ) لاہور، ۱۹۷۴ء
اشرف علی تھانویؒ، بیان القرآن، مکتبہ رحمانیہ اقراء سینٹر اردو بازار لاہور، بدون تاریخ
۳۳۔ احمد دیدات، یہودیت، عیسائیت اور اسلام، مترجم مصباحی اکرم، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۲۰۱۲ء
۳۴۔ امداد صابری، تاریخ صحافت، مکتبہ انجمن اردو نئی دہلی، بدون تاریخ ۱۹۷۴ء
۳۵۔ امین احسن اصلاحی، مولانا، تدبر قرآن، تاج کمپنی ترکمان گیٹ دہلی، بدون تاریخ
۳۶۔ برج بھوکن لال محبؔ، تاریخ دریاباد، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۲۵ء
۳۷۔ تحسین فراقی، عبدالماجد دریابادیؒ احوال و آثار، ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲۔کلب روڈ لاہور، ۱۹۹۳ء
۳۸۔ تقی عثمانی، محمد، عیسائیت کیا ہے، مکتبہ دارالاشاعت کراچی، بدون تاریخ
۳۹ تقی عثمانی، محمد، علوم القرآن، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۴۱۵ھ
۴۰۔ ثانی، تجلیات سیرت، مکتبہ فضلی پبلشر، پرائیویٹ (لمیٹڈ) اردو بازار کراچی ۲۰۰۰ء
۴۱۔ حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، قصص القرآن، ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی، ۱۹۸۷ء
۴۲۔ خالد سیف اللہ رحمانی، آسان اصول تفسیر، ناشر کتب خانہ نعیمیہ دیوبند یوپی، ۱۴۳۶ھ، ۲۰۱۴ء
۴۳۔ رابرٹ وین ڈئر، یہودیت، مترجم، ملک اشفاق، بک ہوم لاہور، ۲۰۰۴ء
۴۴۔ رحمت اللہ کیرانوی، مترجم اکبر علی، شارح و محقق مولانا محمد تقی عثمانی، بائبل سے قرآن تک، مکتبہ دارالعلوم کراچی، بدون تاریخ
۴۵۔ سعود عالم، قرآن کی دعوت فکر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۰ء
۴۶۔ سعود عالم، مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۹ء
۴۷۔ سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، بدون تاریخ
۴۸۔ سلیم اللہ خاں، نفحات التنقیح، مکتبہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی کراچی، ۲۰۰۲ء
۴۹۔ شبیر احمد عثمانی، تفسیر عثمانی، دارالاشاعت، کراچی، ۲۰۰۷ء
۵۰۔ شریف ہزاروی، اسرائیل کیوں تسلیم کیا جائے، اشتیاق اے مشتاق پرنٹنگ پریس لاہور، ۲۰۰۴ء
۵۱۔ شفیع عثمانی، معارف القرآن، ناشر فرید بکڈ پو دہلی، ۱۹۸۶ء

۵۲۔ عبدالحق،حقانی،تفسیر فتح المنان المعروف بہ تفسیر حقانی،میر کتب خانہ کراچی،بدون تاریخ
۵۳۔ عبداللہ احمد مسدوسی،مذاہب عالم کا ایک معاشرتی وسیاسی جائزہ،مکتبہ خدام ملت کراچی، پاکستان ۱۹۵۸ء
۵۴۔ عبدالسلام زینی،اسلامی صحافت،ادارہ معارف اسلامی،ملتان روڈ،۱۹۸۸ء
۵۵۔ عبدالصمد صارم،تاریخ التفسیر،مکتبہ معین الادب،لاہور،۱۹۸۲ء
۵۶۔ عطاء الرحمٰن (مرتب) کلیات ماجدی،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی،۲۰۱۳ء
۵۷۔ عبدالعلیم قدوائی،مولانا عبدالماجد دریابادیؒ،حیات وخدمات،صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ،۲۰۰۹ء
۵۸۔ عبدالکریم پاریکھ،قوم یہود اور ہم قرآن کی روشنی میں،مکتبہ الحسنات رام پور،۱۹۷۵ء
۵۹۔ عبیداللہ فہد فلاحی،تصوف ایک تجزیاتی مطالعہ،دارالتذکیر لاہور،۲۰۰۱ء
۶۰۔ عبدالماجد دریابادیؒ آپ بیتی،مکتبہ الشباب العلمیہ لکھنؤ،۲۰۱۳ء،بار پنجم
۶۱۔ عبدالماجد دریابادیؒ تفسیر ماجدی،مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۲۰۱۴ء
۶۲۔ عبدالماجد دریابادیؒ حکیم الامت،نقوش وتاثرات،شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،۲۰۱۱ء
۶۳۔ عبدالماجد دریابادیؒ،مبادی فلسفہ (حصہ اول)،معارف پریس اعظم گڑھ،۱۹۳۱ء
۶۴۔ عبدالماجد دریابادیؒ،خطوط مشاہیر (حصہ اول)،نسیم بک ڈپو لکھنؤ،بدون تاریخ
۶۵۔ عبدالماجد دریابادیؒ،اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں،ادارہ فروغ اردو لکھنؤ،۱۹۵۴ء
۶۶۔ عبدالماجد دریابادیؒ،مثنوی بحر المحبت،(طبع ثانی)،معارف پریس اعظم گڑھ،۱۳۴۶ھ
۶۷۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ،فلسفۂ جذبات،(طبع دوم) مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج،۱۹۲۰ء
۶۸۔ عبدالماجد دریابادیؒ،بشریتِ انبیاء،مجلس نشریاتِ اسلام،ناظم آباد،کراچی،بدون تاریخ
۶۹۔ عبدالماجد دریابادیؒ،اربعین ولی اللہی،حاجی حنیف اینڈ سنس لاہور،بدون تاریخ
۷۰۔ عبدالماجد دریابادیؒ،حیواناتِ قرآنی مجلس نشریاتِ اسلام،ناظم آباد،کراچی،۲۰۰۶ء
۷۱۔ عبدالماجد دریابادیؒ،تمدنِ اسلام کی کہانی اسی کی زبانی،مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پریس علی گڑھ،بدون تاریخ
۷۲۔ عبدالماجد دریابادیؒ،سیاحت ماجدی،مطبع حاجی اینڈ سنز لاہور،۲۰۰۱ء

۷۳۔ عبدالماجد دریابادیؒ، سیرت نبوی قرآنی، ندیم یونس پرنٹرز، لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۵ء
۷۴۔ عبدالماجد دریابادیؒ، تصوف اسلام، نظر ثانی واضافہ معارف پریس اعظم گڑھ، بدون تاریخ
۷۵۔ عبدالماجد دریابادیؒ، تاثرات دکن، انجمن پریس کراچی، ۱۷ر ستمبر ۱۹۷۷ء
۷۶۔ عبدالماجد دریابادیؒ، مکالماتِ برکلے، معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، (ہند) ۲۰۱۱ء
۷۷۔ عمادالحسن آزاد، فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء
۷۸۔ مجیب اللہ ندوی، اہلِ کتاب صحابہؓ و تابعینؒ، اعظم گڑھ، ۱۹۵۱ء
۷۹۔ نادر رضا، پاکستان میں مسیحیت، ناشر مسلم اکادمی، محمد نگر، علامہ اقبال روڈ، بدون تاریخ
۸۰۔ محمد ادریس، کاندھلوی، اسلام اور نصرانیت، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۲۰۱۱ء
۸۱۔ محمد ادریس، کاندھلوی، معارف القرآن، مکتبہ المعارف، کراچی، ۱۴۲۲ھ
۸۲ محمد عبدالرحمٰن، سیرت انبیاء کرام، ادارہ اسلامیات، لاہور، بدون تاریخ
۸۳۔ نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی، نقوش ماجدی، ناشر صدق فاؤنڈیشن حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج لکھنؤ، ۲۰۱۴ء
۸۴۔ یوسف خاں، تقابل ادیان، مکتبہ بیت العلوم، لاہور، ۱۹۸۶ء
۸۵۔ یوسف سلیم چشتی، تاریخ تصوف، مکتبہ دارالکتاب، لاہور، بدون تاریخ

## ﴿اخبار و رسائل﴾

۸۶۔ ''سچ''، ہفتہ وار لکھنؤ، ۱۹۲۵ء
۸۷۔ ''صدق''، ہفتہ وار لکھنؤ، ۱۹۳۵ء
۸۸۔ ''صدق جدید''، ہفتہ وار لکھنؤ، ۱۹۵۰ء
۸۹۔ روزنامہ خبریں، ۵ر نومبر ۲۰۱۵ء
۹۰۔ سہ ماہی اکائی (اٹاوہ)، فروری، اپریل، ۱۹۸۲ء
۹۱۔ ماہنامہ نیا دور، عبدالماجد دریابادیؒ نمبر، اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ، اپریل، مئی، ۱۹۷۸ء
۹۲۔ نیا دور اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ، مارچ، ۱۹۸۸ء

۹۳۔ نقوش،آپ بیتی نمبر،ادارہ فروغ اردو،لاہور،۱۹۶۴ء
۹۴۔ نقوش شخصیات نمبر۴۷،۴۸،ماہنامہ ادارہ فروغ اردو،لاہور،۱۹۵۵ء

## ﴿لغات﴾

۹۵۔ عبدالحفیظ بلیاوی،مصباح اللغات،مکتبہ برہان،اردو بازار جامع مسجد دہلی،بدون تاریخ
۹۶۔ المنجد اردو،ناشر فرید بکڈ پو دہلی،بدون تاریخ
۹۷۔ المعجم الوسیط،مکتبہ زکریا دیوبند،بدون تاریخ

## ﴿اردو انسائیکلوپیڈیاز﴾

۹۸۔ اردو دائرۃ معارف اسلامیہ،دانش گاہ پنجاب لاہور،۱۹۶۲ء
۹۹۔ اردو دائرۃ معارف اسلامیہ مطبع شعبۂ اردو،دائرۃ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور،۱۹۸۹ء
۱۰۰۔ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،۲۰۰۳ء

## ﴿English Bibliography﴾

101- Bleeker,Claas Jouco, Historia Religionum: Handbook for the History of Religions,E,J Brill 1969.

102- Encyclopedia of religion, Biblical literature: London : Collier Macmillan,1987.

103- Goddard,Hugh, History of Christian Muslim Relations,Edinburgh University Press 2000.

104- The Encyclopedia of Christianity

(Wilmington,Delaware,1964)

105- The Jewish Encyclopedia,Publisher New York, London Funks & Wagnall Company.

106- The New Encyclopedia Britannica,15 TH Edition,Chicago 1974.

# TAFSEER-E-MAJIDI: EK TEHQIQI MUTALA

**THESIS**

**SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF**

**Doctor of Philosophy**

in

**Sunni Theology**

**BY**

**MOHD SAJID**

**UNDER THE SUPERVISION OF**

**PROF. M. SAUD ALAM QASMI**

(Dean, Faculty of Theology)

# تفسیر ماجدی: ایک تحقیقی مطالعہ

مقالہ برائے

پی ایچ. ڈی

نگراں

**پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی**

(ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی.

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مقالہ نگار

**محمد ساجد**

(ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات سنی)

شعبۂ دینیات سنی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، یوپی، انڈیا

۲۰۲۱ء

# TAFSEER-E-MAJIDI: EK TEHQIQI MUTALA

**THESIS**

**SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF**

Doctor of Philosophy

in

Sunni Theology

**BY**

**MOHD SAJID**

**UNDER THE SUPERVISION OF**

**PROF. M. SAUD ALAM QASMI**

(Dean, Faculty of Theology)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ''بیت اللحم'' اسی پہاڑ پر واقع ہے، اور کوہِ شعیر سے آشکارا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اسی پہاڑ پر نبوت اور انجیل سے سرفراز کیا تھا اور آپ علیہ السلام عبادت و ریاضت اسی مقام پر کیا کرتے تھے، اور کوہِ فاران سے جلوہ گر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کو اپنی آخری کتاب قرآن کریم فاران نامی پہاڑ کے حرا نامی غار میں عطا فرمائی تھی اور آپ ﷺ کی ولادت و بعثت مکۂ معظّمہ میں ہوئی تھی، جو آغوش فاران میں واقع ہے یہی مطلب ہے اس آیت کا کہ ''وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا''۔

فاران نامی پہاڑ کے غار حرا میں جو پہلی وحی اِقْـرَأْ بِـاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۸۵؎ نازل ہوئی تھی، اس آیت کریمہ کے ذریعہ دنیائے انسانیت کو یہ پیغام دینا ہے کہ رشد و ہدایت کا جو سامان یہود کے مقدس پہاڑ طور سینا سے چل کر نصاریٰ کے مقدس پہاڑ شعیر پر جلوہ نما ہوا تھا اور مسلمانوں کے مقدس پہاڑ فاران پر آکر مستقل طور ایک ابدی اور نا قابل تنسیخ شریعت کا ظہور قرآن کریم کی شکل میں ہوا، جو ایک طرف رسالت محمدی ﷺ کی دلیل ہے تو دوسری طرف آپ ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی لکھتے ہیں کہ:

''مذکورہ پیشین گوئی آپ ﷺ کی بعثت کے بارے میں نہایت واضح ہے جس سے یہود و نصاریٰ بوکھلا گئے اور انہوں نے فاران (Paran) لفظ کی بہت سی تاویلیں کر کے اسے دوسرے علاقوں میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ بعض نے فاران کو بیت المقدس ہی کا دوسرا نام گردانا ہے۔ بعض نے قادس اور کوہ سینا تک پھیلے ہوئے میدان کو فاران کہا ہے بعض نے نفس قادس کو فاران کہا ہے اور بعض نے کوہِ سینا کے مغربی نشیب پر واقع وادی کو فاران کہہ دیا ہے''۔ ۸۶؎

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کریم گذشتہ آسمانی کتابوں کے اہم مضامین کا جامع ہے۔ قرآن کریم کا اعجاز دیکھئے کہ مذکورہ بشارت اور درج ذیل آیات میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ سورۃ التین میں ارشاد ہے:

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ O وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ O وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِيْنِ ۸۷؎

[قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور قسم ہے طورِ سینین کی اور اس امن والے شہر ( مکہ ) کی۔]

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی علامہ ابن قیم کی ھدایۃ الحیاریٰ فی اجوبۃ الیھود والنصاریٰ کے حوالے سے